دراحساس پہ دستک

کالموں کا مجموعہ

ڈاکٹر کریم ملک

Marfat.com
Marfat.com

5881

5886

درِ احساس پہ دستک

کالموں کا مجموعہ

کالم نگار

ڈاکٹر کریم ملک

بیکن بکس ○ گلگشت ملتان

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

جملہ حقوق محفوظ

۲۰۰۱ء

81686

درِ احساس پہ دستک

ڈاکٹر کریم ملک

بیکن بکس گلگشت ملتان فون: 520790-91

کے لیئے

شرکت پرنٹنگ پریس لاہور سے طبع ہوئی

قیمت: 225روپے

ٹائٹیل: جاذب، گرافکس ان لاہور

فون: 042-6363009

بہ اہتمام: سید اویس علی سہروردی

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

اپنے مرحوم والدین کی خاموش دعاؤں
کے نام

جنہوں نے ہوا کے رستے میں
چراغ جلانے کا حوصلہ دیا

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

فہرست

	صفحہ نمبر
اظہارِ خیال (پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ چوہدری، وائس چانسلر بہاءالدین یونیورسٹی)	9
اظہارِ خیال (جناب ناصر محمود کھوسہ صاحب کمشنر ملتان ڈویژن)	10
حرفِ آغاز	11
جدید ابلاغ میں کالم نگاری کی اہمیت	15
آٹے کا بحران	21
ابلاغ عام کی نئی صورتیں	23
نوائے وقت ملتان لبدالی روڈ پر :ارتقاء کا نیا موڑ	25
بکرے ہیں سب دیکھے بھالے	27
آؤ دعائیں اکٹھی کریں	30
سکول کو جانے والے راستے اور گلیاں	33
مسئلہ کشمیر۔ مضامین گجرال کے آئینے میں	35
تجوریوں کے تالے کب کھلیں گے ؟	41
اعلیٰ سند اور قبائے فضیلت	44
ہم کیا پڑھیں اور کیا نہ پڑھیں	47
جنریشن گیپ	50
حامل رقعہ زبانی عرض کرے گا	53
لاہور، ملتان، کوئٹہ روڈ	57
ابھی دنیا میں اچھے لوگ باقی ہیں	60
ڈاکٹر صبور غیور	62
ہر کلہ راشہ۔ پہ خیر راغلے	65
”یہ پیشکش ملتان کیلئے نہیں ہے“	69
پی۔ آر۔ او	72
سواری اپنے سامان کی خود حفاظت کرے	75
ہمارے کان اور بجٹ کا اعلان	79
یہاں تھوکنا منع ہے	82

Marfat.com

Marfat.com
Marfat.com

پگڑی 84
جون کا مہینہ۔ فیلڈ سٹاف کا پسینہ 87
ملتان اپنی پہچان مانگتا ہے 90
مائی بھاگاں 94
جمعۃ الوداع سے حجتہ الوداع تک 97
فالسہ کا جوس۔ سوانجڑاں کے پھول 100
اللہ کرے سی۔بیورو کریسی 103
کیا ملتان میں احمد شاہ ابدالی کا کوئی ولی وارث نہیں ؟ 107
"ہور کی حال اے" 110
جنوبی پنجاب میں صحافتی اقدار کا جائزہ 112
ابھی راکھ میں چنگاریاں باقی ہیں 115
"But" - "However" - "Otherwise" 118
"سوری" 121
ہم چلتے پھرتے خواب کیوں دیکھتے ہیں ؟ 123
ملتان کی سہ پہر دوپہر سے زیادہ گرم ہوتی ہے 126
لفظ تاثیر سے کب محروم ہوتے ہیں 128
نشتر کالج ایک اور عبدالرب نشتر کا منتظر ہے 131
پھول توڑنا منع ہے 135
ملتان کی گل گشت کالونی 138
Most Welcome 140
"جلنے والے کا منہ کالا" 142
ڈیرہ غازی خان میڈیکل کالج کا منتظر ہے 145
گولڈن ٹیک ہینڈ 148
ملتان کی وحدت کالونی 151
صحت مند یا خوبصورت ملتان 154
کوٹلہ توکلے خاں 157
والدین، بچے اور تفریح گاہیں 160
ادھورے خواب 163
چائلڈ لیبر 166

Marfat.com

Marfat.com
Marfat.com

ٹیوشن 169
کوثر علم کے ساقی مگر بے بسی کے شاقی 172
نفاذ اردو دفتری زبان 174
مسجد 177
بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ترقی کی شاہراہ پر 180
میاں چنوں میں محفلِ میلادؐ 182
پوری دنیا فتح کرنے کا خواب 185
نئی ایجوکیشن پالیسی کب آئے گی 188
بند گلی اور آخری راستہ 191
سوال کا جواب بھی سوال میں ملا مجھے 193
گرد 196
ملتان کا زیرہ پوائنٹ 199
روح کی غذا-ناکردہ گناہوں کی سزا 201
لیڈر اور ان کے بیانات 203
کیا ایسا ہو سکتا ہے 205
مزارِ اقبال 207
بہاولپور 210
علاج بالغذا 213
جوڑ کے تو کوہ گراں تھے ہم 216
ملتان کے محسن 219
ایک کمرہ - 6 آدمی 223
عمر پور کی محنت کش "مہارانی" 226
ملتان کی تہذیبی قدریں 228
ہمارے شہر میں ایک آدمی تھا آسماں جیسا 232
بازاروں میں لاؤڈ سپیکر 234
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک 237
23 مارچ ہماری منزل کے تعین کا دن 240
یہی دن اہل دل کے واسطے اُمید کا دن ہے 244

Marfat.com

Marfat.com
Marfat.com

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

مجھے بے حد خوشی ہے کہ ڈاکٹر کریم ملک اپنے ان کالموں کا مجموعہ چھپوا رہے ہیں جو ایک عرصے سے نوائے وقت ملتان میں شائع ہو رہے ہیں۔ ان کے یہ کالم ان کی ادبی اور سماجی شعور کے آئینہ دار ہیں اور وہ ان کالموں کے ذریعے نہ صرف وہ اپنے پڑھنے والوں کے "دراحساس پہ دستک" دیتے ہیں بلکہ پہلے ہی بہت سے سوالوں کا سامنا کرنے والے معاشرے کے دامن میں کئی سوالوں کا اضافہ کر دیتے ہیں۔

ہماری کوشش ہے کہ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی میں نہ صرف تحقیق و تخلیق کی فضا پروان چڑھے بلکہ یہ کاوش زیور طباعت سے آراستہ ہو تا کہ ناقدین ہمارے اساتذہ اور سکالرز کی کاوشوں کا محاکمہ بھی کر سکیں۔

پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ چوہدری
وائس چانسلر
بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

(جناب ناصر محمود کھوسہ صاحب کمشنر ملتان ڈویژن)

انسانی فکر کو متاثر کرنے اور بدلنے کی جو بے پناہ طاقت ایک صحافی کے قلم میں ہے وہ کسی اور طبقہ کے فرد میں نہیں۔ صحافی معاشرہ کی آنکھ، کان اور دل ہی نہیں بلکہ مملکت کے چوتھے ستون کا ایک اہم حصہ بھی ہے۔ یہی وجہ ہے صحافی کی زندگی سکوتِ ساحل نہیں بلکہ موجوں سے پیہم برسرِ پیکار رہنے کا جہد مسلسل کا نام ہے۔

اکثر قومی اخبارات میں شائع ہونے والے مضامین، فیچر، کالم اور اداراتی تجزیئے نظر سے گزرتے ہیں۔ ایک صحافی جس طرح حالات و واقعات پر نقد و نظر کرتا ہے رائے عامہ تشکیل کرنے، عوام اور حکام کو باخبر کرنے کا فریضہ سرانجام دیتا ہے اس بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے کندھوں پر کس قدر ذمہ داری کا بوجھ ہے۔

ڈاکٹر کریم ملک کے کالم اکثر زیرِ مطالعہ رہتے ہیں مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی محسوس ہوتی ہے کہ ڈاکٹر کریم ملک بڑی ذمہ داری سے معاشرہ کی بنیادی اکائیوں اور ان سے وابستہ موضوعات کو زیرِ بحث لاتا ہے، معاشرے کے معاشرتی زخم دکھاتا ہے اور قومی درد رکھنے والے حساس افراد کی توجہ مبذول کراتا ہے کہ وطن عزیز کی ترقی کو کس طرح مضبوط اور مربوط بنایا جائے۔ اس کی ترقی میں کون سی دشواریاں حائل ہیں اور ان کا مداوا کیسے ممکن ہے۔

ڈاکٹر کریم ملک یہ احساس دلانے میں کسی حد تک کامیاب ہوئے ہیں اور مجھے ان کی صلاحیتوں پر اعتماد ہے اور ان کے جوشِ عمل کا اعتراف بھی ہے۔ انہوں نے جس خلوص کے ساتھ ملتان اور جنوبی پنجاب کے مسائل کی نشاندہی کی ہے اور اس خطہ میں پھیلی ہوئی محرومی، پسماندگی کا خوبصورتی سے ذکر کیا ہے اس سے ترجیحات کے تعین میں آسانی ہوتی ہے۔ ”دراحساس پہ دستک“ صرف کالموں کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک سنگلاخ میدان میں چلنے اور دشوار گزار راہوں سے گزرنے کا نام بھی ہے۔ ان کی مضبوط قوت ارادی، اور اس میدان میں ثابت قدمی کیلئے دست بہ دعا ہوں کہ مقاصد کی رفعت کا یہ سفر جاری رہے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

حرفِ آغاز

کتابیں لکھنا، انہیں ترتیب دینا اور پھر انہیں زیورِ طباعت سے آراستہ کر کے کسی صاحبِ ذوق کو پیش کرنا بلاشبہ کٹھن اور صبر آزما کام ہے۔ ان سارے مراحل میں کئی بار حوصلے پست، ارادے مضمحل اور قوت ارادی پر آزمائش کی کئی گھڑیاں گزرتی ہیں مگر الحمدللہ۔ تمام تر مشکلات کے باوجود "در احساس پہ دستک" پیش خدمت ہے۔ نقد و نظر قارئین کرام کا حق ہے۔ ان کے اس حق سے جہاں مفید مشورے سامنے آئیں گے وہاں حوصلہ افزائی اور مزید لکھنے کی تحریک بھی ملے گی۔ کالم نگاری ایک دقیق، پیچیدہ عمل ہے۔ اس میں صرف لفظوں کی مالا پرونے، تعریف و ستائش کے پیرے بنانے سے کام نہیں چلتا۔ مسائل کی تمام تر تلخی کو شہد جیسی شیرینی میں پیش کرنا پڑتا ہے اور دیکھنا یہ پڑتا ہے کہ کہیں دل آزاری یا مردم بیزاری کا پہلو تو نہیں پیدا ہو گیا اور کہیں ایسا تو نہیں کہ محض مفروضوں، سنی سنائی باتوں پر انحصار کیا گیا ہے اور جن کے غلط ہونے کے وسیع امکانات موجود ہیں تو ایسے حالات میں لکھنے والے کی Credibility بری طرح مجروح ہوتی ہے اور یہ وہ مقام ہوتا ہے کہ لکھنے والا خود اپنی نظروں میں گر جاتا ہے اس لئے کالم نگار کو سچائیوں کا دامن مضبوطی سے تھامنے کی شدید ضرورت رہتی ہے تاکہ اعتبارِ ذات کے ساتھ اعتبارِ بیان بھی قائم رہے۔ اگرچہ کالم نگاری کے ان گنت موضوعات ہیں تنکے سے لیکر پہاڑ تک اور پہاڑ سے سمندر اور سمندر سے بین الاقوامی حالات و واقعات پر کالم لکھے جاتے ہیں۔ فرد سے لیکر معاشرہ، معاشرہ سے ریاست اور ریاست میں سیاست سبھی موضوعات (Potential issues) کالم کا موضوع بنتے ہیں۔ یہ کالم نگار پر منحصر ہے کہ وہ ان گنت موضوعات میں سے اپنی میلانِ طبع کے مطابق کس موضوع کو چنتا ہے اور اس پر اپنی شوخیِ خیال کے رنگ بکھیرتا ہے۔ جہاں تک میرے کالموں کا تعلق ہے ان میں سیاست سے گریز کا پہلو موجود ہے کیونکہ سیاست کے شور و غل سے کبھی دلچسپی نہیں رہی بلاوجہ کی شوخی اور دوسرے کے معاملات میں ٹانگ اڑانے اور چھیڑ خوباں سے بھی سروکار نہیں رہا۔ کالم نگاری میں Controversy اور بلاوجہ کسی موضوع پر اپنے ہم عصر کالم نگاروں سے بحث، تکرار کا میدان بھی نہیں چنا۔ اپنے کالموں میں صرف معاشرے کے زخم جنہیں

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

NGO کی زبان میں Social Questions کہتے ہیں انہیں کا انتخاب کیا ہے زیادہ تر مسائل کا تعلق ملتان اور جنوبی پنجاب سے ہے جہاں زندگی کو متحرک کرنے اور ترقی کے پہیہ کو فعال کرنے کی صرف ضرورت ہی نہیں بلکہ ہوا اور آکسیجن کی طرح بقا کا مسئلہ بھی ہے۔ یہ خطہ جو ڈھائی کروڑ افراد پر مشتمل ہے نو آبادیاتی نظام کے عہد میں ترقی سے یہ علاقہ کوسوں دور رہا اور پھر صبحِ آزادی کے بعد اس پر توجہ کرنے اور اس کی ترجیحات کا تعین کرنے میں مجرمانہ غفلت برتی گئی اور اس خطہ کی قیادت پر اعتراضات ہوئے کہ وہ گورنر، صدر، وزیر اعلیٰ اور وزیر اعظم کے منصبوں تک پہنچے مگر اس خطہ کے زخم انہیں کہیں نظر نہ آئے اور نہ ہی اراکین اسمبلی نے اسمبلی کے فلور پر اس خطے کی مؤثر نمائندگی کا فریضہ ادا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ابھی تک یہاں کی زراعت صنعتوں سے محروم ہے معدنیات کیلئے جدید کارخانے ندارد ہیں۔ لیبر فورس یا افرادی قوت کیلئے محنت اور معاوضے کے روشن امکانات نہیں۔ اہل دانش کیلئے اظہار خیال و بیان کیلئے نہ تو ٹی وی سٹیشن ہے اور نہ ہی اچھے Publishing houses موجود ہیں۔ مخطوطات، آرٹس، فنون لطیفہ، نوادرات کیلئے کوئی مستند تحقیقی ادارہ، میوزیم موجود نہیں۔ اس وسیع و عریض خطہ کا صدیوں پرانا کلچر اس طرح بکھرا ہے جیسے کسی پہاڑ کے دامن میں سنگریزے بکھرے ہوں جو راہ چلتے مسافر ٹھوکروں کی زد میں ہوں۔ وطن عزیز کی ترقی، خوشحالی اس کے ایک ایک گوشہ کو اجاگر کرنے اور مجموعی ترقی کے ہم پلہ بنانے میں مضمر ہے۔ اس خطے کی ترقی درحقیقت استحکام پاکستان کی علامت ہے۔ اور یہ خطہ بلاشبہ پاکستان کے اقتصادی مسائل حل کرنے میں اپنا کلیدی کردار ادا کر سکتا ہے۔ اس کے اثمار، اشجار، فصلیں، گندم، کپاس، آم، کھجور، چاول، گنا، کنو، مالٹے خلیج فارس اور مشرق وسطیٰ کی اچھی منڈیوں میں مقبول ہو سکتے ہیں اور پاکستان کو درآمدی محتاجی سے اور بڑھتے ہوئے قرضوں کے جال سے نکال سکتے ہیں۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

بات طویل ہو گئی ہے۔ بہر حال کالم نگاری میں ہم نے آج سے کوئی تیس سال پہلے قدم رکھا۔ روزنامہ کوہستان، روزنامہ امروز، ہفت روزہ قندیل سے اپنی کالم نگاری، مضامین کا سلسلہ شروع کیا۔ 1972 سے روزنامہ نوائے وقت لاہور سے مستقل وابستگی اختیار کی اور زراعت، صنعت و حرفت، شینگ، سٹاک ایکس چینج کے حصص میں اتار چڑھاؤ پر تواتر سے کالم اور فیچر

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

لکھے۔ ان تحریروں، کالموں کو بین الاقوامی شہرت یافتہ اور اردو کالم نگاری میں مستند نام، حوالہ بلکہ ایک ادارہ جناب عطاء الحق قاسمی نے بے حد پسند کیا اور ہمیشہ حوصلہ افزائی کی۔ یہاں اپنے درویش صفت استاد جناب عبدالقیوم اعتصامی کا ذکر بھی ضروری ہے کہ انہوں نے ابتدائی دنوں میں رہنمائی کا اور حوصلہ افزائی کا کام بہ حسن و خوبی سرانجام دیا۔ سیّد عاشق علی فرخ، امجد اسلام امجد، بیدار سرمدی انہی دنوں کے ساتھی ہیں۔ جناب مجید نظامی کی شخصیت میرے لئے ہمیشہ سایۂ عافیت سراپا شفقت اور خلوص و ایثار کا سرچشمہ رہی ہے میں ان کی تمام تر محبت کا زیربار رہوں گا۔ ایک دوسری شخصیت جو میرے علاقہ سے مثالِ آفتاب بن کر ابھری وہ جناب ملک خدا بخش بچہ کی ہے جنہیں بابائے زراعت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہاں اپنے استاد مکرم پروفیسر ڈاکٹر مسکین علی حجازی کا بھی ذکر کرنا ضروری محسوس ہوتا ہے۔ ڈاکٹر حجازی اپنی حریم ذات میں خیر اور فلاح کی اعلیٰ مثال ہیں۔ انہی کے دم قدم سے ابلاغ کے ادارے آباد اسران سے وابستہ افراد شاد ہیں۔ اپنے برادر محترم جنہیں میں نے ہمیشہ اپنا استاد سمجھا وہ ہیں پروفیسر ڈاکٹر انوار احمد ڈین فیکلٹی آف لینگویجز جو ہماری کسی کامیابی پر اس قدر خوش ہوتے ہیں کہ لفظ اس کیفیت کو بیان نہیں کر سکتے اور کسی تکلیف پر اس قدر رنجیدہ ہوتے ہیں کہ ہمیں اپنی تکلیف بھول جاتی ہے۔ محترم جناب شیخ ریاض پرویز ریذیڈنٹ ایڈیٹر روزنامہ نوائے وقت ملتان نے باقاعدہ کالم لکھنے کی تحریک دی اور اسے ملتان اور جنوبی پنجاب کے موضوعات کو زیر بحث لانے کا صائب مشورہ دیا اور بتایا کہ جناب مجید نظامی صاحب کی خواہش ہے کہ اس علاقہ کی پسماندگی کو اجاگر کیا جائے۔ میں جناب شیخ صاحب کی اس علمی سرپرستی کا ممنون ہوں۔ مجھے یہاں اپنے ابلاغ کے اداروں کے وہ دوست یاد آرہے ہیں جن کا خلوص اور پیار ہر محفل میں چاندنی کی طرح کھلتا ہے اور دل و دماغ کے گوشے منور کرتا ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر مغیث الدین شیخ شعبہ ابلاغیات پنجاب یونیورسٹی، پروفیسر عباد راشدی، حام شورو یونیورسٹی، جناب پروفیسر عبدالستار عباسی، گومل یونیورسٹی، جناب پروفیسر ڈاکٹر محمد شمس الدین، اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور، جناب محمد رمضان اظہر یونیسیف عراق، جناب نسیم الرحمٰن بنگلہ دیش، جناب ڈاکٹر صبور غیور سنگاپور، سدا بہار وزیر اطلاعات جناب جاوید جبار، مسٹر گٹر لہر کے جرمنی، اشرف عظیم پی ٹی وی لاہور، کمشنر ملتان ڈویژن جناب ناصر محمود کھوسہ جن کی علم دوستی اور خلوص ہمیشہ آگے بڑھنے کا حوصلہ دیتا ہے۔ مجھے یہاں جناب توحید

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

احمد ہائی کمشنر سفارت خانہ پاکستان سنگاپور، جناب محمد اعظم چوہدری ڈائریکٹر جنرل بورڈ آف ریونیو حکومت پنجاب لاہور، محترم پروفیسر ڈاکٹر ایم الطاف علی قریشی سابق وائس چانسلر ملتان یونیورسٹی، محترم پروفیسر ڈاکٹر خیرات ابن رسا، پروفیسر ڈاکٹر محمد نذیر رومانی اپنی تمام تر مہربانی کے ساتھ یاد آتے ہیں۔

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

آخر میں اپنے بیٹے محمد سجاد کریم، محمد شہزاد کریم کا ذکر کرنا ہے جو کتاب کو جلد لانے میں کوشاں تھے۔ اور اپنی بڑی بیٹی بشریٰ کریم اور چھوٹی بیٹی شگفتہ جبیں جنہوں نے کتاب کی پروف ریڈنگ میں میرا ساتھ دیا۔ کتاب کی تحریر، تدوین اور تکمیل میں میری بیگم کا بھی خصوصی تعاون رہا ہے۔

میرے پیارے دوستوں میں جناب جبار مفتی، جناب سلیم ناز، اولڈ ہلین ملتان کی ایسوسی ایشن کے ساتھی جناب سلیم بخاری، محمد یونس غازی، عزیز الحسن اور جناب رفیق انصاری کے ساتھ ساتھ اپنے پیارے دوست جناب غلام نبی کروڑی جو آجکل ایڈیشنل کمشنر ڈیرہ غازی خاں ہیں، جناب محمد یونس خزانہ دار بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان، جناب زین اے ملک جو ہمارے رجسٹرار رہے ہیں ان سے بڑھ کر بڑے بھائی اور مخلص ساتھی، عبدالجبار پیکن بکس کا خصوصی شکریہ۔ ان سب دوستوں، شاگردوں اور عزیزوں کی خواہش تھی کہ کتاب جلد از جلد منظر عام پر آئے۔ سو ان سب کی پُر خلوص خواہش اور دعا مقبول ہوئی۔ کتاب آپ کے سامنے ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر کریم ملک
شعبہ ابلاغیات
بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان

یکم جنوری ۲۰۰۱ء

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

15

جدید ابلاغ میں کالم نگاری کی اہمیت

جدید ابلاغ نے عہد حاضر میں جو اہمیت اختیار کر لی ہے اس کی وسعت اور اثر پذیری کا اندازہ لگانا ممکن نہیں رہا۔ ابلاغ کے سارے دھارے پھیلی ہوئی کائنات کو اور اس کے لا محدود امکانات کا یکجا کرنے اور اسے Global Society Approach کے تحت لانے میں سرگرم عمل ہیں۔ اس سکڑتی سمٹتی دنیا کے کلچر کے بارے Glen Fisher کی رائے بڑی معنی خیز ہے جسے انہوں نے اپنی کتاب American Communication in a Globe میں بیان کیا ہے :

"Society" implies existence of a common culture-shared knowledge and beliefs, patterns of association, custom on this "globe" one is actually impressed with the diversity and contrast even among peoples of the traditional western world. Yet an advanced degree of internationalized common culture does extend around the world even though most people only observe bits and pieces of it (1)"

ان کی رائے میں لباس، کلچر، لٹریچر، ٹریڈ، کامرس، فنانس اور زبان مشترک ہوتی جا رہی ہے اور انگریزی دنیا بھر کی زبان بن گئی ہے اس بڑھتے ہوئے سماج، سوسائٹی، معاشرہ میں مسائل کا پیدا ہونا فطری عمل ہے۔ کچھ اس میں ایسے سلگتے سیاسی مسائل ہیں جو عالمی یک جہتی کے اس خوشگوار ماحول کو متاثر کر سکتے ہیں اور اقوام عالم کو جنگ کی دہلیز کی طرف دھکیل سکتے ہیں۔ محروم اور مجبور اقوام کو غلام بنا سکتے ہیں۔ حریت، آزادی اور خود مختاری اور زندہ رہنے کی آرزو رکھنے والی اقوام کو کسی توسیع پسند جارح کے رحم و کرم پر لا سکتے ہیں ایسے ماحول میں کیسے Global Village یا Global Access کا خواب پورا ہو سکتا ہے۔ جس انفارمیشن انقلاب سے ہم گزر رہے ہیں اور جو ترجیحات ہمیں مکمل کرنی ہیں اس میں سب سے بڑا چیلنج The Digital Millennium کا ہے جس میں ہمیں دیکھنا ہے کہ ہمارا معاشرہ جدید ٹیکنالوجی سے کس حد تک متاثر ہوا ہے اور کس حد تک مسائل حل ہوئے ہیں اور کس نوعیت کے

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

مسائل پیدا ہوئے ہیں اور جو مسائل پیدا ہوئے ہیں ان کو ہم اپنے دانشوروں کی رائے میں کیسے حل کر سکتے ہیں۔ کالم نگاری معاشرے میں پیدا ہونے والے مسائل کی سنگینی، تلخی میں شگفتگی اور شوخی پیدا کرنے کا عمل ہے۔ روزمرہ کے مسائل جن سے ایک عام آدمی کو سامنا کرنا پڑتا ہے جس میں معاشی، معاشرتی محرومیاں، ناہمواریاں، غربت و افلاس، بے روزگاری، بے انصافی ہر مقام اور ہر مرتبہ سے محرومی گھر سے لیکر دفتر تک، دفتر سے منڈی' مارکیٹ میں پیدا شدہ دباؤ، خوفزدہ کرنے والے واقعات انسانی طبع پر بار گزرتے ہیں۔ کہیں ٹکٹ لینے جائیں تو بکنگ آفس میں سیٹ دستیاب نہیں ہوتی۔ کہیں پرچانس کہیں پر رشوت کہیں پر سفارش۔ سفر کرنا دشوار۔ دوران سفر عدم تحفظ ایسے ان گنت مسائل کالم کا موضوع بنتے ہیں اور عمل اس تلخی میں Sugar Coated انداز سے مسائل کی تلخی کو کم کرتا ہے انسانیت کو زندہ رہنے آگے بڑھنے کا حوصلہ فراہم کرتا ہے کالم میں ادبی چاشنی بھی ہوتی ہے ڈرامائی انداز سے بھی اور Cheery Chat Style بھی۔ ایک طرف مسئلہ کو اٹھایا جاتا ہے اور اس کا ہلکے پھلکے انداز میں حل بھی بتھایا جاتا ہے کہیں طنز، کہیں مذاق کہیں بذلہ سنجی کہیں سنجیدگی کہیں پھول کہیں کانٹے کہیں عزم کہیں نظم کہیں چوٹ کہیں چوٹ سے پیدا ہونے والے درد کا احساس ۔

ایک دو زخم نہیں سارا کا سارا جسم ہے چھلنی
درد بیچارہ پریشاں ہے کہ کہاں سے اُٹھے

اگر کہیں بڑھتی ہوئی آبادی کا مسئلہ ہے تو اس کے لئے ممکنہ وسائل کی فراہمی کہاں سے ہوگی۔ اگر کہیں کشمیر، فلسطین، بوسنیا، چیچنیا کی مظلوم اقوام کی جرأت، حریت کو سلام ہے تو وہاں بڑی طاقتوں کا شرمناک کردار بھی زیر بحث آتا ہے وہ کس طرح ترقی پذیر اقوام کا استحصال کرتے ہیں اور اپنے مخصوص مفادات کے تحت انہیں اقتصادی غلام بناتی ہیں کہیں A vision for 21st century کا موضوع سامنے آتا ہے جس میں دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے معاشرہ کے حقیقی مسائل کیا ہیں۔ آزادی کے ابتدائی دنوں میں کوریا اور پاکستان کی GNP ایک جیسی تھی آج پاکستان ڈویلپمنٹ ریویو کے شمارہ 36 پارٹ I 1997 کے مطابق کوریا کی GNP 7,670 ڈالر ہے جبکہ پاکستان کی 476 ڈالر اور یہ فرق 1,611 فیصد ہے (2)۔ اس طرح زراعت، صنعت

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

اور دیگر شعبوں میں ہماری مجموعی پیداوار وہ نہیں جس پر ہمیں ناز کرنا چاہیئے آج ہمیں صرف چینی کیلئے درآمدی محتاجی کا سامنا ہے۔ ہمیں ایک طرف مسلسل بڑھتی ہوئی آبادی کا مسئلہ ہے اور دوسری طرف افلاس، گھٹیا تعلیم، ماحول کی ذلت، خوراک کی قلت، کمزور صحت ہر روز ہماری نسوانی آبادی کو کم عمری کی شادی، بار بار ماں بننے کی اذیت ایام زچگی میں ہر سال تیس ہزار مائیں جان سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہیں۔ ایسے ٹھسے ہوئے کنبوں کے افراد ہر روز نئے روزگار نئے ذرائع آمدنی، بہتر ذرائع رسل ورسائل، صاف پانی، بہتر تعلیم اور علاج معالجے کی مناسب سہولتوں کیلئے سرگرداں رہتے ہیں آج بھی ہمارے بہت سے دیہاتوں میں لوگ گڑ۔ پیاز سے روٹی کھاتے ہیں۔ متوازن غذا اور مناسب کلوریز کی فراہمی بڑے دور کی بات ہے ان مسائل کی موجودگی میں کالم نگار وہ دیدہ ور ہے جو ایک متبادل پارلیمنٹ کا کردار ادا کرتا ہے حکام اور بااثر عوام کو ان سلگتے سڑتے حیران، پریشان کرنے والے مسائل کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ کالم نگاری صحافتی دنیا کی ایک ایسی شاخ ہے جو اخبارات کی مقبولیت کا باعث بنتی ہے اخبارات کے تشخص کو ابھارتی ہے صحافتی زبان میں اخبارات کی سرکولیشن میں اضافہ کا موجب بنتی ہے۔ ایک Competent, successful Columnist معاشرے کی آنکھ، کان اور دل ہوتا ہے۔ وہ ان مسائل کو بڑے غور سے دیکھ لیتا ہے، محسوس کر لیتا ہے جہاں دوسروں کی نگاہیں اپنی مصروفیات کی وجہ سے مبذول نہیں ہوتیں۔

کالم کیا ہے؟ کالم ایک ایسی باغ و بہار تحریر کا نام ہے جو مختصر لفظوں میں کسی مسئلہ، کسی خیال کسی ضرورت پر ایسی توجہ دلائے کہ پڑھنے والا مسئلہ کی شدت کو دل کی گہرائیوں میں محسوس کرے اور اس کے ممکنہ حل کیلئے کوشاں ہو۔ اگر حل کرنے کی سکت نہ رکھتا ہو تو کم از کم اپنے حلقہ اثر میں اس کا ذکر کرے اور اس طرح ایک رائے عامہ کی تشکیل کا موجب ٹھہرے۔ کالم ایک ڈرامائی تحریر ایک ایکٹ اور ایک ایسے انداز کا نام ہے جس میں جملے اپنے اندر کاٹ، چوٹ اور شوخی کے مظہر ہوں۔ منفرد سوچ، شوخیٔ طبع، طنز و مزاح، شعر و سخن کی ادا، ادبی ذوق، فکری پختگی کا اظہار کریں اور کالم نگاری کے اس میدان میں فنی مہارت اسلوب اور ندرت خیال کا سکہ جمائیں۔ کالم ہمارے ماحول میں ان گنت مسائل، مشکلات دشواریوں سے جنم لیتے ہیں خواہ یہ مسائل کسی بین الاقوامی فورم سے متعلق ہوں عالمی طاقتوں کی مفاد پرستانہ سوچ کے عکاس ہوں یا کسی محدود معاشرہ طبقہ کی سماجی، معاشی، معاشرتی زندگی کے

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

گرد گھومتے ہوں۔ کالم ہر اس موضوع، خیال، نظریہ، مسئلہ پر اظہار خیال کرتا ہے جو عام لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہوں مگر کالم نگار اُسے ڈھونڈ نکالے۔

پاکستان ساڑھے چودہ کروڑ انسانوں کا ملک ہے۔ جہاں غربت، افلاس کی کوئی شرح نہیں جو چاہے وہی اعداد و شمار بنا کے پیش کر دے مگر یہ حقیقت ہے کہ امارت اور غربت کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل ہے ایک طرف تقریباً 5 کروڑ افراد ہیں جو غربت کی آخری حدوں تلے دبے ہیں اور دوسری طرف ایسے مال مست لوگ ہیں جن کے محل دیکھنے کیلئے سر کو اونچا کرنا پڑتا ہے اور وہ محل کی منزلوں کی بلندی کو دیکھ کر غیر متوازن غذا کا عادی عام آدمی غش کھا کر بے ہوش ہو جاتا ہے۔ امارت اور غربت کا یہ فاصلہ کون مٹائے گا۔ کیا ہماری سوچ صرف مسجدوں کی صفوں میں مساوات اور پاؤں کی برابری تک محدود ہے یہ مساوات دستر خوان پر کیوں نہیں ہو سکتی۔ ایسے ان گنت موضوعات کالم کا عنوان بنتے ہیں۔ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ ہمیں جن معاشی، معاشرتی، سماجی مسائل کا سامنا ہے وہ ایسے مسئلے ہیں جو عام خبروں کا موضوع بنے رہیں بلکہ یہ ایسے مسئلے ہیں جن کو حل کرنے کیلئے ہمیں Undeclared war اس کا مداوا کرنا ہو گا۔ اس لئے ہمارے ملک کے کالم نگار ان مسائل سے آنکھیں چُرا نہیں سکتے۔ لوٹ جاتی ہے نظر ادھر کو کے مصداق سوچنا پڑتا ہے۔ کالم نگار تو ایک طرف بڑھتی ہوئی غربت پر اپنی سوچ کو یکجا کرنا ہے اور معاشرے میں لاقانونیت کے ابھرتے Conflicts تشدد اور جارحیت کے خلاف محاذ بنانا ہے۔ معاشرہ کو مہذب بنانے کے لئے قوانین کی بجائے ان میں تہذیب کی درخشندہ روایات اور کردار کی ارفعی مثالیں پیش کرنا ہے اور بچوں کی بہتر تعلیم و تربیت کرنے اور Child labour سے انہیں بچانے کے لئے Child Friendly Schools کا قیام ضروری ہے جہاں ہاتھ کا کام اور تعلیم دونوں لازم و ملزوم ہوں۔ ہمیں اپنے کالموں میں معاشرے کے بزرگ افراد، شہریوں کیلئے خلوص، محبت، ایثار کے دروازے کھولنے ہیں اپنی مشرقی روایات کے مطابق والدین کو عزت و احترام بزرگوں کیلئے عزت و توقیر، ماں کی محبت اس کے پاؤں تلے جنت تلاش کرنے کی سچی آرزو ہمارے کالموں کا زندہ موضوع ہونا چاہیئے۔ ہمارے کالم نگار ان شکستہ، خستہ مگر عہد رفتہ کی نادر عمارات، نقش و نگار بھول جاتے ہیں جو ہماری عدم توجہی کی وجہ سے زوال اور خستگی کی آخری حدوں تک جا پہنچے ہیں۔ ان کی مناسب دیکھ بھال ہمارا قومی فریضہ بھی ہے اور اپنے

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

روحانی ورثہ سے لگاؤ بھی۔ یہ رشتہ جتنا مضبوط ہو گا اُسی نسبت سے ہمیں اپنے اسلاف اور ان کی یادگار تخلیقات یاد رہیں گی۔ کالم نگار معاشرے کی زبان ہوتا ہے ان کے دلوں کی دھڑکنوں کو پڑھتا ہے احساسات کو سمجھتا ہے اور پھر اپنے کالموں میں معاشرے کی سچی تصویر پیش کرتا ہے لوگ اُسے پڑھتے ہیں اپنے دل کی بھڑاس نکالتے ہیں خوش ہوتے ہیں کہ کوئی ان کے جذبات کی ترجمانی بڑی بیباکی سے کر رہا ہے اگر یہ کالم کے دروازے بھی بند ہو جائیں، شوخی، طنز اور ڈرامائی نتائج کی تکنیک دم توڑ دے تو پھر ''بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری'' جیسی صورت حال پیدا ہو جائے گی۔ یہ وہ حبس ہے جس سے مضبوط دیواریں دھڑام سے گر پڑتی ہیں اور بعض نادان انہیں بارش کی تیزی اور ہوا کی آمیزش کا نتیجہ بیان کرتے ہیں۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ خاموش زبانیں اندر ہی اندر کسی طوفان کا سامان اکٹھا کر رہی ہوتی ہیں۔ کالم نگاران خاموش زبانوں کا ادراک رکھتا ہے۔ انہیں موزوں الفاظ دیتا ہے جرأت افکار سے روشناس کراتا ہے۔ ان گنت پھیلی ہوئی Controversies میں ایک صحیح نقطۂ فکر روشناس کراتا ہے۔ اس انفارمیشن سوسائٹی میں Media Consumers کا کیا کردار ہونا چاہیئے۔ پرنٹ میڈیا الیکٹرانک میڈیا کی کیا ذمہ داریاں ہیں کہ وہ کس طرح معاشرہ میں رونما ہونے والی تبدیلیوں، رویوں کو جدید ٹیکنالوجی کی روشنی میں بیان کر سکے اور اس کے Exposure کو عام فہم انداز میں پیش کر سکے۔ ایک کالم نگار کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس جدید ابلاغ کو اس طرح عوام کو مسائل سے منسلک کرے کہ ان سے ایک بہتر معاشرہ وجود میں آسکے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

آٹے کا بحران

قوموں کی زندگی میں آزمائش کے کئی دور آتے ہیں کبھی ان پر جنگ مسلط کر دی جاتی ہے اور کبھی بیرونی قرضوں کا بوجھ بڑھ جاتا ہے اور کبھی آٹا جیسے بحران کہتے ہوئے عجیب محسوس ہوتا ہے بحر حال آجکل آٹے کا بحران ہے لیکن قوم کا بھی عزم ہے کہ آٹا کوئی بحران نہیں۔ ہر مسئلے کا حل موجود ہے اور ہر تالے کی چابی دستیاب ہے صرف حل تلاش کرنے اور چابی ڈھونڈنے کی سمجھ ہونی چاہیے۔ خدا بھلا کرے ہمارے حافظ محمد اقبال خاکوانی صاحب کا جو نئے نئے وزیر بنے اور ابھی مبارکبادوں کا سلسلہ جاری تھا کہ اچانک آٹا درمیان میں حائل ہو گیا اور گذشتہ تین سالوں میں فصلیں بہتر نہیں ہوئیں گندم اور کپاس متاثر ہوئی ہے تو اس میں موجودہ حکومت کا کیا قصور ہے؟ محکمہ زراعت اور خوراک جانے کہ وہ کیوں سوئے رہے ہیں میاں محمد نواز شریف وزیر اعظم پاکستان اور وزیر اعلیٰ پنجاب میاں شہباز شریف نے بڑی سنجیدگی سے اس مسئلہ کا حل نکالنے کی کوشش کی ہے درآمدی گندم کے جہاز ملک میں پہنچ گئے ہیں ٹرک گلی گلی کوچے کوچے آٹے کی بوریوں تقسیم کر رہے ہیں دیہات میں پہلے بھی کوئی خاص کمی نہیں تھی کیونکہ دیہاتی گندم جسے وہ "دانے" کہتے ہیں سیونگ کے ماہر ہیں صرف شہریوں کو ایسی سیونگ کی عملی تربیت ہونی چاہیے۔ اسی لئے ماہرین اقتصادیات اکثر زور شور سے کہتے ہیں بچت بہت ضروری ہے بلکہ بچت میں تو کمیں وقفہ کا ہونا بھی ضروری نہیں۔ بحر حال آٹے کا بحران جس حکمت عملی سے حل کیا جا رہا ہے اس پر وزیر اعظم اور اسکی ٹیم مبارکباد کی مستحق ہے اور خاص طور پر ہمارے پنجاب کے وزیر خوراک حافظ محمد اقبال خاکوانی جنہوں نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اس بحران کی طرف توجہ دی اور قوم کو اطمینان دلایا کہ روٹی کا کوئی بحران نہیں لیکن بحران کی جو باقیات ہیں ان کی طرف مزید توجہ کی ضرورت ہے۔ اسی طرح سندھ، بلوچستان، سرحد اور پنجاب میں آٹے کی فراہمی معمول ہو رہی ہے اور نئی گندم بھی جلد مارکیٹ میں آجائے گی اور یہ آزمائش کا مرحلہ بھی طے ہو جائے گا۔ زراعت اور صنعت ہماری معیشت کے دو بنیادی ستون ہیں زراعت کے میدان میں ملک خود کفالت کی منزل کیسے حاصل کر سکتا ہے۔ آئندہ کیلئے موزوں منصوبہ بندی کی ضرورت ہے کاشتکار کے خدشات دور کرنے کی ضرورت ہے۔ اسے پانی کم ملا ہے فصلیں اچھی نہیں ہوئیں اس کا

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

تدارک کرنا ہمارے متعلقہ محکموں کی ذمہ داری ہے۔ ہمیں تو یہ اناج ایشیا اور افریقہ کے ملکوں کو برآمد کرنا تھا اور اب ہم ٹنوں کے حساب سے درآمدی محتاجی میں آگئے ہیں ہمارے کھیتوں کی زرخیزی اور ہمارے کسانوں کی محنت گواہ ہے کہ ہم اس میدان میں آگے بڑھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں صرف یہ نہیں بلکہ عالمی منڈی تک اپنی اجناس لے جا سکتے ہیں نئی عالمی منڈیاں تلاش کر سکتے ہیں اور اپنی شرح نمو کو اسطرح پر لا سکتے ہیں کہ خود کفالت ہماری منزل بن جائے گی۔ یہ کام آسان نہیں آٹے کا بحران اسکا راستہ نہیں روک سکتا۔ ایثار قربانی اور مشکل فیصلوں اور دلیرانہ پالیسیوں کی ضرورت ہے اور رہے گی اور اگر کہیں علاج کیلئے نشتر کا استعمال ضروری ہو تو اس سے گریز نہ کیا جائے۔ یہ بھی دیکھنا ہو گا کہ ماضی میں اگر ایسے بحران آئے ہیں تو حکومتیں ہل جاتی تھیں مگر عوام کا موجودہ حکومت پر اعتماد کا اظہار یوں بھی ہوتا ہے کہ مسئلہ تو پھر مسئلہ ہے مگر حکومت بھی مستحکم ہے۔ اہل ملتان جانتے ہیں کہ جب حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانی سہروردی کے دور میں قحط آیا تو انہوں نے اپنے گودام عوام کیلئے کھول دیئے آج جن کے گودام گندم سے بھرے ہیں وہ بھی ان بزرگوں کی قائم کردہ روایت پر کھل کر عوام سے داد لیں اور ثواب بھی کمائیں۔ ایک نیکی سے دو کام۔ دنیا بھی سنور جائے اور آخرت بھی ہاتھ سے نہ جائے۔ ایک قحط ۱۹۵۱ میں آیا ایسا ہی کٹھن مرحلہ تھا لیکن عوام نے اس مشکل کو اپنی ہمت سے حل کیا آج بھی ایسی ہمت چاہیئے کہ ہم اناج میں خود کفیل ہو جائیں۔

81686

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ابلاغ عام کی نئی صورتیں

بات چیت کو ابلاغ کہتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کے درمیان ہو تو ابلاغ عام ہو جاتا ہے کسی اخبار رسالے کا ابلاغ ہو تو پرنٹ میڈیا کہلاتا ہے ٹی وی، ڈش فلم کا ابلاغ الیکٹرانک میڈیا کا جدید روپ دھار لیتا ہے۔ ایک ایسا ابلاغ بھی ہے جو برطانیہ کے آئین کی طرح غیر تحریری صورت میں ہے اس میں رسم ورواج کا راج ہے۔ یہ رسم ورواج کا ابلاغ رکشا، ٹیکسی، ویگن، بس، ٹرک کی صورت میں ہوتا ہے اور ہر ٹیکسی ڈرائیور سے لیکر ٹرکوں کے ڈرائیوروں تک ہر ایک نے اپنے اپنے منشور کا اظہار اپنی گاڑیوں کے پھٹوں پر کیا ہوتا ہے ایسا بے لاگ، سچا اور پکا ابلاغ نہ تو کہیں پیدا ہوا ہے اور نہ کسی تعلیمی ادارے کے نصاب میں شامل ہے۔ یہ تو خواندگی کے فروغ کا ایسا پروگرام ہے کہ نئی روشنی اور تعلیم بالغاں کے ادارے اس سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ ویگن کے پیچھے کچھ ایسے معنی خیز جملے ہوتے ہیں کہ راستہ بھر طبیعت بحال رہتی ہے اور لکھنے والے کے تخلیقی ذہن کی داد دینی پڑتی ہے۔ ”میں کیسی لگتی ہوں“ ”بے رخیاں تے وت ساڈے نال“ ”پاس کر یا برداشت کر“ جیسے اپنائیت بھرے جملے زندگی میں حوصلہ پیدا کرتے ہیں کہ اس دکھی دنیا میں کوئی تو ایسا ہے جو پیغام محبت بڑھا رہا ہے دکھوں میں ساتھ دینے کی حامی بھر رہا ہے۔ انہیں خیالوں کو سوچتے ہوئے اچانک دوسری گاڑی ٹکر مار جاتی ہے اور جب اسکی طرف آنکھ اٹھتی ہے تو یہ خوبصورت جملہ پڑھنے کو ملتا ہے ”مورنی کی چال کیسی گئی“ نہ چاہتے ہوئے بھی داد دینی پڑتی ہے اسی طرح شہزادی، رانی، پردیسی، زخمی مظلوم جیسے الفاظ انکساری کا مظاہرہ کرتے نظر آتے ہیں۔ سواری تو پہلے ہی سفر سے نڈھال ہوتی ہے ایسے جملے رقت آمیزی کو اور بڑھا دیتے ہیں ”جلنے والے کا منہ کالا“ ”محنت کر حسد نہ کر“ ایسے رعب والے جملے تو شاید آٹھویں ترمیم میں بھی نہیں ہوں گے جو اس ابلاغ عام میں نظر آتے ہیں۔ اکثر ٹرکوں پر پریوں، فلمی شہزادیوں کی تصویریں بنی ہوتی ہیں اور پیچھے آنے والا ٹرک عقیدت سے پیچھا کرتا ہے کہ کہیں پری اڑ نہ جائے اور اسطرح اکثر حادثات کا سبب یہ پریاں بھی بن جاتی ہیں۔ اسی طرح قومی رہنما جن کے مر جانے کے بعد ان ٹرک والوں کو یاد آتی ہے انکے پورٹریٹ بنے ہوتے ہیں ایسے پورٹریٹ عقیدت سے نہیں بلکہ ٹریفک کے عملہ کو ڈرانے کیلئے بنائے جاتے ہیں کہ ہمیں ایک بار روک کے تو دیکھو پھر ساری زندگی پچھتاؤ گے

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

اور اگر واقعی کوئی ٹریفک کا عملہ روکتا ہے تو ایسا قومی عقیدت میں ڈوبا ہوا ٹرک کچلتا نکل جاتا ہے۔ اکثر گاڑیوں، بسوں اور ویگنوں پر ایسے شعر بھی لکھے ہوتے ہیں جو بین الاقوامی امن چارے کے فروغ میں مدد دیتے ہیں مثلاً

میرے پاس سے گذر کر میرا حال تک نہ پوچھا
میں یہ کیسے مان جاؤں کہ وہ دور جا کے روئے

''ماں کی دعا جنت کی ہوا'' والدہ سے عقیدت کا بھرپور اظہار ہوتا ہے رکشے میں سفر کرنے سے اخروی زندگی کا فلسفہ سمجھ میں آتا ہے وہ کسی اور ابلاغ میں موجود نہیں۔ پھٹے پرانے سلنسر کی آواز ڈیزل کا انتہائی مضر دھواں اور ٹیپ ریکارڈر کی وہ آواز جس سے معصوم بچے ماؤں کو چمٹ جاتے ہیں کہ امی کہیں بھونچال تو نہیں آگیا۔ بہر حال اس کے باوجود ایسے رکشے سواری کی استقامت اور زندہ رہنے کا حوصلہ بڑھاتے ہیں اور کم از کم بسوں سے تو بہتر ہوتا ہے جسکی فرنٹ سیٹ کے سامنے لکھا ہوتا ہے ''اے مسافر دھیان کر یہ تیرا کہیں آخری سفر نہ ہو'' اس کے بعد سواری کا دھیان آخرت کی طرف ہو جاتا ہے اور جیب کترے کا دھیان سواری کے سامان کی طرف ہو جاتا ہے کون پہلے سفر طے کرتا ہے ابلاغ عام کے شہ پارے ابھی تخلیق ہونے ہیں۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

نوائے وقت ملتان ابدالی روڈ پر : ارتقاء کا نیا موڑ

نوائے وقت ملتان ابدالی روڈ پر گل دین کالونی سے
ابدالی روڈ کے ارتقائی سفر کا ایک مشاہدہ

روزنامہ نوائے وقت ملتان کے دفاتر ۱۳ اپریل ۱۹۹۷ء سے اپنی نو تعمیر بلڈنگ واقع 63/A ابدالی روڈ ملتان منتقل ہو گئے ہیں۔ عظمت رفتہ کے دھندلے خاکوں میں تازہ رنگ بھرنے کی مراد بر آنے کیلئے ابدالی روڈ سے زیادہ مناسب جگہ اور کونسی ہو سکتی ہے یہی وہ جگہ ہے جہاں احمد شاہ ابدالی والی افغانستان کی جائے پیدائش قائم ہے۔ یہی وہ ابدالی روڈ ہے جو قاسم بیلہ کی طرف جاتا ہے جہاں غازی اسلام محمد بن قاسم کے لشکر کے پہلے پڑاؤ کے تاریخی آثار موجود ہیں اور وہ اس خطہ ارض پر ہماری روشن تاریخ کے نقطہ آغاز کی علامت ہیں۔ نوائے وقت کے دفاتر کی یہاں منتقلی ہمارے ملی، تہذیبی اور اسلامی تشخص، اپنی شناخت، اور اپنی منزل کی طرف آگے بڑھنے کا نام ہے۔ نوائے وقت ملتان سے اس علاقے کی صحافتی تاریخ کا سفر بھی سامنے آتا ہے۔ جب برصغیر کے مسلمان صحافی مسلم صحافت کے ارتقاء اور فروغ کیلئے سرگرم عمل تھے۔ جس طرح برصغیر پاک و ہند کے دیگر خطوط میں صحافت نے ترقی کی اس سے کچھ عرصہ پہلے ملتان ان سرگرمیوں میں پیش پیش تھا۔ پرنٹ میڈیا کی تاریخ کو اکثر مورخین ۱۸۵۷ کی جنگ آزادی سے شروع کرتے ہیں مگر ملتان سے ۱۸۵۳ سے ریاض نور کے نام سے باقاعدہ عوامی اخبار جاری ہوا اور اسکے بعد شعاع الشمس اور الشمس اور دیگر ان گنت پرچے جاری ہوئے جن کیلئے کئی تحقیقی مقالے درکار ہیں اور کئی مقالے شعبہ صحافت بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان میں موجود ہیں۔

۱۹۴۷ء کے بعد امروز اور نوائے وقت کے پرچے صحافتی افق پر ابھرے اگرچہ کوہستان، امروز، جسارت بند ہو گئے اور اب امروز پھر نئی شکل و صورت سے سامنے آرہا ہے لیکن نوائے وقت ملتان کو یہ شرف حاصل ہے کہ اسکا ارتقائی، تاریخی سفر تمام تر دشواریوں اور مختلف عمارات کی تبدیلیوں کے باوجود جاری رہا اور آج الحمدللہ اسے اپنی عمارت جو ملتان کی عمارات میں نمایاں ہو گی میسر آئی ہے دیگر قومی اخبارات بھی ملتان کو اپنا مرکز بنانے کی تمام تر

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

کوشش کر رہے ہیں اور یہاں سے اپنے پرچے نکالنے کا اہتمام کر رہے ہیں جو ایک خوش آئند اور قابل ذکر کوشش ہے کہ ملتان پھر صحافت کا مرکز اور صحافتی سرگرمیوں کا گھر بن جائے گا۔ پہلے ہی یہاں کا پریس کلب اور اخباری مارکیٹ فعال اور متحرک ہے مزید اسے خوشگوار فضاء میسر آئے گی۔ صحافت کا وہ چراغ نوائے وقت ملتان کی صورت میں جو ۱۶ جون ۱۹۵۹ء کو جناب حمید نظامی کی ولولہ انگیز قیادت میں اور مقاصد کی رفعت کا تعین کرتے ہوئے اور جنوبی پنجاب سے صحافتی ترجیحات کو مد نظر رکھتے ہوئے ملتان سے روشن ہوا۔ ۱۹۶۶ء کے اوائل میں ایوبی آمریت نے پریس اینڈ پبلی کیشنز ایکٹ کے تحت بند کیا ۱۹۷۸ء سے روشنی کا مینار بن کر دوبارہ شائع ہوا جو کئی نسلوں کی ذہنی تربیت کر رہا ہے اور دور پسماندہ ویران بنجر، سنگلاخ زمینوں کے خطوں میں شادابی، ہریالی، ترقی اور خوشحالی کو فروغ دے رہا ہے۔ افراد کی صلاحیتوں کو اور اداروں کی کارکردگی بڑھانے میں غیر جانبداری سے کام کر رہا ہے۔ نوائے وقت ملتان کو یہ منزل اچانک نہیں ملی۔ اس کے پیچھے مشکلات طویل تاریخ بھی موجود ہے اور عزم و ہمت کی فراوانی بھی۔ ۱۹۶۶ء میں یہ اخبار ملتان میں بند ہوا مگر اسکا دفتر گل دین کالونی میں قائم رہا اس دفتر کے چیف بیورو جناب شیخ ریاض پرویز تھے جو جناب مجید نظامی کی رہنمائی اور سرپرستی سے ۳۱ سالہ اپنی طویل صحافتی جدوجہد کے بعد اس شاندار عمارت کی تعمیر سے اس خواب کی تعبیر دیکھ رہے ہیں جو جناب مجید نظامی کے عظیم اور طویل المعیاد منصوبے کا حصہ تھا۔ بلا شبہ یہ امر اظہار تشکر کا ہے اور نوائے وقت، ملتان کے کارکنوں کی حوصلہ افزائی کا ہے اور دوسری طرف ملتان میں صحافی سرگرمیوں کے عروج سے بھی عبارت ہے۔ جس تیزی سے قومی اخبارات ملتان سے جاری ہونے لگے ہیں یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ نوائے وقت ملتان نے آج سے ۳۸ سال پہلے جن صحافتی سرگرمیوں کا آغاز کیا تھا وہ آج جنوبی پنجاب میں اور وطن عزیز کی مجموعی ترقی میں قابل فخر روایات کو شامل کر رہا ہے۔ ملتان جو کبھی صحافتی اخبار سے اجڑ گیا تھا آج ۱۹۹۷ء میں نئی آب و تاب سے کمپیوٹر پرنٹنگ اور انٹرنیٹ کے نظام سے مربوط ہو رہا ہے کشمور سے لیکر شورکوٹ تک ایک نئی صحافتی تاریخ مرتب ہو رہی ہے اور سرگرمیوں میں نئی شان پیدا ہو رہی ہے بلا شبہ اس میں نوائے وقت کا کلیدی کردار شامل ہے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

بکرے ہیں سب دیکھے بھالے

عید کی بھی کیا بات ہے۔ امیر ہو یا غریب عید سب کو اچھی لگتی ہے اسکو منانے کیلئے کیا کیا اہتمام کرنے پڑتے ہیں۔ کیا کیا پلان بنتے ہیں نئے نئے جوڑے سلواتے ہیں۔ فرمائشوں پر کھانے پکتے ہیں کہیں کوفتہ پلاؤ تیار ہوتا ہے اور کہیں سیخ کباب کی تیاری کی جاتی ہے کہیں نان اور ران کا ملاپ ہوتا ہے کہیں مشروبات تیار ہوتے ہیں اور کہیں بچوں کی فرمائش پر آئسکریم کے پیکٹ آتے ہیں غرضیکہ عید اپنے ہمراہ کئی خوشیاں لاتی ہے اور قربانی والی عید تو قابل دید ہوتی ہے۔

اس دفعہ گوشت کھانے کی حسرت گذشتہ ماہ سے کچھ زیادہ بڑھ چکی ہے اور اسکی قدر و قیمت کا اندازہ اس عید پر ہوگا۔ لیکن اس عید کا مرکزی کردار بکرا ہے اگر بکرے کی نفی کر دی جائے تو پھر عید کس کام کی لہذا بکرے کا حصول اس عید کی خوشی کا پہلا مرحلہ ہے۔ اب یہ بکرا کیسے لیا جائے۔ مہینے کی اٹھارہ تاریخ سے دفتر والے تنخواہ ایڈوانس نہیں دیتے بنک زیادہ محتاط ہو گئے ہیں عرف عام میں جسے اوڈی کہتے ہیں وہ بینک سے نہیں ملتی اگر کہیں سے ادھار پکڑ بھی لیا جائے تو امام مسجد کا فتویٰ ہے کہ قرض کے بکرے پل صراط نہیں چڑھ سکتے اگر کہیں سے کچھ اثاثے اکٹھے بھی کر لیں اور بکرا منڈی پہنچ بھی جائیں تو بکروں کی اس قدر بہتات ہے کہ صحیح بکرا تلاش کرنا مشکل ہے اور حکم یہ ہے کہ بکرا بے عیب ہونا چاہئے۔ یعنی پہلی شرط یہ ہے کہ بلوغت کو پہنچ چکا ہو، ناک کان، آنکھ سے صحیح ہو کوئی سینگ ٹوٹا ہوا نہ ہو کسی عارضہ میں مبتلا نہ ہو ہم جیسے واجبی علم والوں کو بکروں کے حسب نسب سے آگہی کہاں ہوتی ہے کبھی ایک مضمون کے بارے سوچا کرتے تھے کہ زوالوجی کیا ہے یعنی علم جانور شناسی کسے کہتے ہیں بکرا منڈی جا کر اس علم کی اہمیت کا اندازہ ہوا اگر اسے پڑھا ہوتا تو کم از کم بکرا شناسی تو آجاتی۔ ویسے بکرا منڈی کے آڑھتی اور مالکان علم میں خاصا اضافہ کرتے ہیں کہ یہ بکرا الائل پوری ہے یہ چست، تیز رفتار اور سمارٹ ہے مگر معاملہ قسمت پہ اٹک جاتا ہے وہ اس کے آٹھ ہزار روپے بتاتا ہے جب کہ ہمارے پاس مبلغ دو ہزار روپے ہوتے ہیں لہذا سمجھوتہ نہیں ہو سکتا نہ بکرے والے سے نہ حالات سے۔ اس کے لئے تو کوئی مرکزی وزارت ہونی چاہئے جو قیمتوں کا تعین کرے جب ایسی وزارت ہو گی تو پھر وزیر کا تقرر بھی ضروری ہے مگر خزانہ اسکا متحمل نہیں ہو

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

سکتا ویسے بھی اس وزارت کا کوئی فائدہ نہیں "متاثرین بکرا" کو کوئی رعایت نہیں مل سکتی اگر کوئی بکرا ہماری قیمت پر پورا اترتا بھی ہے تو اسکی درویشی کو دیکھ کر ترس آتا ہے کہ ایسے حلیم الطبع، لاغر اور کمزور بکرے کو کیسے گھر لے جائیں چل کر تو جا نہیں سکتا البتہ تانگے یا ریڑھی پر لے جاتے ہیں گھر آکر بکرا اس خشوع و خضوع سے اٹھتا بیٹھتا ہے کہ اسکی بزرگی اور گریہ زاری سے اہل محلّہ داد نہیں دیتے بلکہ فریاد کرتے ہیں کہ اسے چپ کرایا جائے اور اسے احساس دلایا جائے کہ کوئی پڑوس میں بیمار بھی ہو سکتا ہے یا کوئی طالب علم محو مطالعہ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ بکرا ہے ریڈیو تو نہیں کہ اسے بند کر دیں۔

بکر منڈی میں کچھ بکرے ایسے بھی ہیں جنہیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے ان پر خاصا کام کیا گیا ہے ان پر کیسے کیسے صدری نسخے استعمال کئے گئے ہیں۔ بعض بکروں کو بیسن کھلا کھلا کر ایسا موٹا کیا گیا ہے جیسے کسی سائیکل کی پرانی ٹیوب میں ہوا بھر دی گئی ہو بعض بکرے، دنبے، مینڈھے ایسے بھی ہیں جو قبائلی علاقے سے آئے ہیں ان کے مالکان کا مؤقف ہے یہ معمولی بکرے نہیں بلکہ وہ بکرے ہیں جن سے قبائلی روایات زندہ ہیں یعنی سجی کی ضیافتیں انہیں کے دم قدم سے ہیں۔ یہ بکرے چنے نہیں کھاتے بلکہ پہاڑی علاقوں کی جڑی بوٹیاں کھا کر جوان ہوئے ہیں انکے گوشت کا ذائقہ خشک اور پر لطف ہے۔ جی میں آتا ہے کہ ایسا بکرا گھر لے جائیں مگر جیب کا یہ عالم ہے کہ ایک طرف بکرا ہے دوسری طرف جیب میں صرف دو ہزار روپے ہیں اور بکرا آٹھ ہزار روپے کا ہے اب بتائیں کہ صدری نسخوں سے پلے ہوئے بکرے اور جڑی بوٹیوں کی تاثیر والے بکرے کیسے ہاتھ آئیں۔ بہر حال بکرا ہمارے معاشرتی سٹیٹس (Status) کا ایک سمبل ہے جس گھر کے سامنے تین بکرے بندھے ہوں آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اہل محلّہ پر ان بکروں کی ہیبت کتنی ہوتی ہے اور جہاں ایک بکرا ہو اور وہ بھی محرومیوں کی آغوش میں پلا ہو اسکی قربانی سے "جاودانی" کی بجائے پشیمانی ہوتی ہے کیسے اس کو زحمت دی۔ یہ تو خود ہمدردی کا مستحق تھا۔ بہر حال اس امر کی خوشی ہوتی ہے کہ کسی عام قصائی کی دکان پر بکنے سے بچ گیا اور عید قربان پر کئی سعادتوں اور کامرانیوں کو ہمراہ لیکر سرخرو ہوا۔ اس عید کی ایک خاص بات ہے کہ ہر طرف بکرے ہی بکرے نظر آتے ہیں ان کے بیٹھنے اٹھنے کا منظر بھلا لگتا ہے کچھ چست ہیں کچھ کاہل ہیں، کچھ لاغر ہیں کچھ بیمار لیکن قربان ہونے کا جذبہ انہیں بازار مصر میں لایا ہے۔ انکی اس سعادت مندی کو دیکھ کر بے اختیار پیار کرنے کو جی چاہتا

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ہے مگر ہم ان سے محبت بھی نہیں کر سکتے کیونکہ ان کی قیمت ہمیں انکے قریب نہیں آنے دیتی۔ البتہ کارپوریشن اور ایم ڈی اے والے ان سے جی بھر کر پیار کر رہے ہیں کارپوریشن کو پہلے ہی ہفتہ صفائی سے چڑ ہے اب ان کا عذر معقول ہے کہ کیا کریں ہر طرف بکرے ہی بکرے ہیں کہاں صفائی کریں ایم ڈی اے والے بھی خوش ہیں کہ جن تجاوزات سے ان کو شہریوں سے گلا تھا اب یہ تجاوزات بکروں نے کر رکھی ہے جب تک بکرے نہیں جائیں گے ان کو ان فرائض کی بجا آوری کا موقع نہیں ملے گا۔ ویسے بھی گھروں کے سامنے پھیلے ہوئے سبزہ زاروں کی صورت میں جو تجاوزات موجود تھیں انکا ان بکروں نے صفایا کر دیا ہے لہذا ایم ڈی اے حکام خوش ہیں کہ ان بکروں کے خلاف کوئی صاحب خانہ کاروائی نہیں کرے گا۔ بہر حال ایک طرف بکرے ہیں اور دوسرے طرف وضعدار سفید پوش مسلمان۔

زخمی ادھر ہے میرا دل
چھلنی ادھر میرا جگر
مرہم لگائے چارا گر
آدھا ادھر آدھا ادھر
ساری باتیں اپنی جگہ
گھر میں بکرا آنا چاہئے

یہی مناسب ہے جیسا بکرا بھی ملے وہی بکرا گھر لے جائیں بکرے ہیں بکرے ہیں سب دیکھے بھالے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

30

آؤ دعائیں اکٹھی کریں

دعائیں کیسے اکٹھی ہوتی ہیں؟ ''سننے والے نے حیرت سے پوچھا کہنے والے نے قدرے تحمل سے کہا اس کے لئے کسی بڑے سرمایہ کی ضرورت نہیں'' بس دعائیں اکٹھی کرنے کا جذبہ ہونا چاہئے۔ دعائیں آپ کے ارد گرد موجود ہیں بس انہیں تلاش کیجئے اور مل جائیں تو ان کی سرمایہ کاری کیجئے یہ سرمایہ ایسا ہے کہ اس پر نہ مارک اپ کا مسئلہ ہے نہ سالانہ زکواۃ کٹوتی کا بلکہ اس سے اثاثے بڑھتے ہیں کم نہیں ہوتے لیکن ''یہ دعائیں ملتی کہاں سے ہیں؟ میں لینا چاہتا ہوں'' سننے والے نے دوبارہ سوال دہرایا اور کہنے والے نے پھر کہا یہ دعائیں آپ کے ارد گرد موجود ہیں کبھی آپ نے دیکھا ٹریفک کا سپاہی کسی ضعیف بزرگ خاتون کو سڑک کیسے پار کراتا ہے۔ کبھی کوئی راہ چلتا کسی معصوم بچے کو گھر کا راستہ بتاتا ہے۔ کبھی ویگن میں بیٹھا ہوا نوجوان کسی بزرگ کو اپنی سیٹ دے دیتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوا ہے سگریٹ پینے والا کسی بزرگ کے آجانے پر سگریٹ بجھا دیتا ہے حالانکہ بزرگ اسے منع نہیں کرتا بلکہ کہتا ہے کہ بیٹا سگریٹ پیتے رہو مجھے کوئی اعتراض نہیں وہ جواب میں کہتا ہے بزرگو آپ کی عمر میرے باپ کے برابر مجھے شرم آتی ہے۔

بات دعا کی ہو رہی تھی دعا انسان کی وحشی جبلتوں کی تہذیب کرتی ہے عملی اور تخلیقی صلاحیتوں کو اجاگر کرتی ہے۔ اسے رفعتوں سے ہمکنار کرتی ہے۔ سوز جگر پیدا کرتی ہے رحمت و شفقت سے سرشار کرتی ہے۔ دعا دوسروں کی انسانیت جگاتی ہے انسان سے محبت کا راستہ دکھاتی ہے خالق سے مانگنے اور مخلوق سے رشتے نبھانے کا درس دیتی ہے یہ وہ نیکی ہے جس کی ہر شخص ہر بزرگ نے خواہش کی ہے۔ تمنا کی ہے۔ راتیں صرف کی ہیں شب بیداریوں میں اور دن کے اجالوں میں اسے تلاش کیا ہے علامہ محمد اقبال نے کیا خوب کہا ہے۔

بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل
اس شہر کے خوگر کو پھر وسعت صحرا دے
بے لوث محبت ہو، بے باک صداقت ہو
سینوں میں اجالا کر دل صورت مینا دے

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

اکثر لوگ پریشان ہو کر کہتے ہیں کہ رشتوں میں خلوص، گہرائی اور گرمجوشی نظر نہیں آتی۔ معاشرے میں حلیمی نہیں تلخی آگئی ہے۔ انسان بے مروت ہوتا جارہا ہے۔ دوسرے کیلئے ہمدردی کے بول اسکے پاس ختم ہو گئے ہیں۔ کسی کی کامیابی اسکے لئے جلن بن گئی ہے۔ حسد اسکی رگ وپے میں سما گیا ہے۔ غیبت اسکا وطیرہ بن گیا ہے۔ اسکا صرف ایک علاج ہے کہ معاشرہ میں دعاؤں کا بیلنس بڑھایا جائے۔ آٹے کی کمی، جبھی ہوتی ہے جب معاشرہ دعا سے محروم ہو جائے۔ اگر دعائیں کم ہو جائیں تو پھر معاشرہ فساد کی زد میں آجائے گا اور وہ جو کہا گیا تھا تمہاری زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان کو تکلیف نہ ہو کیا واقعی ہمارے ہاتھ اور زبان سے دوسرا مسلمان محفوظ ہے؟ ایسا نہیں۔ ہم نے اپنے ہاتھوں سے فن پارے تراشے اور تخلیق کرنے کی بجائے ایک دوسرے کی ٹانگیں کھینچنے پر لگا دیئے ہیں اور جی بھر کر ٹانگیں کھینچ رہے ہیں اور بھول گئے ہیں کہ اس رسہ کشی میں ہماری اپنی ٹانگیں کتنی کمزور ہو گئی ہیں اور زبان کا یہ معاملہ کہ چھوٹی چھوٹی باتوں اور بے بنیاد افواہوں پر ہم مشتعل ہو کر وہ کچھ کہہ جاتے ہیں کہ سننے والے کان پکڑتے ہیں اور داد دیتے ہیں کہ فصاحت و بلاغت میں ہم نے کیا مقام حاصل کر لیا ہے۔ دل آزاری کا ہم کوئی موقع ضائع نہیں ہونے دیتے۔ محبت، رحمت، شفقت کے دروازے بند کر لئے ہیں۔ تعظیم اور عزت دینے کی اقدار ہمارے ہاتھوں سے تحلیل ہو رہی ہیں اور ان کا کہیں شمار و قطار نہیں۔

آج کا ایک لفظ عام سننے کو ملتا ہے کہ فلاں این جی او ہے۔ کیا کام کرتا ہے چائلڈ لیبر کے خلاف کام کرتا ہے۔ غربت مٹانے کی بات کرتا ہے۔ بڑھتی ہوئی آبادی کے خاتمہ کیلئے کام کرتا ہے۔ ماحول میں آلودگی کو ختم کرنے کے درپے ہے یہ وہ این جی او ہے تعلیم، رفاع اور فلاح میں مصروف رہتا ہے۔ کیا کوئی ایسا این جی او بھی ہے جو معاشرے میں دعائیں اکٹھی کرتا ہو۔ بلاشبہ یہ این جی او بھی معاشرے میں دعائیں اکٹھی کرتے ہیں لیکن ان این جی او کے کردار میں مزید وقار اور نکھار آجائے گا۔ اگر وہ مقاصد سے ہٹ کر صرف اور صرف انسان کے لئے دعائیں اکٹھی کر لیں اس وقت انسان دعاؤں کے لئے ترس رہا ہے۔ بھوک، پیاس، غربت، بے انصافی، آبادی، آلودگی گہرے مسئلے میں ہیں مگر ان مسئلوں کے حل میں بڑی بڑی گرانٹ، عطیے، فلاحی منصوبے بے حد اچھے ہیں مگر مؤثر نتیجہ اس لئے نہیں مل رہا کہ ان میں دعاؤں کا فقدان ہے۔ دعا کا عمل کیمرہ، فوٹو، عکس اور پرنٹ میڈیا کا محتاج نہیں۔ دعا تو ایک

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

خاموش نداء ہے۔ ایک پکار ہے ایک آرزو ہے۔ ایک امنگ ہے۔ کچھ حاصل کرنے کی اور کچھ کر دکھانے کی۔ اس کا اپنا ابلاغ ہے جو جدید ابلاغ سے زیادہ مؤثر، تیز اور ہمہ گیر ہے۔

"خرد کی گتھیاں سلجھا چکا ہوں
میرے مولا، مجھے صاحب جنوں کر

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

سکولوں کو جانے والے راستے اور گلیاں

کیا اس سکول کی یہ سالانہ تقریب ہے ؟ آپ نے کیسے جانا کیونکہ سکول کے راستے صاف ستھرے ہیں نالیوں کے ارد گرد چونا پوڈر چھڑکا گیا ہے سکول کے صدر دروازے پر پھولوں والے گملے پڑے ہیں لگتا ہے کہ یہاں کوئی سیکرٹری تعلیم یا وزیر تعلیم آرہا ہے سننے والا حیرت سے سنتا رہا اور اسے جواب دینے لگا نہیں بھائی ایسی کوئی تقریب نہیں یہ سکول کے معمولات ہیں ہمارے وزیر سفیر تو بچے ہیں جن کیلئے ہم ایسا کرتے ہیں تاکہ انہیں محسوس ہو کہ قوم کے بچے واقعی قوم کا سرمایہ ہیں سرمایہ کی حفاظت کرنا اسے اچھا ماحول مہیا کرنا اور اسکے لئے صاف ستھرے راستے گلیاں مہیا کرنا اس لئے ضروری ہے کہ نئی نسل کے یہ نمائندے محسوس کریں کہ وہ دراصل وہی وی آئی پی ہیں تاکہ وہ وی آئی پی کو گل دستے پیش کرنے والے بچے ہیں بچوں کی تربیت اور انکی مناسب نگہداشت ہر ذمہ دار معاشرہ کا فرض ہے ہم نا جانے کیوں بچوں کو اس قدر اہمیت نہیں دیتے اگر بچوں کے معاملے میں کوتاہی ہو جائے تو یہ نازک آبگینے ذرا سی ٹھیس سے ٹوٹ جاتے ہیں اور انکی اصل صورت بھی مسخ ہو جاتی ہے لیکن المیہ یہ ہے کہ ہمارے راستے جو سکولوں کی طرف جاتے ہیں انتہائی گندے اور سیوریج کے پانی سے اٹے ہوتے ہیں یہ پانی اس قدر ڈھیٹ ہوتا ہے کہ ایک دفعہ قدم بوس کرے ہفتوں اسکی مہک نہ کپڑوں سے نہ بستے سے نکلتی ہے اکثر معصوم بچے اپنے وزنی بستے ان گلیوں کے گندے پانی میں گرا دیتے ہیں کیونکہ بستہ اٹھانا ایک معصوم بچے کا کام نہیں رہا اس قدر بھاری بھر کم بستے تو شاید ریلوے کا قلی بھی اٹھانے سے انکار کر دے کہ یہ بستے کمر توڑ بستے ہیں اور ان معصوم بچوں کو مبارکباد دینی چاہئے کہ انہوں نے ابھی سے وزن اٹھانے کی مشق کر لی ہے اساتذہ کرام بہتر سمجھتے ہیں کہ یہ بھاری بستے شاید ان معصوم بچوں میں مشقت اٹھانے اور علم سے عہدہ برآں ہونے میں مدد دیں گے مگر والدین کو ان بستوں کی افادیت سمجھ میں نہیں آتی اگر یہ بستے ہلکے پھلکے ہوں تو کم از کم گڑھے میں گرنے سے تو بچ جائیں کیونکہ ننھی سی اور کے جی کا بچہ جو اپنے پاؤں پر بمشکل چل پھر سکتا ہے اس بستے سے اس قدر بوجھل ہو جاتا ہے کہ وہ بستہ سڑک پر یا گلی کی نکر پر گرا دیتا ہے اور پھر جی بھر کر روتا ہے اسکی کاپیاں گندے پانی سے ایسے تر ہو جاتی ہیں کہ ان میں سے ایسا پانی رستا ہے جو پورے ماحول کو ایک عرصہ پریشان کرتا ہے کہ پوری کلاس

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

مہکی مہکی نظر آتی ہے اکثر سکول ایسی گلیوں میں قائم ہیں جہاں صفائی والا عملہ شاید عید برات پر نظر آتا ہے آگے پیچھے ان کی شکلیں اجنبی نظر آتی ہیں کچھ سکول اچھی سڑکوں پر بھی قائم ہیں مگر ان سڑکوں کی ٹریفک کا شور بچے کو متاثر کرتا ہے اور وہ پڑھائی میں کم توجہ لگاتا ہے بلکہ رکشا ویگن کے ہارن اسکی معلومات میں اضافہ کرتے ہیں۔

ملتان کا ایک ایسا پر رونق علاقہ بھی ہے جسے لودھی کالونی کہتے ہیں جو کبھی ملتان کی گرین بیلٹ کہلاتا تھا ایک نالہ تھا جو اب سڑک کی شکل اختیار کر گیا ہے اس نالے پر اب ایک سڑک ہے اور یہ سڑک ایک اچھے سکول کی طرف جاتی ہے لیکن بچے جس طرح سکول سے تین فرلانگ پہلے جس تعفن بو سے گزر کر جاتے ہیں اس اذیت کا اندازہ یا تو والدین کر سکتے ہیں جو روزانہ بچوں کو سکول چھوڑنے جاتے ہیں یا بچے خود اندازہ کر سکتے ہیں جو اس کوڑا کرکٹ پر ہر وقت آگ اور دھواں کے شعلے دیکھتے ہیں ہوا چلنے سے جس قدر ماحول میں بے زاری پیدا ہوتی ہے کاش یہ کالم اسکی سنگینی اور تلخی کو واضح کر سکتا حیرت یہ بھی ہے کہ آج تک کسی نے اس پر احتجاج نہیں کیا اہل محلّہ جو اس کوڑا کرکٹ کے گرد مکانوں میں رہتے ہیں شاید اس لئے خوش ہیں کہ چوری چکاری سے یہ علاقہ محفوظ ہے کیونکہ چور کو اس علاقہ میں آنے کے لئے آکسیجن ماسک پہن کر آنا پڑے گا ورنہ بچ کر جا نہیں سکتا بعض اوقات حیرت ہوتی ہے کہ کچھ افراد اور معاشرے ایسے بھی ہیں جو انسانیت کی فلاح بقاء کیلئے فلاحی منصوبے بناتے ہیں اپنی جائدادیں وقف کر دیتے ہیں ٹرسٹ بناتے ہیں اپنی شاندار حویلیاں تعلیمی اداروں کو دے دیتے ہیں ہسپتال بناتے ہیں اور مریضوں کیلئے مفت حکومت کے حوالے کر دیتے ہیں گلاب دیوی ہسپتال اسکی مثال ہے میاں منشی ہسپتال اسکی دوسری مثال ہے سر گنگارام نے پہلے کالج آف کامرس لاہور کو اپنی شاندار کوٹھی دے دی نواب بہاولپور نے مال روڈ لاہور پر قائم اپنا محل پنجاب یونیورسٹی کے حوالے کر دیا آج یہ عمارات اربوں روپے کی مالیت کی ہیں آج کوئی محل نہ دے کوٹھی بھی وقف نہ کرے کم از کم سکول کے جانے والے راستے تو بہتر بنا دے تاکہ بچے خوشی سے سکول جا سکیں مگر ایسا کیسے ممکن ہے ہمارے معاشرے میں Synthelic مشروبات پر ۲۰۰۰ ملین روپے درآمد پر خرچ ہوتے ہیں اور پان چھالیہ کی درآمد پر ۳۳۲ ملین روپے اور بچوں کی کتابوں اور دیگر تعلیمی سامان پر صرف ۱۳۷ ملین روپے صرف ہوتے ہیں اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ تعلیم سے تو پان چھالیہ بھی ترجیح لے گیا سکول کے راستے کشادہ صاف اور اچھے کب ہوں گے اور راستوں کی غلاظت کے خلاف کون آواز اٹھائے گا؟

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

مسئلہ کشمیر۔ مضامین گجرال کے آئینے میں

نئے بھارتی وزیر اعظم کی سوچ وہی ہے جو نہرو، اندرا گاندھی اور شیخ
عبداللہ کی تھی

اندر کمار گجرال کی تحریریں دیکھ کر مسئلہ کشمیر کے حوالے سے تمام
امیدیں بلاجواز محسوس ہوتی ہیں

وہ مظلوم کشمیریوں کو ان کا حق دلانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو
برصغیر کی تاریخ میں انہیں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکے گا
انہیں کشمیر کے سیاسی پس منظر میں بھارتی مظالم نہیں،
دہشت گردی کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے

انہوں نے لکھا ہے کہ عوام ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو ان کے والد کا
صحیح نعم البدل سمجھتے ہیں

جب سے اندر کمار گجرال بھارت کے وزیر اعظم بنے ہیں امیدوں اور توقعات کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ اخبارات کے اداریے، تبصرے اور مبصرین کی آراء جاری و ساری ہے۔ کسی نے کہا ہے یہ ۷۸ سالہ پنجابی وزیر اعظم ایک کہنہ مشق اور روشن خیال مدبر کی طرح بھارت اور پاکستان کے تعلقات کو معمول پر لانے میں اہم کردار ادا کرے گا۔ کسی نے جہلم کے حوالہ سے مسٹر گجرال کے وہ ساتھی ڈھونڈ نکالے جو ان کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیلا کرتے تھے۔ کسی نے اہل جہلم کی اپیل شائع کر دی ہے کہ مسٹر گجرال اب کشمیر کا مسئلہ حل کرو، کسی نے کہا ہے کہ اب مسئلہ کشمیر حل ہونے کے روشن امکانات پیدا ہو گئے ہیں۔ اب مظلوم کشمیریوں کی سنی جائے گی۔ ''اور کشمیر بنے گا پاکستان'' جیسی حقیقت معرض وجود میں آ جائے گی۔ بہر حال ابھی اخبارات، جرائد و رسائل کا یہ سفر خوش نما اور خوش ادا بیابانوں اور

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

دعووں سے بھرا پڑا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ۲۳ اپریل کے اخبارات میں بھارتی وزیر دفاع ملائم سنگھ یادیو نے پارلیمنٹ میں بیان دیتے ہوئے کہا ہے ''بھارت، پاکستان اور بنگلہ دیش کی کنفیڈریشن قائم کر دی جائے تا کہ دنیا کی کوئی طاقت ہمیں میلی آنکھ سے نہ دیکھ سکے''۔ بے شک بھارت جی بھر کر میلی آنکھ سے دیکھتا رہے۔ مزید انہوں نے کہا پچاس سال کے بعد سہی اب اس خواب کی تعبیر ہونی چاہئے اور آج سے پچاس سال پہلے بھارت تقسیم کر دیا گیا تھا۔ ان بیانات سے ہندو ذہن کی عکاسی بھر پور انداز سے ہوتی ہے کہ وہ آج بھی تقسیم ہند کو نہیں بھولے اور اب خوش نما، خوش ادا لفظوں سے اور اس کے اندر پوشیدہ زہر سے مسلمانوں کو پھر سے گمراہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کسی دانشور نے کہا تھا کہ ہندو کیا ہے؟

"They Worship the Cow, then milk the Cow and put the milk to the Cobra"

ہندو گائے کی پوجا کرتا ہے اور پھر پوجا کئے جانے والے جانور کو بھی معاف نہیں کرتا اس سے بھی دودھ لے لیتا ہے اور پھر اس دودھ کو سانپ کے آگے ڈالتا ہے تا کہ اپنا دفاع مضبوط کر سکے۔ یہی ہندو ہے جو سوراج کے نام پر شیوو جی راج قائم کرنا چاہتا تھا۔ اسی ہندو نے بھارت کے مسلمانوں کا جینا حرام کر دیا ہے۔ گزشتہ پچاس سالوں میں ہزاروں کی تعداد میں ہندو مسلم فسادات ہو چکے ہیں۔

ہماری ایک زبان ایک تہذیب اور ایک ہی رسم و رواج پھر ہم کیوں نہ اکٹھے رہیں۔ مسلمان اللہ کہتا ہے اور بھارتی ہندو ایشور بھلا اس میں کیا فرق سیکولر سٹیٹ ہونے کے ناطے بھارت اپنے باشندوں کے حقوق اور رسم و رواج کے فروغ کا حامی ہے۔ اب حقیقت سے ان باتوں کا جائزہ لیا جائے مسلمان اور ہندو کی تہذیب ایک جیسی کیسے ہو سکتی ہے اور اگر ایک تہذیب تھی تو پھر تقسیم ہند کا مسئلہ کیا تھا؟ مسلمانوں نے اپنے تشخص کیلئے علیحدہ آزاد مسلم مملکت کا نعرہ کیوں لگایا اور لاکھوں انسانوں کے معصوم خون کا نذرانہ کیوں پیش کیا۔ آگ اور خون میں ڈوب کر آزادی کی منزل کیسے حاصل کی۔ کتنے سر کٹے کتنے دربدر ہوئے یہ سب ایک تہذیب ایک تمدن اور ایک کلچر کے مظاہر تھے۔ ''مضامین گجرال'' کے نام سے ایک کتاب دسمبر ۱۹۹۶ میں مطبوعات ہفت روزہ ''اصول'' کراچی نے شائع کی ہے جسے جناب

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

شفیع۔ ایم۔ انعام نے اس نقطہ نظر سے شائع کیا ہے کہ اندر کمار گجرال سے انکی شناسی ایک عرصہ سے ہے اور یہ وہ مضامین ہیں جو اندر کمار گجرال نے روزنامہ سیاست حیدر آباد انڈیا میں شائع کرائے اور بعد میں انہیں کتابی شکل دی گئی۔ یہ مضامین ان کے وزیر خارجہ ہونے کے عہد میں شائع ہوئے اب وہ وزیر اعظم بھارت ہیں ان مضامین میں انکی سوچ کشمیر کے حوالہ سے وہی ہے جو شیخ عبداللہ کی تھی جو فاروق عبد للہ کی اب ہے اندر کمار گجرال نے انہیں کے نقطہ نظر کو آگے بڑھایا ہے وہ ایک ترقی پسند ذہن رکھنے والے اور زبان انگریزی کے لکھاری ادبی، سماجی، سیاسی تہذیبوں سے تعلق رکھنے، لکھنے اور سوچنے کی وجہ سے دیگر بھارتی وزیراعظموں سے مختلف ہو سکتے ہیں ان کے معتدل ہونے، پنجاب کی وضعداریوں اور سرزمین جہلم کے ناطے کشادہ دلی پیدا ہو جائے تو محض جغرافیائی اثرات ہو سکتے ہیں۔ ان کے ہندو ہونے اور بھارتی رہنما ہونے کے ناطے ان کے خیالات وہی ہیں جو پنڈت جواہر لال نہرو کے تھے اندرا گاندھی کے تھے اور دیوگوڑا کے تھے۔ وہ ان سے الگ یا مختلف نہیں۔ ہماری خوش فہمی کہ اندر کمار کی جائے پیدائش جہلم ہے۔ انکی تعلیم ایم۔ اے، بی کام، پی۔ ایچ۔ ڈی، ڈی لٹ ہے۔ ادیب اور بین الاقوامی امور کے تبصرہ نگار، ممتاز شاعر اور ادیب مسز شیلا گجرال سے شادی کی۔ جن سے دو لڑکے ہیں۔ انکا ادبی گھرانوں سے تعلق تو ظاہر کرتا ہے لیکن کشمیر کو آزاد کرانے اور پاکستان سے روابط کو بڑھانے کے عزم کا اظہار نہیں ہوتا۔ یہ درست ہے کہ وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھے سٹوڈنٹ یونین کے صدر رہے۔ تحریک آزادی میں بھی حصہ لیا۔ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ کی قرارداد پاکستان کے وقت منٹو پارک میں موجود تھے اور حضرت قائداعظم محمد علی جناح کے خطاب کو سننے کا انہیں اتفاق بھی ہوا لاہور سے جذباتی لگاؤ بھی رکھتے ہیں۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ ہمارے موجودہ وزیراعظم میاں محمد نواز شریف صاحب کا تعلق بھی لاہور سے ہے اور گورنمنٹ کالج لاہور کے فارغ التحصیل ہونے کا شرف بھی رکھتے ہیں آئندہ ماہ مالدیپ میں ہونے والی سارک سربراہی کانفرس بلاشبہ مفید نتائج کی حامل ہو سکتی ہے کہ دونوں رہنما گزشتہ پچاس سالہ تاریخ کا جائزہ لیں جو جنگ ۱۹۶۵، اعلان تاشقند پھر ۱۹۷۱ کی جنگ سکوت ڈھاکہ اور سرحدی تنازعے اور سب سے بڑا مسئلہ کشمیر جس کی وجہ سے کشمیریوں کا مستقبل بھارتی حکمرانوں کی مثبت سوچ پر منحصر ہے۔ اس کے علاوہ اندر کمار گجرال کو جہاں بھارت کے اندر مضبوط، مستحکم حکومت کو قائم کرنے کیلئے ٹھوس

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

اقدامات اٹھانے ہیں اسی طرح انہیں خارجہ مسائل میں ترجیح کشمیر کے مسئلہ کو حل کر کے ہمسایہ ممالک کو یقین دلانا ہے کہ بھارت کی توسیع پسندانہ پالیسی بدل گئی ہے تنازعہ کشمیر پاکستان اور بھارت تعلقات میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کانگریس نے گزشتہ ۴۸ سالوں میں اس مسئلہ کو پیچیدہ سے پیچیدہ تر بنانے کی پالیسی اپنائے رکھی ہے اب موجودہ وزیر اعظم بھارت کو اس مسئلہ کو حل فوری اور پائیدار تلاش کرنا چاہئے۔ یہ انکے تدبر، فکر اور ذہانت کا امتحان ہے کہ وہ روایتی بار ہویں وزیر اعظم ثابت ہوتے ہیں جنہوں نے اس مسئلہ کو بھارت کا اندرونی مسئلہ قرار دیکر مسئلہ کی اہمیت سے انکار کیا۔

جناب اندر کمار گجرال کی خدمت میں نہایت سنجیدگی سے عرض ہے کہ وہ تنازعہ کشمیر کا ٹھنڈے دل و دماغ سے مطالعہ کریں اور اس سوچ پر بھی نظر ثانی کریں جس میں وہ بنیاد پرستوں کا مسئلہ کہہ کر عافیت تلاش کر لیتے ہیں۔ تاریخی حقیقت میں جموں و کشمیر سے متعلق تنازعہ نو آبادیاتی نظام کے خاتمہ کا بچا کھچا مسئلہ ہے۔ یہ دو اہم پہلوؤں کے اعتبار سے سامراجیت کی پیداوار ہے۔ سب سے پہلے ۱۹۴۶ میں سامراجی طاقت برطانیہ نے ایک بیع نامہ کے ذریعے جموں و کشمیر کا علاقہ ایک جاگیردار کے حوالہ کیا دوسری باری ۱۹۴۷ میں اس جاگیردار کے جانشین مہاراجہ کو ریاست کے پاکستان کے ساتھ قدرتی الحاق کو روکنے میں برطانیہ کے سوا اور کسی نے مدد فراہم نہیں کی۔ دم توڑتی ہوئی استعماری طاقت ہندوستان میں قائم ہونے والی حکومت اور کشمیر کے مہاراجہ کے درمیان سہ طرفہ گٹھ جوڑی مسئلہ کشمیر کی جڑ اور بنیادی وجہ ہے۔ اس وقت پاکستان ایک نوزائیدہ ملک کی حیثیت سے معارض وجود میں آیا اسے اپنی حکومت کی بنیادیں ڈالنے کا عظیم چیلنج درپیش تھا وہ ایسے وسائل سے محروم تھا جن کی مدد سے اس سازباز کو ختم کیا جا سکتا ہے اور اس مسئلہ کی وجوہ کو دور کر سکتا جو جنوبی ایشیا میں امن و ترقی پر مسلسل اثر انداز ہو رہا ہے۔ مسئلہ جموں و کشمیر جنوبی ایشیا میں ایک حل طلب بین الاقوامی تنازعہ ہے جب تک اسے منصفانہ طور پر حل نہیں کیا جاتا علاقہ میں عدم استحکام اور کشیدگی جاری رہے گی۔ اس طرح دونوں ملکوں کے وہ وسائل جو عوام کی بہتری کے لئے صرف ہونے چاہئیں وہ جنگوں، سرحدی تنازعوں اور ایک دوسرے کو سفارتی سطحوں پر الجھانے پر صرف ہوں گے۔ آیئے اندر کمار گجرال کی کشمیر پالیسی کا جائزہ لیتے ہیں انکی تحریریں کیا کہتی ہیں اور وہ آجکل کیا کہتے ہیں۔ ۱۸ اکتوبر ۱۹۸۹ کو انکا ایک مضمون جس کا

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

عنوان ''وادی کشمیر میں تبدیلیاں'' روزنامہ سیاست میں شائع ہوا جس کے مطابق ''حکمران سیاسی تدبر سے کام لیں اور رائے عامہ کو ہموار کرتے ہوئے بنیاد پرستوں کو عوام کی تائید سے محروم کرتے ہوئے انکے حوصلے پست کر دیں۔ عوام ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو انکے والد کے صحیح نعم البدل کی حیثیت سے دیکھنا پسند کرتے ہیں''۔ دوسری جگہ میں لکھتے ہیں ''کشمیر کے سیاسی پس منظر میں دہشت ایک نیا عنصر ہے اس نے شہریوں بالخصوص تجارتی برادری اور مفلوج سیاسی جماعتوں پر اپنا سکہ بٹھادیا۔ انتہا پسندوں کی جانب سے ایک مکمل ''بند'' کیلئے ایک نامعلوم ٹیلی فون کال میں اگست کے اواخر میں تقریباً دو ہفتوں تک وادی کی زندگی کو مفلوج کر دیا تھا'' ایک دوسری مضمون میں جسکا عنوان کشمیر کی سیاست کے بدلتے تیور

''آمہذب صلح کریں جنگ ہو چکی''

''فاروق اور ہم سب پلیٹ فارم پہنچے تو ہجوم جوش سے زندہ باد اور مردہ باد کے نعرے لگا رہا تھا کوئی کم عقل لیڈر اس وقت اپنا توازن کھو دیتا لیکن فاروق عبداللہ کی دور نظری کو میں نے اس دن دیکھا اس نے لوگوں سے کہا ''ہمارا جھگڑا دلی کی سرکار کے ساتھ ہے بھارت سے نہیں'' اور ملک میں بھلے ہی کانگریس یا اندرا گاندھی کا راج ہو لیکن دیش تو سب کا سانجھا ہے اور یہ اپوزیشن کے نیتا (Leaders) آپ کے ساتھ کندھا ملانے آئے ہیں۔ تقریر نے ماحول بدل دیا لوگ دیش کی یکتا زندہ باد کہہ رہے تھے۔ کشمیر ہند الحاق زندہ باد کا نعرہ گونج رہا تھا میں نے (اندر کمار گجرال) اپنی مختصر تقریر کے بعد جب ''جے ہند'' کا نعرہ لگایا تو جواب پر جوش تھا اندر کمار گجرال ایک فلسفی اور مفکر انسان ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ہمیشہ تبدیلی کے خواہاں رہے ہیں لیکن ہماری ان سے بہت ساری امیدیں بلاوجہ ہیں۔ بہر حال کشمیر ان کے لئے سر دست ٹیسٹ کیس ہے اگر وہ اسے حل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور مظلوم کشمیریوں کو انکا جائز، قانونی، اخلاقی حق دلانے میں اور آزادی سے ہمکنار کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں تو اندر کمار گجرال بھارت بلکہ برصغیر کی تاریخ میں ایک ہیرو کا درجہ اختیار کر لیں گے۔ ان کا مقام مہاتما گاندھی سے کم نہیں ہوگا۔

آخر میں گجرال کے چند پسندیدہ اشعار درج ہیں۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ایک شعر علامہ محمد اقبال کا ہے

آئین نو سے ڈرنا طرز کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

دوسرا شعر یہ ہے۔

سینچا ہے اسے خون سے ہم تشنہ لبوں نے
تب جا کے اس انداز کا مے خانہ بنا ہے

خدا کرے کہ آزادی کا، مظلوم کی فریاد سننے کا اور کشمیریوں اور بھارتی مسلمانوں کی فلاح کا کوئی ایسا مے خانہ اندر کمار گجرال تشکیل دینے میں کامیاب ہو جائیں۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

تجوریوں کے تالے کب کھلیں گے ؟

بے روزگاری بھی کیا چیز ہوتی ہے۔ اس کا کرب، اسکی شدت سے وہی آگاہ ہو سکتا ہے جس نے کبھی رزق سے محرومی کی راتیں کاٹی ہوں، کبھی خالی جیب رہنے کا تجربہ حاصل کیا ہو، کبھی کسی سے مانگ کر سگریٹ پیا ہو، رکشے اور ویگن میں بیٹھنے کیلئے کرایہ نہ ہو اور کسی موٹر سائیکل والے سے لفٹ لے کر گھر پہنچا ہو۔

آج آپ کی ملاقات ایک ایسے نوجوان سے کراتے ہیں جو گزشتہ پانچ سال سے بے روزگار ہے۔ کبھی کبھار ڈیلی ویجز پر اسے کام ملا ہے لیکن نوکری پکی نہ ہونے کی وجہ سے ایسے نکالا گیا جیسے دودھ میں سے مکھی کو نکال باہر کیا جاتا ہے۔ اسکی تنخواہ میں سے چھٹیاں ایسے کاٹی جاتی ہیں جیسے نوآموز صحافی کے مسودہ کا حشر ہوتا ہے میں نے اس نوجوان سے پوچھا کیا وجہ ہے آپ کو نوکری نہیں مل رہی اس نے آہ سرد کھینچتے ہوئے ابھی چشم تر ہونے کا مرحلہ نہیں آیا تھا۔ اس نے کہا میں تو آپ کے پاس آیا ہی اس لئے ہوں کہ آپ مجھے اپنے کالم کا موضوع بنائیں۔ میری ذات میں فیچر نگاری کے لئے وسیع مشاہدات اور تجربات ہیں۔ اداریہ نویسی کیلئے لمحات فکر ہیں اور کالم میں چونکا دینے والے حالات وواقعات ہیں۔ کاش کوئی مجھے اپنے کالموں میں جگہ دیتا اور مجھے مثال بنا کر ان چار کروڑ نوجوانوں کے مسائل اجاگر کرتا جو نوکری کی تلاش میں صبح سے شام تک سرگرداں رہتے ہیں جنہیں گھر سے صبح صلوٰتوں کے ساتھ رخصت کیا جاتا ہے اور جب وہ شام کو منہ لٹکائے گھر آتے ہیں تو انہیں صبح سے زیادہ گرمجوشی اور مؤثر ابلاغ جس کا مظاہرہ کبھی آپ نے سبزی منڈی اور غلہ منڈی میں ہونے والے انداز تکلم سے لگا سکتے ہیں پہلے اس سے تواضع کی جاتی ہے اور پھر وہ ماں جو اپنے لال کیلئے کتنے وظیفے اور دعائیں کرتی ہے اس لال کو صبح کے پکے ہوئے سالن اور روٹی سے سلادیتی ہے۔ جناب میں اپنی نظروں میں خود گر گیا ہوں۔ جس دفتر میں جاتا ہوں وہاں سے جواب ملتا ہے کہ یہاں کوئی خالی جگہ نہیں۔ ابھی نوکریوں پر پابندی ہے۔ کہیں سے جواب ملتا ہے کہ مایوس نہ ہوں عنقریب کوئی جگہ نکلے گی۔ اخبار میں اشتہار دیں گے۔ آپ اخبار کا مطالعہ جاری رکھیں جونہی اشتہار چھپے دفتر ہذا سے رجوع کریں۔ کچھ ادارے ملازمت کے خواہشمندوں کو اسطرح ٹالتے ہیں "دیکھئے جی ایک سکیم زیر غور ہے اس میں نوکریاں ہوں گی بس انتظار کریں

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

کہ ہیڈ آفس سے اس سکیم کی منظوری آجائے" ہوتا یوں ہے کہ نہ کہیں سکیم ہوتی ہے اور نہ ہی منظوری کا مرحلہ درپیش ہوتا ہے اور امیدوار جوتیاں چٹخا چٹخا کر آدھ موا ہو جاتا ہے اور پھر

.....

جو تیری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

اگر کہیں واقعی نوکری کا امکان پیدا ہو جائے اور تعلیم بھی درست قرار پائے تو قسمت کی بات دیکھئے ٹوٹی کہاں کمند۔ سارا بنا بنایا کھیل تجربہ کے خانہ میں بگڑ جاتا ہے۔ دفتر والے تجربہ مانگتے ہیں لیکن تجربہ کہاں سے لائیں۔ گزشتہ پانچ سال سے بے روزگار رہنے کا تجربہ تو ہے لیکن کام نہیں ملتا۔ انہیں ملازمت کا تجربہ چاہئے، میرے بے روزگار نوجوان نے بتایا نوکری کیلئے جہاں جہاں سے اطلاع ملتی ہے وہاں وہاں درخوستیں بھیجتا رہتا ہوں لیکن کہیں سے جواب آجاتا ہے کہ فلاں تاریخ کو انٹرویو ہے آجاؤ اور کہیں سے سرے سے جواب ہی نہیں آتا۔ شاید انہیں مجھ سے ہمدردی ہے کہ آنے جانے کے اخراجات کچھ زیادہ بڑھ گئے ہیں۔ ویسے بھی آجکل کا سفر غیر محفوظ ہے انکی اس سوچ پر خوشی بھی ہوتی ہے اور انکی حقیقت شناسی کا بھی علم ہوتا ہے۔ اگر وہ واقعی بلا لیتے سارا دن بھوکا پیاسا بٹھائے رکھتے تو میں انکا کیا بگاڑ لیتا، ایسے ہی موقعوں پر انگریزی کا وہ محاورہ یاد آتا ہے جو کچھ یوں تھا-Beggers are never choos ers لہذا صبر شکر کے ساتھ بیٹھ جاتا ہوں البتہ محلّہ کی جس ہستی سے ڈر لگتا ہے وہ پروفیسر صاحب ہیں جو گزشتہ پانچ سال سے میری اسناد، سرٹیفکیٹ تصدیق کرتے کرتے تھک گئے ہیں۔ جب میں اپنی اسناد کی فوٹو سٹیٹ کاپیوں ایک تھیلا بھر کر ان کے گھر جاتا ہوں وہ خوشی سے تصدیق کر دیتے تھے لیکن اب وہ کچھ دنوں سے اس کام کو بوجھ سمجھنے لگے ہیں۔ ایک بار میں جب ان کے گھر فوٹو سٹیٹ اسناد تصدیق کرانے گیا تو انہوں نے کہا "نعیم! تجھے کب نوکری ملے گی؟" جب میں چپ رہا تو وہ خود تصوف کی کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ شاید وہ کہہ رہے ہوں.....

خود بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر

کبھی لوگ کہا کرتے تھے کہ درد دل رکھنے والے لوگ بھی اسی دنیا میں بستے ہیں اور جو خاموش دعاؤں سے لوگوں کو اپنا گرویدہ کر لیتے ہیں۔ ایسے دیدہ بینا نے قوم کو شاعر ان لفظوں میں خراج تحسین ادا کرتے ہیں۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

بتائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

اب نہیں معلوم کہ آنکھ نے اشکبار ہونا کیوں چھوڑ دیا ہے۔ معاشرے میں نمک تو ہے زندگی میں نمکینی کیوں ختم ہو رہی ہے۔ اہل درد تو ہیں لیکن تجوریوں پر تالے کیوں لگے ہیں۔ زر تو ہے لیکن گردش میں کیوں نہیں۔ بینکوں کے ڈپازٹ بڑھ گئے ہیں لیکن سرمایہ کاری کیوں نہیں۔ صنعتیں تو ہیں مگر پیداواری ہدف کیوں رک گیا ہے۔ زراعت تو ہے لیکن آٹا کیوں نہیں ملتا۔ وسائل اور ذرائع تو ہیں مگر صنعتیں کیوں نہیں لگتیں۔ کاروبار کیوں نہیں بڑھتے۔ سب کچھ موجود ہے تو نوکریوں پر تالے کیوں ہیں؟ انہیں کون کھولے گا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تالے کو زنگ لگ گیا ہے اور چابی کہیں کھو گئی ہے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

اعلیٰ سند اور قبائے فضیلت

کبھی جبہ و دستار ہمارے علمی وقار کی علامت تھا اور ہماری درس گاہیں نصاب و کتاب تک محدود نہ تھیں بلکہ دار العمل اور دانش کدہ کہلاتی تھیں۔ ان اداروں کے در و دیوار، سنگ و خشت، فکر و نظر، جذبہ حریت اور عزم و نظم کی علامت تھے بلکہ ہماری تاریخ شاہد ہے کہ انہیں اداروں سے تحریک آزادی اور قیام پاکستان کے قافلے مختلف منزلوں کو روانہ ہوئے تھے۔ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور، اسلامیہ کالج پشاور، مدرسۃ الاسلام کراچی، انجمن اسلامیہ ملتان غرضیکہ انہی اداروں کی خدمات کے ثمرہ میں ہمیں پاکستان ملا۔ یہ ادارے سکوت ساحل نہیں تھے تلاطم دریا تھے۔ بظاہر یہ معمولی نوعیت کے کیمپس پر مشتمل تھے اکثر انہی اداروں میں ایسے ادارے بھی تھے جو مٹی اور گارے کی کچی دیواروں اور کھجور کے پتوں سے بنی چھتوں سے تعمیر کئے گئے تھے مگر ان کے باوجود علم و عرفان کی ان میں ایسی شمعیں روشن تھیں جو وقت کی تیز آندھیوں میں بھی فروزاں رہیں۔ ان اداروں سے فارغ التحصیل طلباء جب اسناد حاصل کرتے اور قبائے فضیلت پہنتے تو ان کے وقار اور کردار کی بلندی کوہ ہمالیہ سے بھی اونچی نظر آتی اور پھر یہ قریہ قریہ، کوچہ کوچہ ابلاغ عام کیلئے اس طرح مصروف رہتے کہ انہیں دیکھ کر ایک متحرک یونیورسٹی کا گمان ہوتا۔ ان کے تجربات تاریخ کا حصہ بنتے۔ ان کے مشاہدات پر ایجاد، تخلیق کے مرحلے طے ہوتے۔ ان کے رشحاتِ قلم ان کے گہرے مطالعہ کا نچوڑ ہوتے۔ اس بات کی بھی تاریخ کے اوراق گواہی دیتے ہیں ان کی تصانیف آج بھی ان کے فکر کی صداقت اور افکار کی پختگی کی مظہر ہیں۔ شاید علامہ محمد اقبالؒ نے کچھ انہی ہستیوں سے متاثر ہو کر کہا تھا.....

حاصل کسی کامل سے یہ پوشیدہ ہنر کر
کہتے ہیں کہ شیشے کو بنا سکتے ہیں خارا

آج تاریخ کو ان قدسی صفات ہستیوں کی تلاش ہے مگر وہ سوز محبت وہ جوش و خروش نظر نہیں آتا۔ ایسا لگتا ہے کہ اجنبی تہذیب کی چکاچوند اور مادیت کی دلکشی نے ہماری صدیوں درخشندہ روایات کو مضمحل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی جس سے ہماری اقدار کا کہیں

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

نہ کہیں زوال کا عمل جاری ہے لیکن ہمیں اس کا احساس نہیں ہو رہا اور نہ کبھی ہم نے اس کا سنجیدگی سے تجزیہ کیا ہے۔ شاگرد کا گلہ درست ہے کہ اس کا استاد اس کی کردار سازی میں وہ دلچسپی نہیں لے رہا جو ہمارے بزرگ اساتذہ کا طریق کار ہوتا تھا۔ استاد محترم کو بھی شاگرد سے گلہ ہے کہ وہ سنجیدگی سے تعلیم میں دلچسپی نہیں لیتا۔ بہر حال مسائل جیسے بھی ہوں استاد ہو یا شاگرد اداروں میں اقدار کو اور خاص طور پر جبہ و دستار کی فضیلت قائم رہنی چاہیئے اور وہ لمحے ضرور ؟؟؟ سی فارغ التحصیل طالب علم یا طالبہ کو وہ اسناد ملیں جو اس کی کاوشوں کا ثمرہ ہے اور وہ تقاریب دیکھنے کو ملیں جن میں چانسلر یا وائس چانسلر امیدواروں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔

"ان اختیارات کی رو سے جو مجھے اس یونیورسٹی کے چانسلر کی حیثیت سے حاصل ہیں میں آپ کو سند دے رہا ہوں اور توثیق کے لئے یہ دستاویز پیش کرتا ہوں اور اس قبائے فضیلت کے پہننے کی اجازت دیتا ہوں"۔ اس سند کا مقررہ نشان ہے اور وہ لمحے بھی بڑے یادگار ہوتے ہیں جب کسی یونیورسٹی کا وائس چانسلر درخواست کرتا ہے کہ "جناب والا! میں درخواست کرتا ہوں کہ کانووکیشن کی کاروائی کے اختتام کا اعلان فرمائیں" اور پھر چانسلر جو صوبے کا گورنر ہوتا ہے ان الفاظ کے تحت "میں کانووکیشن کی کاروائی کے اختتام کا اعلان کرتا ہوں" اور پھر جلوس اپنے چانسلر کے ہمراہ واپسی کیلئے ہال سے روانہ ہوتا ہے آنے اور پھر جانے پر جلوس کا ہال میں موجود اشخاص تعظیماً کھڑے ہو جاتے ہیں اور جلوس کے رخصت ہونے تک کھڑے رہتے ہیں۔

ایسی تقاریب دیکھنے کا اہل دردمندوں انتظار کرتے ہیں اس یوم سعید کیلئے کئی کئی سال تیاریاں ہوتی ہیں مگر المیہ یہ ہے کہ ایسی تقاریب بھی ہماری مصلحتوں کی شکار ہو گئی ہیں۔ گذشتہ کئی سال سے جامع پنجاب میں کوئی تقریب ایسی نہیں ہوتی۔ بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان جسے قائم ہوئے تقریباً ۲۲ سال ہو گئے ہیں اس عرصہ میں صرف ایک کانووکیشن منعقد ہوئی جسے اب تک تقریباً دس سال ہو گئے ہیں۔ یہ کانووکیشن ۱۹۸۶ء میں نشتر میڈیکل کالج کے آڈیٹوریم میں منعقد ہوئی جس میں مہمان خصوصی سابق وزیراعظم پاکستان محمد خاں جونیجو مرحوم تھے۔ اب دوبارہ ایسی کانووکیشن ۱۶ مئی ۱۹۹۷ء کو یونیورسٹی کیمپس میں منعقد ہو رہی ہے۔ اس گمشدہ کڑی کو جوڑنے میں پروفیسر ڈاکٹر عاشق محمد خان درانی کا بڑا اہم کردار ہے۔ انہوں نے وائس چانسلر کا منصب سنبھالتے ہی کونووکیشن کی تیاریاں

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

شروع کر دیں اور پھر سے زوال پذیر اقدار کو پیغام نو کی نوید دی اور ملتان اور ڈیرہ غازی خان جیسے پسماندہ خطوں میں مسرت اور رجائیت کے لمحے دوبارہ لوٹا دیئے اور پھر اداروں میں رفعتوں اور علمی وقعتوں کا دور شروع ہو گیا۔ برٹرنڈرسل نے کیا خوب کہا تھا "صرف ایک نسل میں ہزار سال کا فاصلہ طے کر سکتے ہیں" اور پھر ۱۶ مئی کی کانووکیشن ہمیں اعلیٰ اسناد اور قبائے فضیلت کو طرف لے جائے گی جو ہمارے علمی ورثے کی خشت اول ہے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ہم کیا پڑھیں اور کیا نہ پڑھیں

آپ بھی اکثر محفلوں میں جاتے ہیں اور کئی طرح کی محفلوں میں شرکت کرتے ہیں۔ ہمیں بھی ایسے موقعے ملتے رہتے ہیں۔ محفل جیسی بھی ہو اور جس مکتب فکر سے بھی اس کا تعلق ہو اس میں شریک سیاست دان ہوں یا ادیب عام شہری ہوں یا کسی دانش کدہ کے دانشور۔ کسی درسگاہ کے استاد ہوں یا کسی اہم عہدے پر فائز سکریٹری صاحبان ہوں۔ ایک سوال عموماً سننے کو ملتا ہے۔ اور پھر اسکا جس طرح حشر نشر ہوتا ہے اس کے لئے ایک الگ سے کالم کی ضرورت ہے۔ سوال مختصر ہوتا ہے اور جواب اتنے طویل ہوتے ہیں کہ ایک محفل برخواست ہو جاتی اور دوسری محفل یہی سوال نامکمل ایجنڈے کی طرح موجود ہوتا ہے پھر شرکاء محفل اسطرح بحث شروع ہو جاتی ہے جیسے کسی ڈرامہ کی ادھوری قسط دکھائی جارہی ہو اور کردار الجھ کر رہ گئے ہوں۔ یہ سوال کسی ایک مخصوص محفل کا محتاج نہیں شادی بیاہ سے لیکر موت و حیات تک پھیلا ہوا ہے۔ قبرستان سے لیکر تعزیت تک اور تعزیت سے قل خوانی تک۔ سبزی منڈی سے لیکر لکڑی منڈی تک اس کا سلسلہ جاری ہے۔ اس کے چھڑ جانے پر کسی کو اعتراض نہیں بلکہ ہر شخص بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا ہے۔ اور اس میں ایسے حسب توفیق اضافے کرتا ہے اور اپنی معلومات کو پھیلاتا ہے کہ سننے والے اس کے علم، مشاہدہ اور تجربہ کے قائل ہو جاتے ہیں۔ ادیبوں صحافیوں سے اپنے تعلقات اسطرح بیان کرتا ہے گویا یہ انکا ہر وقت کا ساتھی، ان کا دوست اور انکی بچپن کی یادوں کا سرمایہ ہے۔ انکی زندگی کے حوالے سے اسطرح بیان کرتا ہے کہ گویا صحافی کی ساری تاریخ اس کی نظروں کے سامنے ہے۔ فلاں کالم نویس کیا تھا اپنا یار تھا، ہمارے پولٹری فارم سے انڈے لے جاتا تھا۔ ہم اکثر اکٹھے چائے خان بابا کے ہوٹل پر پیتے تھے یا فلاں ادیب ہمارے مکان کے ایک حصہ میں کرایہ دار تھا تین چار مہینوں کا کرایہ بھی ابھی اس کی طرف نکلتا ہے فلاں اخبار نویس نے جب صحافت کے میدان میں قدم رکھا اس سے پہلے ہماری بستی میں معمولی سی دکان پر کام کرتا تھا۔ آج بڑا اخبار نویس بنا ہوا ہے۔ بڑے بڑے ایوارڈ لیتا ہے اور غیر ملکی دوروں میں پیش پیش ہوتا ہے۔ غرضیکہ جی بھر کر صحافی کے فن اور شخصیت پر تبصرہ کیا جاتا ہے کہ سننے والے کہنے والے کے اس قدر قرب پر حیران ہوتے ہیں اور اسے علم دوست اور اہل قلم کا ساتھی سمجھتے ہیں۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

حقیقت خواہ کچھ بھی ہو لیکن محفل پر ہر بات معتبر ٹھہرتی ہے اور کہنے والا جو کہے اس پر کوئی تنقید کا لفظ نہیں لاتا۔

بات ہو رہی تھی سوال کی کہ وہ کونسا سوال ہے جسے ہر محفل میں اتنی پذیرائی ملتی ہے اور جس پر بحث کرنے والے اتنے مقرر دستیاب ہوتے ہیں۔ وہ سوال صرف اتنا ہے کہ ہم کیا پڑھیں اور کیا نہ پڑھیں ؟ آپ بھی حیران ہونگے یہ بھی کوئی سوال ہے یا کوئی موضوع ہے۔ جناب ایسا نہیں۔ اس سوال کے پیچھے جو نظام فکر قائم ہے اسکی طرف بھی آپ نگاہ دوڑائیں۔ کسی شاعر کو شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا تھا وہ الگ بات تھی۔ اچھی کتاب، رسالہ، اخبار کا انتخاب واقعی مشکل ہے۔ لیکن بظاہر یہ بات سمجھ نہیں آتی کہ یہ کیوں مشکل ہے۔ حالانکہ ہر شخص جسمانی اور ذہنی لحاظ سے اس قابل ہے کہ اس کا فیصلہ کر سکے اور اپنے رجحان کے مطابق اس کو اولیت دے سکے۔ ہر شخص جانتا ہے کونسا اخبار کتنا معیاری ہے کونسا رسالہ یا میگزین صوری و معنوی اعتبار سے بہتر ہے۔ کونسی کتاب مفید ہے پھر یہ الجھاؤ کیوں ہے ؟ جناب والا! ناراض نہ ہوں، آپ نے کبھی گنے کا رس پیا ہے ؟ اس گنے کے اندر جھانکا ہے جسکے کچھ حصے زہریلے کیڑوں کے مسکن بھی ہوتے ہیں۔ اس زہر کو کبھی آپ نے الگ سے دیکھا، اگر نہیں تو آج سے دیکھنا شروع کریں لفظوں کے درمیان۔ کتاب کے اوراق اخبار کے صفحات بھی ایسے زہریلے کیڑوں سے بھرے پڑے ہیں ایسے لٹریچر ایسے فکشن اور ایسی نان فکشن تحریروں کو زہر سے پاک کرنا ہے ایسی تحریریں ہماری سوچ کی فصل کو سنڈیوں کی طرح چاٹ رہی ہیں۔ کیا آپ نے ان کتابوں کو پڑھا ہے جو معاشی ناہمواری، چائلڈ لیبر، طبقاتی نفرتوں کے خلاف لکھی گئی ہیں مگر ان کے اندر جو مواد ہے وہ کسی ایٹم بم سے کم نہیں۔ ایک ایک جملہ زہر آلود ہے۔ ایک ایک لفظ نفرتوں اور نقاطوں کا آئینہ دار ہے۔ کبھی آپ نے اجنبی تہذیب جسے آجکل اقوام غالب کی تہذیب کہتے ہیں اسکا مخصوص ذہنی اور نفسیاتی دباؤ دیکھا ہے اور اسکے اندر چھپا ہوا سامراجی ذہن کس طرح ہمارے درمیان نفاق پیدا کر دیا ہے کبھی آپ نے ان تحریروں کو دیکھا ہے جو کردار کشی، انسان دشمنی کی آئینہ دار بن کر سامنے آتی ہیں۔ انسان کا انسان سے رشتہ توڑ دیتی ہیں انسان کے اندر سے ہمدردی، درگزر اور برداشت کے حوصلے مٹا دیتی ہیں۔ کیا ان تحریروں کو بھی دیکھا ہے جو وطن عزیز کی اساس پر اسکی جڑوں پر نشتر چلاتی ہیں۔ پھر ایک عام قاری سوال کرتا ہے کہ ہم کیا پڑھیں ؟ اسکا جواب مشکل نہیں۔ آپ وہ

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

سب کچھ پڑھیں جسمیں پاکستانیت کی بو باس بسی ہے آپ اس صحافی، ادیب، دانشور، شاعر کو پڑھیں جنہوں نے عمر بھر پرورش لوح و قلم کی ہو۔ ہوا کے رستے چراغ جلائے ہوں خود دکھوں میں رہے ہوں اور فٹ پاتھ پر لیٹے ہوئے ایک مجبور و بے بس کے لئے کالم لکھے ہوں۔ ایسا ادب، ایسا لٹریچر پڑھیں جس میں مردم آزار اور خلق بے زاری نہ ہو۔ ہر مسلک کیلئے رواداری اور محبت ہو۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں رسالے، کتابیں، اخبار مہنگے ہو گئے ہیں۔ ایک عام قاری کی پہنچ سے دور ہیں کیا ایک اچھا اخبار سستا نہیں ہو سکتا۔ ایک اچھا رسالہ، اچھی کتاب کم داموں میں دستیاب نہیں ہو سکتی۔ اس کا فیصلہ حکومت نے کرنا ہے یا APNS کے جناب صدر مجید نظامی صاحب نے سوچنا ہے کہ اگر حکومت کے ٹیکس کم ہو جائیں تو اخبار سستے ہو سکتے ہیں لیکن ایک کتاب آج بھی بہت سستی ہے اور جس کا مطالعہ لوگ کرنا بھول گئے ہیں اگر وہ کتاب مل جائے تو اسے ضرور پڑھیئے۔ وہ کتاب کہاں ہے؟ یہ سوال واقعی درست ہے اور اسکا جواب بھی مختصر موجود ہے یعنی The study of mankind وہ انسان جو لفظوں اور تصویروں کے درمیان گم ہو گیا ہے اسے بہر حال آپ تلاش کر سکتے ہیں۔ انسان سے زیادہ اچھی کتاب آپ کو نہیں ملے گی۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

جنریشن گیپ

کسی دانا نے کیا معنی خیز بات کہی تھی کہ ہمارے بزرگ روکھی سوکھی روٹی کھاتے سادہ زندگی گزارتے مگر اپنے بچوں کی اس طرح تربیت کرتے کہ وہ مثالی انسان بن جاتے۔ تاریخ کے اوراق میں نئے باب جنم دیتے۔ تہذیب و شرافت کی ایسی داستانیں تخلیق کرتے کہ دنیا انکی مثالوں سے روشنی اور نقوش آگہی پاتی۔ ایسے نوجوان اب نہ جانے کیوں ناپید ہو گئے ہیں۔ بیسویں صدی کے اختتام پر جو ہمیں تحفے ملے ہیں ان میں Angry generation اور Gen-eration Gaps کے علاوہ آلودگی، ماحولیاتی مسائل سب شامل ہیں اور اب اکیسویں صدی کا آغاز ہونے والا ہے اس سوال سے اس حوالہ سے پروگرام ۲۰۱۰ء اسکا تحفہ ہے لیکن نئی نسل کے کردار، سیرت اور نکھار کہیں کوئی پروگرام نظر نہیں آتا۔ بجٹ کی مدیں خاموش، تخمینے کے سارے اعداد و شمار جیب ہیں۔ حالانکہ ماضی میں اخلاق و کردار کی تعمیر کیلئے خصوصی توجہ، شفقت اور خاصی رقوم مختص کی جاتی تھیں۔ ماضی کے وہ بچے بڑے مختلف تھے۔ انہیں راستے میں کوئی تنگ کرتا تو وہ اپنی سیدھ راہ نہ چھوڑتے۔ اگر کوئی گستاخی کرتا تو یہ خندہ پیشانی سے پیش آتے۔ کوئی زیادہ زچ کرتا تو یہ اس شخص کو سلام کرتے اور اپنا راستہ لیتے گزر جاتے۔ زیادہ دیر وہاں نہ رکتے۔ اور نہ کسی سے الجھتے انہیں بچوں میں اگر کسی ایک بچہ کو کسی نے کہا کہ فلاں شخص تمہیں گالیاں دے رہا تھا اس بچہ نے بتانے والے کو کہا آؤ اس شخص کے پاس چلتے ہیں اور شکایت لگانے والا اندر سے خوش ہوتا ہے کہ اب دست و گریباں ہونے کا منظر پیش ہونے والا ہے۔ دونوں خوب لڑیں گے گالی گلوچ دیں گے زبان اور ہاتھ کے جوہر سامنے آئیں گے مگر اسے حیرت ہوتی ہے کہ وہ شخص جس کے بارے کہا گیا تھا کہ فلاں نے تجھے گالیاں دی ہیں وہ اس شخص سے پوچھتا ہے تم نے جو کچھ میرے بارے میں کہا ہے اگر وہ صحیح ہے تو خدا میری مغفرت فرمائے اور اگر جھوٹ ہے تو خدا تمہاری مغفرت فرمائے اور یہ کہا اور واپس لوٹ آئے۔ زبان و بیان کے معاملے میں ہمارے بزرگ کتنے محتاط تھے اور آج ہماری زبانیں کسی قدر آزاد اور ہمارے ہاتھ کس قدر بیباک ہیں کہ دونوں کو پکڑنے والا کوئی نہیں جو شخص آپس میں لڑ پڑیں ایک ظلم کے تلے دبا ہوتا ہے اور دوسرا ظلم کر رہا ہوتا ہے ارد گرد کے لوگ خاموش تماشائی کا کردار ادا کرتے ہیں۔ ایک یہ بھی زمانہ تھا کہ جب بچہ کو گھر میں یہ

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

درس ملتا تھا

کلام چاندی سکوت سونا
مفید تر ہے خاموش رہنا

قولوا للناس حسنا۔ جب کسی سے بات کرو تو نرمی سے بات کرو۔ لہجے میں ترشی اور انداز میں تلخی کسی اچھے انسان کو زیب نہیں دیتی۔ بزرگوں سے بغاوت انکی تضحیک، تنقیص آج کیوں ہے۔ نوجوان نسل اور بزرگ نسل کی سوچوں میں فرق کیوں ہے۔ بزرگ نسل شام کو گھر جلد آنا چاہتی ہے جبکہ نوجوان شام کو گھر سے باہر جانا چاہتی ہے۔ یہ تفاوت یہ دوری کیوں بڑھ رہی ہے۔ اس ذہنی فاصلہ کا ایک سبب ٹیلی ویژن اور ڈش کا بے تحاشہ استعمال بھی ہے جس نے اقدار کو اپنی اساس سے محروم کر دیا ہے۔ جس نے سوچوں کو تیزی، عمل میں ملاوٹ، اظہار میں دیانت فکر چھین لی ہے۔

ٹیلی ویژن اور ڈش کے پروگراموں نے جس طرز معاشرت کو متعارف کرایا ہے اس میں سادگی نام کی کوئی چیز نہیں۔ ٹیلی ویژن کی فلموں میں بیش بہا قیمتی لباس، آن بان، شان، امیرانہ ٹھاٹ کے مناظر۔ آن سے چلیئے شان سے چلیئے کے اشتہارات غریبوں کے جینے نہیں دیتے۔ بچت کی سکیموں کو متاثر کرتے ہیں۔ ہر چیز خریدنے کے رجحان کو فروغ دیتے ہیں۔ نوجوان نسل ان اشتہارات کی وجہ سے ذہنی الجھاؤ کا شکار ہو گئی ہے۔ رشوت کی وبا اپنے محدود وسائل سے آگے نکلنے کا گھمنڈ نے زندگیوں کو محنت مند اقدار سے محروم کر دیا ہے۔ حرص اور حسرت کے جذبے بڑھ گئے ہیں۔ نوجوان نسل ایک ایسے فکری انتشار کا شکار ہو گئی ہے جس میں ملازمت ملتی نہیں محدود وسائل میں رہتے ہوئے، الدین انکی خواہشات پوری نہیں کر پاتے۔ نتیجتاً ذہنی فاصلے۔ دوریاں اور محرومیاں بڑھ رہی ہیں۔ اور اسی نسبت سے ناجائز ذرائع سے کمانے، دولت چھپانے، غیر اخلاقی سرگرمیوں کو بڑھانے کے راستے نکل رہے ہیں۔ مادہ پرست ذہنیت جوان ہو رہی ہے Sex and Crime کا ضمیر پرورش پا رہا ہے۔ ہمارے دانشور دوست ڈاکٹر صبور غیور صاحب اور جناب جاوید جبار صاحب الیکٹرانک میڈیا کی آزادی اور خود مختاری کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ کیا الیکٹرانک میڈیا آزاد نہیں؟ اسکے کسی پروگرام، اسکے کسی اشتہار پر کوئی پابندی نہیں۔ زہر آلود جملے، اخلاق، کردار، عقائد اور روایات کے تمسخر

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

اڑانے کی ساری حرکتیں کیا الیکٹرانک میڈیا کی بے بسی کی علامت ہیں۔ اگر آزادی نہیں تو روکنے اور ٹکنے کی ذمہ داری کس پر ہے کون ان پروگراموں کو کنٹرول کرتا ہے۔ کون ان کو چلاتا ہے اور کون ان پروگراموں کو منظور کرتا ہے۔ کبھی کسی نے سوچا کہ ہماری نئی نسل اپنے اخلاقی طور سے اپنے بزرگوں کی میراث سے کیوں محروم ہو رہی ہے۔ کبھی کوئی ٹی وی کا اس حوالہ سے آڈٹ کرتا تو یہ ذہنی فاصلے یہ Generation Gap کی الجھنیں پیدا نہ ہوتیں مگر روکنے اور ٹوکنے والے شاید مزید ذہنی فاصلے چاہتے ہیں۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

حامل رقعہ زبانی عرض کرے گا

رقعہ اور بچہ دونوں معصوم ہوتے ہیں بچے کو چوسنی مل جائے حالانکہ اس میں نہ دودھ ہوتا ہے نہ پانی مگر بچہ خاموش ہو جاتا ہے اور ماں جو بچے کے مسلسل رونے سے بیزار ہوتی ہے مطمئن ہو جاتی ہے کہ بچہ آسانی سے بہل گیا کچھ یہی حال رقعہ بردار کا ہے رقعہ جس کو مل جائے اسکا چہرہ بھی کھل اٹھتا ہے رگ وپے میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے اسے اپنی قسمت پر ناز کرنے کو جی چاہتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس رقعہ تک رسائی میں اسے کن کن رکاوٹوں کو عبور کرنا پڑا ہے۔ کبھی صاحب گھر پہ نہیں، کبھی آرام کر رہے ہیں، کبھی دوائی لیکر سوئے ہوئے ہیں۔ کبھی دفتر سے تھکے آئے ہیں۔ کبھی باتھ روم میں ہیں اور کبھی سمری تیار کر رہے ہیں آج ملاقات ممکن نہیں۔ صاحب کی مصروفیات اپنی جگہ یہاں پہلا مرحلہ دربان کی مٹھی گرم کرنے کا بھی ہے۔ کبھی دربان کی مٹھی اتنی بڑی ہو جاتی ہے کہ سائل کا دامن تنگ ہو جاتا ہے اور وہ دربان کے آگے ہاتھ پھیلاتا ہے اپنی مجبوریوں کا واسطہ دیتا ہے کہ ایک بار صاحب سے ملنے دو صرف ایک رقعہ لینا ہے میرا کام بن جائے گا۔ ایک رقعہ پر میری امیدوں کا تاج محل قائم ہے۔ بہر حال کئی کئی پاپڑ بیلنے کے بعد واقعی رقعہ ہاتھ آجاتا ہے لیکن اب رقعہ کی تاثیر کی منزل باقی ہوتی ہے اور بقول کسی شاعر کے

الٰہی ذرا آبرو ان کی رکھیو!
چلے ہیں ہتھیلی پہ سرسوں جمانے
ستائے گا کب تک رلائے گا کب تک
ارے او زمانے ارے او زمانے

مگر یہ منزل بڑی کٹھن ہے۔ ہزاروں لغزشیں حائل ہیں لب تک جام آتے ہیں۔ مگر کسی نے کہا تھا کوتاہ دستوں کو جام نہیں ملتے جام اسی کو ملتا ہے جو آگے بڑھ کر تھام لینے کی سکت رکھتا ہو۔ جام اور رقعہ ایک جیسی کشش ایک جیسی دلکشی کے حامل ہیں۔ دونوں کا حصول مشکل بھی ہے اور نشاط آفرین بھی۔ عمر بھر کی ریاضت کے بعد کہیں زندگی کے جام کی سمجھ آتی ہے اور اسی طرح رنگ لاتی ہے حنا پتھر پہ گھس جانے کے بعد۔ یعنی رقعہ بھی ملتا ہے کئی کئی

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ٹھوکریں کھانے کے بعد۔ جب کوئی چیز مشکل سے ملے تو اس کی قدر بڑھ جاتی ہے اور جب رقعہ ہاتھ میں آجائے تو پھر جی چاہتا ہے کہ اسکے حصول کی کہانی ہر کسی کو سنائی جائے اور صاحب سے تعلق جوڑنے اور ان سے ملنے کے رقعت آمیز منظر بتائے جائیں کہ انہوں نے کس کمال شفقت سے رقعہ لکھا اور کس طرح سبز روشنائی سے اپنے دستخط کیے۔ ان کی لکھائی اور ان کے دستخط اتنے تاریخی تھے کہ جی چاہتا تھا کہ انہیں محفوظ کر لیا جائے اور جن کے نام انہوں نے رقعہ لکھا تھا انہیں پہنچانے کی بجائے رقعہ البم میں سجا لیا جائے۔ رقعہ بظاہر ایک سادہ، عام فہم لفظ ہے یہ تین حروف پر مشتمل ہے مگر تاریخی اعتبار سے یہ صدیوں پر محیط ہے۔ نا جانے دنیا کا وہ پہلا خوش نصیب کون ہو گا جس نے پہلے رقعہ لکھا ہو گا اور پھر جس کے نام لکھا ہو گا وہ بھی خوش نصیب ہو گا کاش ایسے رقعے تاریخ میں محفوظ ہوتے۔ ماضی کا ایک بیش بہا علمی خزانہ آج محفوظ کیوں نہیں محکمہ کا Archine کی ذمہ داری ہے اس قیمتی ذخیرے کو ایک جگہ جمع کرے یا قائداعظم لائبریری لاہور والوں کا فرض ہے کہ وہ ایسے تمام رقعے جو ہمارے قومی رہنما عوام کی دلجوئی کیلئے لکھتے رہتے ہیں انہیں لائبریری میں ماہرانہ دیکھ بھال کے ساتھ جمع کریں۔ ان کی فہرستیں مرتب کریں انکے سیاق و سباق کے حوالے ترتیب دیں کہ یہ کس ایم۔ پی۔ اے اور کس ایم۔ این۔ اے، کس صاحب اور کس ممبر کا رقعہ ہے کس کے نام لکھا گیا ہے اور کس مطلب کیلئے لکھا گیا ہے۔

احتساب مال و دولت جمع کرنے تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ ان رقعوں کا بھی احتساب ہو کہ یہ رقعہ کس فکر کی عکاسی کرتے ہیں بعض رقعے رعب داب والے ہوتے ہیں ان کا حامل جب رقعہ لیکر کسی صاحب کے پاس جاتا ہے تو سر پر سوار ہو کر کہتا ہے کہ جناب بتائیں کہ میں رقعہ لکھنے والے کو کیا جواب دوں۔ اگر رقعہ وصول کرنے والا افسر کمزور دل کا مالک ہے یا تبادلہ سے ڈرتا ہے تو وہ کہے گا کہ جناب آپ نہیں کہیں رقعہ پر سو فیصد عمل ہو گا اور اگر رقعہ وصول کرنے والا میرٹ پر بھرتی ہوا ہے اور اپنے اندر بے خوف جذبہ رکھتا ہے اور دفتری معاملات میں پاک صاف ہے تو وہ کہے گا کہ میاں جو جی میں آئے انہیں جواب دے دیں کہ یہاں فی الحال کوئی نوکری نہیں۔ کچھ رقعے قلمی ہوتے ہیں اور کچھ رقعے پرنٹڈ ہوتے ہیں مطبوعہ رقعے عوام کے بے پناہ رش کو دیکھ کر تیار کرائے جاتے ہیں بار بار ایک عبارت کو کیسے لکھا جائے صرف وہ جگہ چھوڑ دی جاتی ہے جو نام کی ہوتی ہے باقی سارا کام مطبوعہ ہوتا ہے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

رقعے رابطے استوار کرنے اور انہیں مستحکم بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں ابلاغ کے جدید ذرائع میں رقعہ بھی ایک اہم اور مؤثر ذریعہ ابلاغ ہے ایک دوسرے سے فوراً ملنا آج کی مصروف ترین دنیا میں ممکن نہیں رہا صرف لے دے کے رقعہ رہ گیا جو مشکل لمحوں کو آسان بناتا ہے عوام اور حکام کے درمیان رابطہ کا پل ہے۔ لیکن یہ پل اب آہستہ آہستہ مرمت طلب ہوتا جارہا ہے۔ اگرچہ ہمارے بزرگ کالم نویس جناب عطاالحق قاسمی اس پل کو مضبوط کرنے کیلئے لوگوں سے درخواستیں طلب کر رہے ہیں ان کے چند روز سے ایسے کالم آرہے ہیں کہ لوگ ان سے رابطہ کرتے ہیں ان کو رقعہ لکھتے ہیں اور وہ رقعہ حکام تک پہنچانے کا اہتمام کرتے ہیں بہر حال اچھا کام ہے ایسے بزرگوں کو کرنا چاہیئے ثواب کا ثواب اور رابطہ کیلئے اس سے اور کوئی مؤثر ذریعہ نہیں۔

بعض ماہرین ابلاغ کا خیال ہے کہ رقعہ کو بھی نصاب میں شامل کیا جائے کیونکہ ذرائع ابلاغ کے جو مختلف Channels اور ماڈل عالمی سطح پر موجود ہیں وہ اس لئے مفید نہیں رہے کیونکہ ان میں رقعہ جیسے چینیل اور ماڈل کو شامل نہیں کیا گیا۔ کیونکہ رقعہ لکھنے والا اور رقعہ وصول کرنے والا اور ان کے درمیان پیغام یہ سب ابلاغ کی کڑیاں ہیں۔

ویسے بھی رقعہ کوئی زیادہ طویل نہیں ہوتا ایک چھوٹے سے کاغذ پر لکھا ہوتا ہے عموماً پیڈ استعمال ہوتا ہے تحریر کچھ اس نوعیت کی ہوتی ہے۔

محترم جناب ----------

مزاج بخیر۔

حامل رقعہ کا تعلق میرے حلقہ سے ہے اس کا کام نہایت ضروری ہے باقی حامل رقعہ زبانی عرض کرے گا۔

آپ کا نیاز مند

''حامل رقعہ زبانی عرض کرے گا'' اس جملہ کی ترتیب کیا ہے کہ لکھنے والے کا دامن وقت تنگ ہے۔ پوری بات وہ بھی سن نہیں پاتا یا جو بات کہی جارہی ہے وہ دم تحریر میں آنہیں سکتی کیونکہ اس میں نرمی سفارش ہوتی ہے اور صاف ظاہر ہے کہ سفارش کا کوئی قاعدہ نہیں

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ہوتا اور سائل اس لئے مطمئن ہو جاتا ہے کہ جس بڑے افسر کے لئے زبانی عرض کرنے کا اجازت نامہ لے کر وہ جا رہا ہے اس سے بڑھ کر کوئی اور انعام نہیں مل سکتا کیونکہ وہ خود کلام کرے گا اور صاحب سنے گا کیونکہ لکھنے والے نے لکھ دیا ہے کہ حامل رقعہ زبانی عرض کرے گا اب ہوتا کیا ہے حسرتیں دل میں رہ جاتی ہیں اور زبانی کلام کا موقعہ نہیں ملتا دفتر کے اندر رقعہ جاتا ہے اور حقارتوں اور نفرتوں کے ساتھ رقعہ لوٹ آتا ہے اور حامل رقعہ زبانی عرض کرے گا ایک سوال ایک آرزو اور ایک حسرت بن کر رہ جاتا ہے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

لاہور، ملتان، کوئٹہ روڈ

ماہرین مواصلات کی صائب رائے ہے کہ سڑکیں رابطہ کا پل ہوتی ہیں نا صرف شہروں کو ملاتی ہیں بلکہ لوگوں کو بھی قریب لاتی ہیں۔ اسی طرح ماہرین اقتصادیات کا خیال ہے روڈ، ریل، جہاز اور سمندری راستے ہماری معیشت کی اساس ہیں اور ان سب میں سڑکوں کو بڑی فضیلت حاصل ہے یہ شہر سے مصنوعات کو گاؤں تک لانے اور گھر گھر تک پہنچانے میں بڑی مدد دیتی ہیں دیہات سے روزانہ ٹنوں کے حساب سے دودھ آتا ہے سبزیاں اور پھل آتے ہیں اور اسی طرح شہر سے مصنوعات کا تبادلہ ہوتا ہے۔ اگر اچھی سڑکیں ہوں تو اشیاء ٹھیک ٹھاک حالت میں گھر پہنچ جاتی ہیں ورنہ ان کے سپیئر پارٹس تو ضائع نہیں ہوتے۔ گھر تک جگ نہ پہنچے تو اس کے شیشے کے ٹکڑے تو بہر حال پہنچ جاتے ہیں ہمارے ایک دوست کو اکثر اپنی سڑک سے گلا رہتا ہے کہ وہ اتنی خستہ حال ہے کہ وہ دکان سے دہی لے کر آتے ہیں تو وہ گھر تک لسی بن چکی ہوتی ہے۔ میرے دوست کو شاید اس بات کا خیال نہیں کہ ریڈی میڈ لسی انکے لئے کتنی بڑی نعمت ہے۔ اس سے وقت بھی بچتا ہے اور لسی بنانے کی مشین کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔ بات سڑکوں کی ہو رہی تھی۔ سڑکیں کئی قسم کی ہوتی ہیں بعض سڑکیں تاریخی ہوتی ہیں ان پر کبھی تاریخ نے سفر کیا ہوتا ہے یعنی کوئی بادشاہ، کوئی وزیر، کوئی شہزادہ یہاں سے گزرا ہوتا ہے اسی مناسبت سے وہ کبھی تغلق روڈ کہلاتی ہے اور کبھی التمش روڈ، کبھی ابدالی روڈ اور کبھی شیر شاہ سوری روڈ، بعض سڑکیں بین الاقوامی درجہ اختیار کر لیتی ہیں جیسے شاہراہ ریشم جو پاک چین دوستی کی لازوال مثال ہے۔ واہگہ بارڈر گنڈا سنگھ سرحدی رابطے مضبوط کرتی ہیں۔ بعض سڑکیں اپنے ناموں کے بوجھ تلے دبی ہوتی ہیں۔ جیسے فیروز پور روڈ کو مولانا جلال الدین رومی روڈ بنا دیا گیا ہے جیسے شاہراہ شیخ عبدالحمید بن بادیس روڈ لاہور میں ایک نیا اضافہ ہیں۔ انہیں سڑکوں میں ایک تاریخی، طویل سڑک لاہور، ملتان، کوئٹہ روڈ ہے جو ایک طرف کوئٹہ سے پشاور تک جاتی ہے اور دوسری طرف کراچی سے دہلی تک۔ یہ روڈ پاکستان میں سرحد، پنجاب، سندھ، بلوچستان کا دل کہلاتی ہے اور بین الاقوامی سطح پر باب ہندوستان (Gate of India) کا درجہ رکھتی ہے۔ اسکی تاریخی اہمیت، افادیت اپنی جگہ مگر یہ سڑک آجکل زبوں حالی کا شکار ہے۔ کہیں اسے رود کوہیوں نے کاٹا ہے اور کہیں مہلک

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

گڑھے ان کی جان کے دشمن ہیں۔ مگر آفرین ہے اس سڑک پر جو تحریک آزادی کے گمنام خاموش کارکن کی طرح نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پرواہ کا جذبہ لئے ہر عام و خاص کی خدمت گذشتہ کئی صدیوں سے کر رہی ہے۔ نہ اسے آج تک کوئی اعزاز ملا ہے اور نہ ہی کسی نے اسکا اعتراف کیا ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ یہ گمنامی کی چادر اوڑھے صبر و شکر کا دامن سمیٹے بڑی سے بڑی ٹریفک کا بوجھ اٹھائے زندگی گزار رہی ہے۔ جب ملتان کی آبادی بمشکل نو دس لاکھ تھی تو یہی سڑک تھی اور اب بیس لاکھ ہے تو یہی سڑک کلیدی کردار ادا کر رہی ہے۔ اس کیلئے نہ تو متبادل راستے بنے ہیں اور نہ ہی اس کی ٹریفک کا بوجھ کم ہوا ہے بلکہ ایک درد مسلسل کی طرح بڑھ رہا ہے۔ یہ غریب الدیار، مجبور و بے بس سڑک جسے میڈیا کی بھی کوئی کوریج حاصل نہیں اس کی ٹی وی والوں نے کبھی دستاویزی فلم بھی نہیں بنائی کہ کہیں یہ قومی سرمایہ نہ بن جائے یہ کھاد فیکٹری سے لے کر عسکری جھیل تک ملتان کی آبادی کا سارا بوجھ اٹھاتی ہے۔ سارے کالجوں، سکولوں کی گاڑیاں اسی سڑک سے ہو کر جاتی ہیں کچہری، ہائیکورٹ، چھاؤنی، سبزی منڈی، لکڑ منڈی، گراس منڈی، دفاتر، ذرائع ابلاغ کے ادارے ریڈیو، ہوائی اڈا، بینک، ہوٹل، کاروباری مراکز سبھی اسی روڈ پر ہیں اور سب کا راستہ یہی ہے۔ رکشا سے لیکر ویگن بس اور صبح سویرے ٹرک بڑی آن سے گزرتے ہیں۔ اسی کا بائی پاس ایک عرصہ سے زیر تعمیر ہے اگر بن بھی گیا تو اس کے لئے کیا سہارا بنے گا۔ پھر بھی ٹریفک کا یہی حال ہو گا اور اس بے چاری کو یہ ساری پتا اکیلے کاٹنی ہو گی۔ دنیا بھر میں کتنی سماجی تنظیمیں ہیں۔ کس قدر دکھ درد بانٹتی ہیں مگر ایل ایم کیو کیلئے کوئی بھی تنظیم نرم گوشہ نہیں رکھتی۔ اس پر بڑھتے ہوئے مظالم پر آواز نہیں اٹھاتی اسکی خستہ حالی پر کوئی کارکن بھوک ہڑتال نہیں کرتا۔ کوئی اس کے گڑھوں پر ماتم کناں نہیں حبیب جالب نے کیا خوب کہا تھا

چھوڑ دے اتنا سلگنا اے میرے دل چھوڑ دے
کچھ نہ کچھ ہو گا جہاں والے کو بھی فکر جہاں

لاہور کی مال روڈ پر ایک درخت کٹا تھا پورے شہر کے ادیب، شاعر حساس افراد سڑک پر آ گئے تھے یہ درخت نہیں ہمارا دل کٹا ہے آج گیس، پانی سیوریج والے جہاں چاہتے ہیں ایل ایم کیو کو کاٹ کے رکھ دیتے ہیں مگر کسی حساس دل پر چوٹ نہیں پڑتی۔ جیسے انسان ستر

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

(چادر) سے محروم ہوتا جارہا ہے ایل ایم کیو شجر سے محروم ہوتی جارہی ہے۔ درخت، سبزہ، پھل، پھول سڑک کا مقدر نہیں۔ اگر کہیں کوئی درخت اگ بھی جائے تو محکمہ تجاوزات والے اسے اٹھا کر لے جاتے ہیں کہ تجاوزات میں اضافہ تھا اور یہ جو آلودگی بڑھ رہی ہے اس کا مداوا کون کرے گا۔

ملتان کے شہریوں کو اس بات پر ناز ہے کہ وہ تاریخ سے دلچسپی رکھتے ہیں انہیں ثقافت سے فنون لطیفہ سے لگاؤ ہے مواصلاتی رابطوں کی قدر کرتے ہیں آج مواصلاتی رابطہ ایل ایم کیو کی عدالت میں پیش ہے کہ میرا بوجھ ہلکا کرو۔ میں بوجھ اٹھا اٹھا کر تھک گئی ہوں۔ میرے راستے ہموار کرو میں آپ کو یقین دلاتی ہوں اگر میرے گڑھے پُر ہو جائیں تو میں آپ کو اربوں روپے کا پٹرول بچا کر دوں گی آپ کی گاڑیوں کی عمر طویل ہو جائے گی۔ آپ کی مصنوعات درست حالت میں منزل مقصود پر پہنچیں گی آپ کا قیمتی زرمبادلہ بچے گا اور ملتان ترقی کرے گا۔ کیا میر فریاد سنیں گے یا خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک لیکن ایک دردمند چہرہ ایل ایم کیو کی فریاد سے متاثر ہو کر امداد کے لئے باہر نکلا ہے۔ حاضر ہوں مدد کے لئے اے ایل ایم کیو میں تیری آواز بڑے بڑے ایوانوں تک پہنچاؤں گا اگرچہ میں مملکت کا چوتھا ستون ہوں لوگ مجھے اخبار کہتے ہیں لیکن تیرے لئے پہلا ستون بنوں گا۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ابھی دنیا میں اچھے انسان باقی ہیں

اکثر محفلوں میں یہ ذکر سننے کو ملتا ہے کہ ہم دنیاداری میں ایسے الجھ گئے ہیں کہ موت بھول گئے ہیں اس طرح کے کام کرتے ہیں کہ گویا کبھی ہم نے اس دنیا سے جانا ہی نہیں۔ ہمارے طویل المقاصد منصوبے ہیں۔ ایک دوسرے سے الجھنے کے اور چھوٹی چھوٹی بات کو آگے بڑھانے کے ایسے نسخے موجود ہیں کہ کوئی ہمیں مات نہیں دیتا۔ ہم ہر میدان میں جیت جاتے ہیں ایسی دلیلیں اکٹھی کرتے ہیں کہ مخالف زچ ہو جاتا ہے ایسے ایسے شواہد سامنے لاتے ہیں کہ مخالف کو بچ نکلنے کا راستہ ہی نہیں ملتا اس زور شور سے اپنی آواز اونچی کرتے ہیں کہ بازار کا سارا مجمع ہمارے گرد ہوتا ہے کہ ہم ہی سچے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ ہم ایسا کیوں کرتے ہیں ہمارا تو اس تہذیب سے تعلق ہے جس میں پتھر برسانے اور کانٹے بچھانے والوں کو دعائیں دی جاتی تھیں۔ قاتل کو شربت پلایا جاتا تھا طاقتور ہونے کے باوجود شعور کی حد تک موت کو قبول کرنے کا راستہ چنا جاتا تھا۔ ظلم کے اندھیرے اور گھٹاٹوپ جہالت میں انسانیت کی شمع روشن کی جاتی تھی۔ یگانگت اور محبت کے پھول چنے جاتے تھے۔ جب ہم ایک دوسرے کے دشمن تھے ہمارے دلوں میں الفت ڈالی گئی جب ہم آگ کے گڑھے کے کنارے پہنچ چکے تھے ہمیں خدائے بزرگ وبرتر نے اپنی کمال مہربانی سے اس آگ سے بچالیا لیکن آج ہم نے پھر اپنے گرد آگ کے آلاؤ روشن کرنے کیلئے نفرت کی سوکھی لکڑیاں اکٹھی کرلی ہیں اور اس محبت کو جو ہمیں محسن انسانیت نے منشور اعظم کی صورت میں ایک گراں قدر تحفہ دیا تھا ہم نے اسے نفرت میں بدلنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ہمیں تو خیر وفلاح کا امین بنایا گیا تھا اور ہم انتشار کے سرمائے کے مالک بن بیٹھے اور اس موت کو بھول گئے جو ایک حقیقت ہے جس کا سلسلہ روز اول سے لیکر کائنات کے اختتام تک جاری رہے گا۔ ایک مفسر نے اس کی کیا عمدہ تعریف کی ہے موت کی تعریف کرنا بے سود ہے اور نادانی۔ موت وہی ہے جسے سب جانتے ہیں اور یہ نام ہے روح کی بدن سے مفارقت کا۔

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے ان ہی اجزاء کا پریشان ہونا

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

لیکن ہم موت کو بھولے نہیں زندگی کے ہر کام ہر موت سے وابستگی کے جذبے ہمارے اندر موجود ہیں کبھی آپ نے دیکھا ہے کہ کوئی جنازہ سر پر جارہا ہو لوگ کس قدر اس کا احترام کرتے ہیں سائیکل سوار سائیکل سے اتر جاتا ہے کار والا کار کو ایک سائیڈ پر روک لیتا ہے ٹریفک کا سپاہی جنازہ گزرنے کیلئے راستہ بناتا ہے دروازے اور کھڑکیوں سے جنازے کا رقت آمیز منظر دیکھتی ہیں اور ان لمحوں کو ہر شخص جس جس انداز سے دیکھتا ہے سوچتا ہے تو ایسے محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا معاشرہ ابھی خوف خدا سے عاری نہیں ہمارے معاشرے میں ابھی ایسے جذبے ایسے انسان موجود ہیں جن کے دل انسان دوستی کے جذبے سے دھڑکتے ہیں آج معاشرہ کا کتنا سنگدل، بے رحم انسان کیوں نہ ہو جب کوئی مظلوم اس کے سامنے برملا یہ کہتا ہے کہ دیکھو تم میرا آج حق سلب کر رہے ہو۔ لیکن کب تک ؟ایک دن جب روز محشر ہوگا اور میزان اور پل صراط کی دنیا ہوگی۔ تم میرا حق کیسے دباؤ گے۔ میرا ہاتھ ہوگا اور تمہارا دامن۔ تو ایک لمحے کیلئے سننے والے پر ہیبت ضرور طاری ہو جاتی ہے اور وہ سوچنے لگتا ہے کہ کہیں اس کی آہ اس مال کو جلا کر ہی نہ رکھ دے۔

آیئے مل کر ایسے انسان تلاش کریں جو مادیت کی اس آندھی میں چراغ ہیں۔ جو نفرتوں اور انتشار کی اس فضاء میں ملی یکجہتی کو فروغ دیتے ہیں۔ جو زخموں پر مرہم رکھنے کا ہنر جانتے ہیں۔ مظلوم کے سر پر دست شفقت رکھتے ہیں اور ظالم کے سامنے ڈٹ جاتے ہیں جلتی آگ میں کود کر جلتے بچوں کو باہر نکالتے ہیں۔

دہشت گردی کی سفاکی میں بے گور و کفن لاشوں کو تجہیز و تکفین کی چادر سے ڈھانپتے ہیں اپنے معمولی اثاثوں سے کسی غریب، کسی بیوہ، کسی یتیم، کسی بے کس کی مدد کرتے ہیں۔ کبھی دوا کی صورت میں کبھی دعا کی صورت میں کبھی خیرات کی شکل میں کبھی خیر کی شکل میں کبھی فلاح کی شکل میں اس طرح ایک دوسرے کا ہاتھ تھامتے ہیں کہ گمان ہی نہیں ہوتا کہ یہ نیکی کی طرف بڑھنے والا ہاتھ کسی غیر کا ہے اپنے بھائی اپنے عزیز کا گمان ہوتا ہے۔ محلے اور گلی میں۔ شہر اور قریہ میں اور ملک کے اندر ایسے درد مند موجود ہیں اور یہ کہنا درست نہیں کہ ہم موت کو بھول گئے ہیں ابھی دنیا میں اچھے انسان باقی ہیں۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ڈاکٹر صبور غیور

انسانی معاشرہ کی تشکیل افراد سے ہوتی ہے یعنی وہ افراد جو ایک دوسرے کے شانوں سے شانے ملا کر اس طرح کھڑے ہوتے ہیں کہ فرد کا فرد سے فاصلہ مٹ جاتا ہے اور بعض اوقات پانچوں انگلیاں برابر ہو جاتی ہیں تاکہ فرد کو ثانوی ہونے کے کرب سے بچایا جائے۔ تنہائی اور بے بسی کے احساس سے نکالا جا سکے ذہنی انجماد سے نکال کر تحریک اور قوت کی شکل دی جائے۔ ڈاکٹر صبور غیور ایک فرد کا نام نہیں بلکہ ایک ایسی تحریک کا نام ہے جو ذہنوں میں سوچ اور عمل میں جوش کو جنم دیتی ہے جو کسی بھی معاشرہ میں اور کسی بھی ملک میں غربت، افلاس، معاشی اور معاشرتی محرومی کا ازالہ کرتی ہے۔ ناموافق حالات سے دلبرداشتہ ہو کر اپنی قسمت کو آہ سرد، رنگ زرد اور چشم تر کرنے کی بجائے خود آگہی، خود انحصاری اور خود احتسابی سے روشناس کیا جاتا ہے اور اپنی قسمت کے فیصلے اپنے قلم سے خود اعتمادی کے ساتھ کئے جاتے ہیں۔ وسائل کی محرومی کسی فرد کا راستہ نہیں روکتی، غریب ہونا عیب نہیں۔ غریب بن کر زندگی گزارنا عیب ہے۔ ڈاکٹر صبور غیور ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جو اپنی کتابوں سے فکر معاش کی گتھیاں سلجھاتا ہے اور نئی فکر، منفرد سوچ اور مؤثر انداز نظر سے آگاہ کرتا ہے۔ یہ ایسا شخص ہے جو پاکستان میں عبدالستار ایدھی ہے بنگلہ دیش میں محمد یونس خاں ہے۔ جناب عبدالستار ایدھی میں خدمت میں عظمت کا راز دریافت کیا اور محمد یونس خاں نے گرامین بینک کے قیام سے بنگلہ دیش کی غربت کے خاتمہ اور خوشحالی کے آغاز کا نسخہ تلاش کیا ہے ڈاکٹر صبور غیور معیشت کو استحکام لیبر کو باوقار کردار اور مقام دینے کا آرزومند ہے اسے چائلڈ لیبر اچھی نہیں لگتی۔ لیکن وہ صرف تنقید اور برائے تنقید کا حامی نہیں وہ ایف ای ایس کے فورم سے اور پاکستان کی ۲۴ جامعات کی سطح پر فکر و نظر کے دیپ روشن کر رہا ہے تاکہ بے روزگاری کا عفریت کسی منصوبہ میں بند ہو سکے۔ غربت کی چکی مسائل کو پیسنے کی بجائے وسائل کو بڑھانے میں مدد دے ڈاکٹر صبور غیور بیداری خرات کا قائل ہے۔

واقف ہوا گر لذت بیداری شب سے
اونچی ہے ثریا سے بھی یہ خاک پراسرار

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

جب انسان اپنی صلاحیتوں کو پہچان لیتا ہے اور اپنی قوت پر بھروسہ کرنا سیکھ لیتا ہے اور اپنی کوتاہیوں اور اندیشہ ہائے دوردراز کے امور سے آگاہ ہو جاتا ہے پھر کامرانیاں اس کے قدم چومتی ہیں کچھ یہی حال افراد کی طرح اقوام کا ہے جب تک ایک قوم خود اپنے وسائل سے اپنے مسائل حل کرنے کی صلاحیت نہیں پیدا کر لیتی وہ صحیح معنوں میں آزاد خود مختار قوم کہلانے کا حق نہیں رکھتی۔ ڈاکٹر صبور غیور نے قوم کو جگانے اور بین الاقوامی سطح پر انسان کے دکھ کو سمجھنے کیلئے چودہ کتابیں لکھی ہیں جن میں بے روزگاری، پاکستان کے معاشی اور معاشرتی مسائل اور انکا عقلی سطح پر حل بھی تلاش کیا ہے۔ بطور فری لانسر صحافت کے میدان میں ڈاکٹر صبور غیور نے اس قدر مضامین سپرد قلم کئے ہیں کہ ان کے موضوعات کی ندرت اور پختگی قوم کو جھنجھوڑنے اور سیدھی راہ پر لے جانے کی ان میں پوری صلاحیت موجود ہے۔ ان کی متعدد کتابیں معاشیات اور ابلاغیات سے تعلق رکھتی ہیں انہیں کتابوں میں ایک کتاب De-velopment Governance and Governability شامل ہے جس میں ڈاکٹر صبور غیور نے لکھا ہے کہ ہمارے گذشتہ حکومتوں کی سطح کی تاریخ کچھ کامرانیوں سے عبارت ہے اور کچھ ناکامیوں سے۔ کامرانیوں میں یہ ہے کہ پاکستان نے کئی میدانوں میں شاندار ترقی کی ہے ایجادات اور اختراعات سے وطن عزیز کو اقوام عالم میں وقار اور مرتبہ دلایا ہے ناکامیوں میں غریب کا غریب تر ہونا، غربت وافلاس میں مسلسل اضافہ، ناخواندگی کی مسلسل بڑھتی ہوئی شرح اور سکولوں سے معصوم طالبعلموں کا اخراج اور تعلیم سے عدم دلچسپی، ناقص تدریس تعلیم اور تربیت کا فقدان، بڑھتی ہوئی آبادی کے علاج معالجہ کی محدود سہولتیں، صاف ستھرے پانی کا فقدان، سیوریج کی سکیموں کی عدم فراہمی اور ان کا غیر مؤثر ہونا شامل ہیں۔ ڈاکٹر صبور غیور کا نقطہ نظر ہے اقتصادی کی ترقی کی کوشش اس وقت تک خاطر خواہ نتائج پیدا نہیں کر سکتی جب تک آبادی میں تیز رفتار اضافہ کے رجحان کی روک تھام نہ کی جائے ہماری ترقی کے تمام دعوے بیکار ہیں اگر ہم ان کے فوائد عام آدمی تک نہیں پہنچاتے۔ ہمارا عام آدمی آج بھی صاف پانی پینے کیلئے در در کی ٹھوکریں کھاتا ہے علاج معالجے کے لئے پہاڑی علاقوں اور پر خطر راہوں سے کس دشواری اور مجبوری سے ہسپتالوں میں آتا ہے اور وہاں بھی اسے علاج نہیں بلکہ ایک ایسا معاشرتی روگ ملتا ہے جو اس کی سوچ کو امیر اور غریب کے پیمانوں میں ڈال دیتا ہے۔ ڈاکٹر صبور غیور کے خیال میں تمام مسائل حل نہیں ہو سکتے اگر

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ہم محض اعداد و شمار کے کھیل میں الجھے رہے اور عام آدمی کے معیار زندگی میں وہ تبدیلی نہیں لا سکتے جو حقیقی اور معاشرتی ترقی کا واحد معتبر پیمانہ ہے۔

ڈاکٹر صبور غیور اکیسویں صدی میں داخل ہونے کیلئے شرط طے کرتے ہیں کہ اکیسویں صدی میں داخل ہونے کی بنیادی شرط یہ ہے کہ ہم پاکستان میں بیسویں صدی کی کوتاہیوں اور محرومیوں سے دامن جھٹک کر تعلیم یافتہ، صحت منداور متحد مسلم قوم کی حیثیت سے اکیسویں صدی میں داخل ہوں۔ ڈاکٹر صبور غیور نے اقوام عالم کی تاریخ، کلچر کو اپنے مطالعہ اور دورے سے سمجھا ہے وہ بنگلہ دیش، بلجیئم، جرمنی، بھارت، عراق، ایران، اردن، کویت، مالدیپ، نیپال، نیدرلینڈ، سعودی عربیہ، سری لنکا، سنگاپور، ترکی اور تھائی لینڈ کے ممالک کا دورہ کر چکے ہیں اور پانے مشاہدات اور گہرے مطالعہ کے اثرات قائم کر چکے ہیں۔ پاکستان ایک خوش نصیب خطہ ارض ہے جسے ایسا فرزند ملا ہے جو اپنے عہد کے مسائل کو آنے والے واقعات و حالات میں پرکھتا ہے۔ تحقیق کے پیمانوں سے ناپتا ہے اور پھر انہیں اپنے نوک قلم سے اوراق پر بکھیرتا ہے۔ ایسا مصنف، ایسا دانشور اگر کسی ملک کو میسر ہو تو اسے ایسے فرزند پر اور دیدہ ور پر ناز کرنا چاہیئے۔

ڈاکٹر صبور غیور کا شمار ہمارے ملک کے ان لوگوں میں ہوتا ہے جو فکر رسا بھی رکھتے ہیں اور جوش عمل سے بھی آشنا ہیں۔ مضبوط قوت ارادی سے فرد سے لیکر معاشرہ اور معاشرہ سے لیکر ریاست کے مسائل اور وسائل میں توازن پیدا کرتے ہیں۔ ثابت قدمی ان کی پہچان ہے اور حب الوطنی اسکی روحانی اور فکری سوچ کا ثمرہ ہے۔ علامہ اقبال نے شاید انہیں افراد سے متاثر ہو کر کہا تھا۔

حاصل کسی کامل سے یہ پوشیدہ ہنر کر
کہتے ہیں کہ شیشے کو بنا سکتے ہیں خارا

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ہر کلہ راشہ۔ پہ خیر راغلے

ہر شہر کی ایک پہچان ہوتی ہے۔ ہر خطے کی ایک شناخت ہوتی ہے۔ ایک مخصوص مزاج ہوتا ہے۔ اگر اس شہر سے اس مزاج کو اس پہچان کو اور اس شناخت کو الگ کر دیا جائے تو شہر صرف سنگ و خشت کا نام رہ جاتا ہے۔ باقی اسکے دامن میں کچھ نہیں بچتا۔ جیسے فصیل آباد شہر کی پہچان اسکا ''گھنٹہ گھر'' ہے کہ شہر کے سارے راستے شہر کی ساری سڑکیں گھنٹہ گھر پہنچ کر آرام کرتی ہیں۔ لاہور کی پہچان ایف سی کالج والی نہر ہے، شہر کے وسط میں ہونے کی وجہ سے لاہور کا دل بن گئی ہے۔ گرمیوں میں یہ نہر لاہور کی ثقافت کا مرکز بن جاتی ہے۔ ہر امیر غریب اس نہر پر جمع ہوتے ہیں۔ عمر کی کوئی قید نہیں، پانچ سال کے بچے سے لیکر نوے سال کے بزرگ سبھی اکٹھے ہوتے ہیں تربوز ضافت کی ''ون ڈش'' ہوتا ہے۔ تربوز کھانے اور چھلکے پھینکنے سے جو لطف پیدا ہوتا ہے اسکا بیان ممکن نہیں ویسے بھی اس بی آر بی نہر کے پانی میں دو خصوصیات نمایاں ہیں۔ ایک تو یہ بہت ٹھنڈا ہوتا ہے دوسرا اس پانی سے کپڑے دھوئے جائیں تو پوڈر سے کہیں زیادہ صاف دھلتے ہیں۔ اسی طرح شہروں میں ملتان شہر کا نام آتا ہے۔ یہ شہر اللہ والوں کا مسکن ہے۔ آم، کپاس، سوہن حلوے کا شہر ہے اس شہر کے درمیان قلعہ کہنہ جو ابن قاسم باغ کہلاتا ہے ملتان کی پہچان ہے، دانشوروں، بادشاہوں کا شہر ہے اہل ملتان جب کسی سے محبت کرتے ہیں تو یہ محبت عجیب انداز کی ہوتی ہے سر پر آموں کا ٹوکرہ رکھ دیتے ہیں اور کہتے ہیں جل۔ جاؤ

منکہ بر سر نہ نہادہ بودم گل
تو برہ بر سرم نہادو گفتا جل

امیر خسرو نے اپنی فارسی شاعری میں سرائیکی لفظ جل کو استعمال کیا۔ بات شہروں کی پہچان کی ہو رہی تھی۔ انہیں شہروں میں ایک شہر پشاور ہے اور پشاور شہر کا دل قصہ خوانی بازار ہے۔ یہ بازار کیا ہے، قہوہ خانوں، گرم میوہ جات اور پشاور کی مصنوعات کا مرکز ہے۔ کبھی اس بازار میں پشتو لوگ ادب کے گیت، قصے اور کہانیاں سنائی جاتی تھیں خوشحال خاں خٹک اور رحمان بابا کے اشعار سنائے جاتے تھے۔ یہ محبتوں اور ثقافتوں کا بازار ہے اس بازار کے ایک نکڑ پر دکان کے پھٹے پر بیٹھے ہوئے ایک بزرگ سے میں نے پوچھا۔ خان بابا! ہم پنجاب سے آئے

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ہیں، میرے ساتھ طالب علم ہیں۔ ہمیں کوئی سستا اور اچھا ہوٹل بتائیں۔ بزرگ کے چہرے پر رجائیت کی ایک ایسی لہر پیدا ہوئی جیسے کسی گھر کا بچہ ایک عرصہ کے بعد گھر لوٹا ہو۔ بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا ہر کلہ راشہ خوش آئے ہو۔ پہ خیر راغلے۔ خیریت سے ہو۔ اور پھر دعائیہ لہجے میں بولے "پہ خیر اوسے" تم خوش رہو۔ اور اسی لمحے انہوں نے ایک بچہ کو آواز دیکر کہا مہمانوں کیلئے چائے لاؤ۔ ہم نے شکریہ ادا کیا اور ان کے بتائے ہوئے ہوٹل میں پہنچ گئے۔ ہوٹل واقعی سستا تھا یعنی ایک سو روپے ایک رات کا کرایہ اور اسکی عمارت بہت اونچی تھی۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ پورے شہر کا مضافاتی پہلو ہمارے سامنے تھا۔ خوبصورت گھروں، دفتروں اور عمارتوں کا شہر پشاور ہمارے سامنے تھا۔ کئی زبانوں کا شہر، ہندکو (سرائیکی لہجہ والی زبان) پشتو، فارسی، اردو، محبت اور خلوص کا اظہار کرنے اور سمجھانے والی زبانیں البتہ ہوٹل کے مالک سے جو گفتگو ہوئی اس نے کچھ دیر پریشان کیا۔ ہوٹل کا مالک مطالعاتی دوروں پر آئے ہوئے طلباء کے رویہ سے شاکی تھا۔ موسم گرما میں ہر خطے سے طالب علموں کے قافلے آتے ہیں ہم انہیں بڑی محبت اور خلوص سے اور بہت ہی کم کرایہ پر ٹھہراتے ہیں لیکن یہ طالب علم ہوٹل میں کم ٹھہرتے ہیں، تاریخ زیادہ مرتب کرتے ہیں۔ ہر در و دیوار پر اپنی تخلیقات بال پوائنٹ اور مارکر سے اس طرح رقم کرتے ہیں جیسے وہ کسی سرائے میں بیٹھے اپنے سفرنامے تحریر کر رہے ہوں۔ اس سے ہماری دیواریں خراب ہو جاتی ہیں اور یہ تخلیقات بھی کچھ زیادہ معیاری نہیں ہوتیں کہ ہم انہیں محفوظ کر لیں بلکہ جب دوسرے مہمان یہاں آکر ٹھہرتے ہیں تو اس مجموعہ اشعار کی قلمی کاوشوں پر سخت ناراضگی کا اظہار کرتے ہیں۔ خدا کیلئے ان طالب علموں کو منع کریں۔ آپ تو استاد ہیں۔ ان کو اپنی زبان میں سمجھا سکتے ہیں ہم انہیں کیسے سمجھائیں۔ ہم تو محبت کے شہر کے باسی ہیں۔ قدامتوں کے امین ہیں۔ مہمان آجائے تو اس سے بڑھ کر ہمارے لئے خوشی نہیں ہوتی۔ جان و دل نچھاور کرتے ہیں لیکن مہمان ہمیں یہ تحفے تو نہ دیں۔

یارانہ کلہ پیوا خلی
چہ یو سود خوردی بل غمخور دیاری وینہ

ایسی دوستی کیونکر نبھ سکتی ہے جبکہ ایک خود غرض ہو اور دوسرے کو دوستی کا غم کھائے جا رہا ہو۔

ہوٹل کے مالک کا ایک ایک لفظ ہمارے دل پر رقم ہو رہا تھا اور ایسے محسوس ہو رہا تھا

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

جیسے ہم نے اسے بہت ستایا ہے۔ ہم نے وعدہ کیا کہ ہمارے ساتھ آئے ہوئے طالب علم اگرچہ مستقبل کے صحافی ہیں اور انہوں نے مملکت کے چوتھے ستون کو مضبوط کرنا ہے لیکن یہ تحریریں دیواروں پر نہیں لکھیں گے اور وہ بھی ہوٹل کی دیواریں۔ مسافروں کی اقامت گاہیں ایسے راہ گزر پر ایسے پڑاؤ اور ٹھہراؤ پر کیا تحریر لکھیں گے۔ ان کے امکانات، ان کے جہان معنی کہیں اور ہیں۔ یہ مملکت کے ستون ہیں اور انہیں مملکت کے ایوان میں ہونا چاہیئے خواہ وہ پریس گیلری ہو یا سفارت خانہ۔ عطاء الحق قاسمی کا نام انہیں تحریروں کی تاثر کا ثمرہ ہے۔ وادی اباسین کے مہمان نوازو۔ اے دریائے کنہار کے باسیو۔ کاغان، ناران اور جھیل سیف الملوک کے شہزادو، ہم آپ کو گلہ کا موقعہ نہیں دیں گے آپ یقین رکھیں ہمارے طالب علموں کے دورے مطالعاتی، مشاہداتی دورے ہوتے ہیں۔ یہ ان کوہساروں، پہاڑوں، ندی، نالوں اور مرغزاروں سے پیار کرنے اور ان میں بسنے والوں کو دوستی اور محبت کے تحفے دینے آتے ہیں۔

شاید تمہیں اس کا اندازہ نہ ہو جب یہ قافلے ملک کے کونے کونے سے روانہ ہوتے ہیں اور انکی منزلیں کبھی وادی سوات، گلگت، ہنزہ، سکردو، چترال ہوتی ہیں اور کبھی ہزارہ اور اباسین ڈویژن کے مقامات، ایبٹ آباد، مانسہرہ، ناران، کاغان اور جھیل سیف الملوک ہوتی ہے۔ کبھی یہ قافلے اساس پاکستان کی تلاش میں بالاکوٹ پہنچے ہیں شہید جرنیل کے مزار پر سلام پیش کرتے ہیں کبھی دریائے کنہار کو اور کبھی وادی نیلم کو دفاع وطن کا مرکز بناتے ہیں۔ کبھی آزاد کشمیر کے اٹھمقام تک پہنچتے ہیں اور کبھی جھیل سیف الملوک سے آگے بابو ٹاپ کے پُر خطر راستوں کو تلاش کرتے ہیں اور کبھی ان راہوں کو حیرت سے دیکھتے ہیں جن راہوں پر ایک عام آدمی کا چلنا مشکل دکھائی دیتا ہے۔ مگر یہاں کے باشندے چند بھیڑ بکریوں کو لئے رواں دواں نظر آتے ہیں یہ مطالعاتی دورے بتاتے ہیں کہ رزق کی تلاش کتنی مشکل منزل ہے۔ یہ قافلے جب بابو ٹاپ کی طرف جاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں حالانکہ راستے میں چیتے، شیر، سانپ گھات میں ہوتے ہیں مگر ان تمام خطروں سے ماوراء یہ قافلے چلتے رہتے ہیں اور اسی سفر میں زندگی کی شام ہو جاتی ہے مگر عزم کا سفر جاری رہتا ہے۔ یہ شمال مغربی سرحدی علاقے، یہ پُر فضاء خطے، غیور انسانوں کی سرزمین ہے۔ فکر و دانش کے علاقے ہیں۔ یہاں سرود کہسار سے متاثر ہو کر کئی ادیبوں، دانشوروں نے بہت کچھ تحریر کیا ہے مگر ان کی

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

تحریروں کا مزاج مختلف ہے۔انکی تحریریں انکے مکانوں کی اینٹوں پر جذبہ حریت سے رقم ہیں اور اس عزم کی علامت ہیں کہ یہاں کے باشندوں نے انگریزوں کی ثقافتی یلغار کو روکا ہے۔ روس کی توسیع پسندی کو مسمار کیا ہے۔اس خطے کے لوگ اس تحریر سے ناآشنا ہیں جسکا گلہ ہوٹل کے مالک نے کیا تحریریں یہاں بھی بہت ہیں ہر پہاڑ، ہر کہسار، ہر مرغزار، ہر شجر اور ہر پتہ پر ایک تحریر موجود ہے اور وہ تحریر ہے آنے والے مہمان کے استقبال کے لئے۔

ہر کلہ راشہ۔پہ خیر راغلے

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

”یہ پیشکش ملتان کیلئے نہیں ہے“

لاہور کی ایک مشروب تیار کرنے والی کمپنی کی طرف سے ایک اشتہار جو کئی اخبارات میں شائع ہوا ہے جس میں لکھا گیا ہے کہ رمضان المبارک کی آمد کی وجہ سے خاص رعایت کی گئی ہے یعنی جو بوتل پہلے ۲۱ روپے کی تھی اب ۱۵ روپے کی کر دی گئی ہے اس طرح گاہکوں کا ۶ روپے کی بچت کی خوشخبری سنائی گئی ہے اس اشتہار کے نیچے یہ جملہ معنی خیز ہے

”یہ پیشکش ملتان کیلئے نہیں ہے“

ملتان کو اس پیشکش سے محروم کرنے کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں کمپنی کا علاقہ بھی ہو سکتا ہے لیکن اسے دوسرے طریقے سے بھی لکھا جا سکتا ہے لیکن اشتہار سے جو عام تاثر پیدا ہوتا ہے وہ ملتان سے بے گانگی کا ہے یقیناً اس کمپنی کا یہ منشا ہرگز نہیں ہو گا کہ ملتان جیسے حساس خطہ کے عوام کی دل آزاری کرے لیکن جس اشتہاری کمپنی کو انہوں نے اشتہار شائع کرنے کی ہدایت کی ہے یہ اسکی عملی جہالت ہے کہ اس نے اچھے بھلے اشتہار کو امتیاز کے اظہار کا ذریعہ بنا دیا ہے۔

ایک عرصہ سے ٹیلی ویژن اور ریڈیو سے جو اشتہارات دیکھنے کو مل رہے ہیں انکے بارے میں ناظرین اور سامعین کے جذبات کچھ اچھے نہیں انکا خیال یہ ہے کہ اشتہارات تیار کرنے والی کمپنیاں ابھی تک اپنے علم، تجربہ اور مہارت کو اس معیار پر نہیں لا سکیں جس سے پاکستانیت کا رنگ جھلکے اکثر اشتہارات ہمارے نظریہ فکر کی نفی کرتے ہیں مثلاً خاندانی منصوبہ بندی کے بھونڈے اشتہارات پورے خاندان کے افراد کو پریشان کر دیتے ہیں جب چائنی کا استعمال عمل میں لایا جاتا ہے اسی طرح گھی کے اشتہارات میں ماں کی محبت یاد آجانے کا جملہ سمجھ نہیں آتا۔ سگریٹ کے اشتہارات میں سسپنس، مہم جوئی، ڈاکوؤں کا حملہ، بلی کی اچانک چیخ، سگریٹ پینے کے ماحول کو پریشان کن بنا دیتا ہے اگر سگریٹ کا اشتہار دکھانا ضروری ہے تو اس سے لطف و سرور کی کیفیت بھی تو پیدا کی جا سکتی ہے اتنی الجھنیں، مشکل جوئی دکھانے سے کیا سگریٹ کے ذائقہ میں اضافہ ہو جاتا ہے ہمارے اشتہار بازی کے ادارے اپنے سٹاف کو Creativeness کی طرف دھیان دینے کی بجائے بعض بے مقصد سا اشتہار تیار کرا دیتے ہیں اور اس طرح انکا کام ختم ہو جاتا ہے۔ Product سے نہ بچے اسکا ان سے کوئی تعلق نہیں

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

سنڈیوں والے اشتہار کیا اثر دکھائیں گے اگر سنڈیاں دوائی سے ختم نہ سکیں White fly کا علاج تو نظر آتا نہیں ٹیلی ویژن پر سنڈیاں ہی سنڈیاں نظر آتی ہیں۔ لاہور کی مشروب تیار کرنے والی کمپنی کا اشتہار اس لئے دکھتی رگ پر چوٹ لگا کیونکہ ملتان پہلے ہی بڑا حساس ہو چکا ہے اسے گاہے بگاہے ایسے جھٹکے لگتے ہیں کہ ملتانی بڑے جذباتی ہو جاتے ہیں ایک ایک کر کے ان سے مادی ترقی کی اشیاء چھین لی جاتی ہیں ابھی چلڈرن کمپلکس کا صدمہ باقی ہے کہ یہ ملتان سے منتقل کر کے لاہور بھیج دیا گیا اور اب فیروز پور روڈ پر گلاب دیوی ہسپتال کے پاس نہایت شاندار عمارت کی تعمیر کی صورت میں موجود ہے جسے دیکھ کر حسرت بھی ہوتی ہے کہ ہمارے نمائندوں نے اس چلڈرن کمپلکس کو منتقل ہونے سے روکنے میں کوئی کردار ادا نہیں کیا ذرائع ابلاغ نے بھی کوئی واویلا نہیں کیا بہر حال ایک اچھے منصوبے سے ملتان محروم ہو گیا لاہور ہائی کورٹ ملتان بنچ کی منتقلی کا بھی کچھ لوگوں نے ذکر کیا ہے مگر اسکی کئی بار تردید ہو چکی ہے ٹیلی ویژن سنٹر کے قیام کی نوید پر فنی خرابی کئی بار سننے کو مل چکی ہے۔ ملتان کے دانشور تو یہاں تک بھی متفق ہو چکے ہیں کہ اگر ٹیلی ویژن سنٹر سر دست بننا مشکل ہے تو کم از کم Sub sta-tion قائم کر دیا جائے جگہ کا بھی مسئلہ نہیں ریڈیو سٹیشن کی عمارت میں یہ قائم ہو سکتا ہے اور یہاں پروگرام ریکارڈ کئے جا سکتے ہیں اور انہیں لاہور سنٹر سے ٹیلی کاسٹ کر دیا جائے۔

اہل ملتان کو ایک عرصہ سے یہ گلہ بھی ہے کہ یہاں ان کی ثقافت، تہذیب کے حوالے سے جو خزانے موجود ہیں انکو محفوظ کرنے کا کوئی عجائب گھر نہیں بہت سے قیمتی دفینے، دستاویزات، قلمی نسخے، نوادرات زمانے کے ہاتھوں برباد ہو رہے ہیں۔ آثار قدیمہ کے نادر نمونے، سنگ و خشت کی صورت میں کاشی گری کے شاہکار روز بروز ماند پڑتے جا رہے ہیں۔ ملتان سے تو کم از کم حیدر آباد ہی اچھا ہے جہاں سندھ یونیورسٹی جامشورو میں سندھیالوجی ڈیپارٹمنٹ موجود ہے جہاں موہنجوڈارو سے لیکر کوٹ جی کی تہذیب کے سارے شاہکار موجود ہیں۔ سندھ کے ظروف، اشیاء خورد و نوش اور انکے پیمانے سب موجود ہیں اور ادھر ملتان جو صدیوں کی تہذیب کا مرکز ہے اسکی تہذیب کا کوئی بھی حصہ محفوظ نہیں ان گنت اشیاء ضائع ہو رہی ہیں انکو سنبھالنے والا کوئی نہیں۔ ملتان آرٹس کونسل کہنے کو تو ایک عمارت بن گئی ہے مگر اسکی سرگرمیاں صرف خطاطی کی نمائش تک محدود ہیں آگے اسکا کیا عمل ہے اسکا کون تعین کرے گا الحمراء لاہور ثقافتی مرکز بن گیا ہے اور ملتان آرٹس کونسل سے بھی اور

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

نیشنل سنٹر سے بھی دونوں معنوں میں محروم ہے عمارتوں کو کیا کرنا ہے اگر ان میں سرگرمیاں مفقود ہوں۔ ملتان علم و فن کا شہر ہے تہذیب و تمدن کا گھر ہے۔ اللہ والوں کا مسکن ہے یہ مزار، یہ مقابر، یہ کشادہ حویلیاں، وسیع و عریض مساجد کے صحن مسلمانوں کی ثقافت کے علمبردار ہیں۔ یہاں کے ظروف، مٹی کے پیالے، گھڑے سادہ زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔ لباس میں کرتا، چادر، سر پر پگڑی یا ٹوپی مسلمانوں کے ان ایام کا حوالہ بنتے ہیں جب محمد بن قاسم کے یہاں قدم پڑے تھے اور ایک وضعدار تہذیب نے جنم لیا تھا ملتان اپنے خلوص کے اعتبار سے ابھی انہیں قدموں کو اپنے سینے میں سمیٹے ہے اور جدید بننے کا اسے بھی بے حد شوق ہے مگر اسکے حصہ میں مرکزی و صوبائی گرانٹ نہ ہونے کے برابر ہے ابھی بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان کی کانووکیشن کا انعقاد ہوا ایسے موقعوں پر خطیر گرانٹ دینے کا اعلان ہوتا ہے بعض شہروں کے اداروں کو بہت کچھ گرانٹ ملتی ہے بعض علمی تنظیموں کو ۲۰ لاکھ تک کی گرانٹ مل جاتی ہے جب کہ جنوبی پنجاب کی اہم ترین دانش گاہ کو صرف ۱۰ لاکھ کیا کوئی بھی پیشکش ملتان کیلئے نہیں ؟

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

پی۔ آر۔ او

جب کبھی ہم سکول کے طالب علم تھے ہمیں انگریزی کے پریڈ میں ہمارے شفیق استاد جس مضمون کی زیادہ مشق کراتے تھے وہ مضمون پوسٹ مین کا ہوا کرتا تھا اسکی وجہ ہم کبھی ان سے پوچھتے تو وہ بتاتے "بیٹا یہ عظیم انسان ہے سرد، گرمی، دھوپ، چھاؤں، نزلہ، زکام ہر حالت میں اپنی ڈیوٹی دیتا ہے۔ گھر گھر گھومتا ہے۔ صبح سے شام تک سائیکل پر گزار دیتا ہے۔ امانت، دیانت، صداقت جو کبھی اس محکمہ کے اصول مقرر ہوئے تھے وہ آج بھی ان اصولوں کا محافظ ہے یہ کبھی نہیں ہوا کہ سجاد کی ڈاک شہزاد کے گھر تقسیم ہو جائے بلکہ کبھی یہ تمہیں گلی محلے میں ملے تو اسے ادب سے سلام کیا کرو" استاد محترم کی باتیں آج بھی ذہن کے گوشوں میں محفوظ ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ ایک کردار اور بھی آنکھوں کے سامنے گھومتا رہتا ہے جسے مختصراً پی آر او کہتے ہیں اور تفصیل سے پبلک ریلیشن آفیسر اور اردو میں افسر تعلقات عامہ کہتے ہیں۔ یہ پی آر او بظاہر افسر کہلاتا ہے لیکن کام اور نام کے اعتبار سے پوسٹ مین کا دوسرا بھائی ہے۔ پوسٹ مین تو خوش نصیب ہے کہ اس کا معاشرہ میں بڑا نام ہے اور لوگ اس کا کئی کئی گھنٹے انتظار کرتے ہیں اور اس کے حوالے سے مضمون یاد کرنے کی مسلسل محنت کرتے ہیں۔ پیار کرتے ہیں۔ پی آر او خود پی آر کرتا ہے بلکہ اردو والا "پیار" کرتا ہے لیکن لوگ اس سے پیار کچھ کم کرتے ہیں۔ اپنے بھی خفا سے بیگانے بھی ناخوش۔ دفتر آئے تو پہلی اس کی پیشی صاحب کے سامنے ہوتی ہے یہ خبر کیوں چھپی تصویر نمایاں کیوں نہ لگی۔ خبر چھوٹی کیوں لگی اور بڑی کیوں نہ لگی اور غم حالات کی تصویر بن کر جب وہ پریس کے اداروں کا رخ کرتا ہے تو صحافی برادری کے گلے شکوے اسے جینے نہیں دیتے۔ دن اداس اور راتیں پریشان۔ ایک بلا ہو تو سر سے ٹالے۔ دن بھر ناکردہ گناہوں کی سزا اور رات کو یہ خدشہ کہ صبح فلاں خبر لگ گئی تو کیا بنے گا۔ یہ خدشے اور یہ اندیشے اسے چین سے جینے نہیں دیتے۔ اور اس کے مقابلے میں پوسٹ مین دن بھر کام کرتا ہے اور جدھر سے گزرتا ہے سلاموں اور محبتوں کے انعام وصول کرتا ہوا گھر پہنچتا ہے۔ رات کو دن بھر کی اکٹھی کی ہوئی دعاؤں سے لوگوں کی چاہتوں سے آرام کی نیند سوتا ہے اور پھر صبح وہی کام اور وہی دعاؤں کا انعام۔ ادھر پی آر او صبح اٹھ کر اخبار کے صفحات کو ڈرتے ڈرتے کھولتا ہے ہر صفحہ پر ہر سطر پر نگاہ دوڑاتا ہے اور اس طرح اخبار

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

پڑھتا ہے جس طرح امیگریشن والے پاسپورٹ کو پڑھتے ہیں کہ کہیں سے کوئی عذر تلاش کر لیں۔ اگر سارے اخبار میں کہیں کوئی خطرناک خبر نہیں جو صاحب کو بری لگنے کا امکان ہو سکتا ہے تو اس کا چہرہ بشاشت کے کھل اٹھتا ہے وگرنہ حکم یہ ہوتا ہے کہ ہر بری خبر کی وضاحت اور وہ بھی صبح سویرے بیان کرنی ہے اب خبر کے دفاع کیلئے جواز تلاش کئے جاتے ہیں تاکہ اپنی Skin محفوظ ہو سکے۔ اگر یہ حکم ہوتا ہے کہ اس کی وضاحت جاری کریں تو وضاحت کا جو حشر اخبار میں ہوتا ہے اور اس پر پرانے وقتوں کی صحافت کی طرح وجاحت کے ساتھ تبصرہ بھی جاری ہو جائے تو پس پی آر او کے خودکشی کے دن قریب آجاتے ہیں۔ اس کے بعد اس کے دامن میں کچھ نہیں بچتا۔ اکثر لوگ خواہش کرتے ہیں کہ وہ کسی محکمہ میں پی آر او مقرر ہو جائیں۔ سمارٹ، فرض شناس، بھاگتا دوڑتا پی آر او کسی بھی تنظیم میں بہت اچھا لگتا ہے۔ صاحب تک اسکی رسائی بھی ہوتی ہے اور بڑے بڑے وفود کو خوش آمدید بھی کہتا ہے۔ صبحانہ سے لیکر عشائیہ تک کی تقریبات میں وہ مدعو بھی ہوتا ہے کبھی کبھار تصویر بھی چھپ جاتی ہے کچھ لوگ خوش بھی ہوتے ہیں لیکن اکثر ناراض رہتے ہیں ان کی نظر میں ''بنا ہے شاہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا'' کے مصداق ہوتا ہے۔ کوئی یہ نہیں دیکھتا کہ اس چلتے پھرتے انسان کے اندر کتنے ارمان بستے ہیں دکھوں اور زخموں کی کتنی بڑی داستان بلکہ میر تقی میر کا پورا دیوان شامل ہے۔

آ زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

اکثر لوگ خوش ہوتے ہیں کہ پی آر او کو جدید نصاب میں بڑا مقام حاصل ہے وہ پریس کانفرنس کا انعقاد کراتا ہے کوئی واقعہ ہو جائے تو پریس نوٹ جاری کرتا ہے اپنے محکمہ کی صفائی میں ہینڈ آؤٹ جاری کرتا ہے اپنے محکمہ میں رابطہ کا پل ہوتا ہے۔ اعتماد اور محبت کی فضا پیدا کرتا ہے۔ اپنے محکمہ کے بارے میں غلط فہمیوں کو دور کرتا ہے اور ایک خوشگوار فضا کو تخلیق کرنے میں اپنی تمام توانائیاں صرف کرتا ہے۔ کبھی اپنے محکمہ کا سفیر ہوتا ہے کبھی وزیر بنتا ہے۔ کبھی مشاورت کیلئے طلب کیا جاتا ہے۔ تعلقات کا ماہر، نقطہ نظر کی وضاحت کا ایڈووکیٹ ہوتا ہے بلکہ ہمارے ایک دوست تو اس کا مرتبہ کہیں فرشتوں سے جا ملاتے ہیں۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

خدا جانے وہ سچ کہتے ہیں یا محض پی آر او حضرات کی دلجوئی کرتے ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ اسے بڑی بڑی آزمائش سے گزرنا پڑتا ہے۔ روز جینا پڑتا ہے اور روز مرنا پڑتا ہے۔ خوش اخلاقی اس کا ماٹو ہے۔ مخالفتوں کے پہاڑ ہوں یا شکوہ شکایت کے انبار ہوں ان سب حالات میں اسے مسکرانا ہے بلکہ اگر کوئی زیادہ تنگ کرے اور اسے کوئی اس بات پر اکسائے کہ آپ برا کیوں نہیں مناتے تو اس کا نہایت مختصر جواب ہوتا ہے "I have to bear the insult" کیونکہ محکمہ مجھے اسی بات کی تنخواہ دیتا ہے۔ ملکی سطح پر ان کی ایک سوسائٹی بھی ہے جسے پاکستان پبلک ریلیشن سوسائٹی کہتے ہیں جو ہر سال تقریب کرتی ہے اور اپنے پی آر او کو میڈل دیتی ہے اگر اس پر کچھ بن جائے تو یہ سوسائٹی روم و شام تک نظر نہیں آتی۔ بیچارہ پی آر او کاغذی پیراہن بن کر اکیلا کچہری چوک پر کھڑا اپنی داستاں سناتا ہے اور کوئی سن لے تو اس کی مہربانی وگرنہ نہ کہیں راستہ ہے اور نہ کہیں نشاں۔ اور اکیلا پی آر او ہاتھ میں استعفا لئے پھرتا ہے۔ یہ ہے ہمارا آج کا پی آر او۔ بے روزگاری کے اس دور میں سوچئے کہ کیا اگر آپ کو کوئی پی آر او بنائے تو آپ بننا پسند کریں گے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

سواری اپنے سامان کی خود حفاظت کرے

بڑے ہوٹلوں کی کشش بھی بڑی ہوتی ہے بعض اوقات فائیو سٹار کا لفظ مقناطیسیت کا درجہ اختیار کر جاتا ہے جتنی کشش جلدی پیدا ہوتی ہے اتنی زیادہ اکتاہٹ بھی پیدا ہو جاتی ہے کہ کون ایک جیسے کھانے کھائے وہی ملتی جلتی ڈشیں وہی شوں شوں کرتی گرم آگ کے شعلے بڑھکاتی ڈشیں وہی آخر میں گرین ٹی اور پھر چھٹی۔ ایسے ظہرانے اور ایسے عشائیے اگر معمول بن جائیں تو انسان تھک جاتا ہے اور پھر اس کا دل چاہتا ہے کہ کسی دور سڑک کے کنارے کسی ایسے ہوٹل کا رُخ کرے جہاں تنور کی روٹی ہو بیٹھنے کے لئے بڑی بڑی چارپائیاں ہوں مٹی کے گھڑوں میں پانی رکھا ہو اور ایسی ڈشیں کھانے کے ملیں جو دیسی مزاج اور دیسی انداز سے تیار کی گئی ہوں ایسے ہوٹلوں کی کمی نہیں کسی بھی بڑی شاہراہ پر ایک بار سفر کر کے دیکھیں ایسے پُر کشش ہوٹل آپ کو نظر آئیں گے جہاں مسافروں کے لئے آرام اور قیام کی تمام سہولتیں میسر ہوتی ہیں۔ ٹائر ٹیوب پنکچر کی دکانیں، مکینک، حجام کی دکانیں اور چھوٹے موٹے جنرل سٹور جہاں سفر کی سہولتیں مہیا کرنے والی اشیاء دستیاب ہوتی ہیں۔ ان ہوٹلوں میں نماز پڑھنے کا بھی معقول انتظام ہوتا ہے یا تو ان ہوٹلوں کے پاس کوئی نہر گزر رہی ہوتی ہے اگر وہ نہ ہو تو ان ہوٹلوں کے مالکوں نے ایک ٹیوب ویل نصب کرا رکھا ہوتا ہے جہاں ٹھنڈا اور تازہ پانی ہر وقت دستیاب ہوتا ہے ان ہوٹلوں میں کڑھائی گوشت دال اور تنور کی تازہ روٹی جو سرور اور لطف مہیا کرتی ہے کاش آدمی ہر روز مسافر ہو۔

مسافر ہوں سفر ہے کام میرا
مجھے راہ طلب میں شام کیوں ہو

ویسے زندگی بھی ایک سرائے کے مسافر جیسی ہے جو منزلیں بہ منزلیں طے کرتا ہوا آخری منزل کو پا لیتا ہے جس میں کہا گیا ہے اے نفس مطمئنہ لوٹ اپنے رب کی طرف وہ تجھ پہ راضی اور تو اس پر راضی۔ ایسی منزل کب ملتی ہے؟ جب سواری اپنے سامان کی خود حفاظت کرے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

لٹنے کا خوف اور نہ رہزن کا ڈر مجھے
یہ فائدہ تو بے سروسامانیوں کا ہے

سفر ایک ایسی ضرورت ہے جس سے کسی کو بھی مضر نہیں اور ویسے بھی سفر میں ایک فضیلت یہ بھی حاصل ہے کہ سفر میں دعا قبول ہوتی ہے اور تین دعائیں تو ایسی ہیں جو تیر بہدف ثابت ہوتی ہیں ادھر دعا مانگی ادھر اسے قبولیت کا اعزاز مل گیا۔ مظلوم کی دعا مسافر کی دعا اور والد کی اولاد کے حق میں دعا۔

بات سفر اور سواری کی ہو رہی تھی یہ آج تک سمجھ نہیں آسکا کہ بعض چھوٹے ہوٹلوں پر بسوں کے اڈوں پر حجام کی دکان پر اور بس، ویگن کے اندانشا پردازوں کا یہ شاہکار جملہ کہ ''سواری اپنے سامان کی خود حفاظت کرے'' اس تحریر کے پیچھے کونسی حکمت پوشیدہ ہے ایسا کیوں لکھا جاتا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ مسافر ایک لمحہ کے لئے غافل ہو جائے اور سامان اس کا غائب ہو جائے اگر اس پر وہ احتجاج کرے تو اسے یہ تحریر پڑھادی جائے کہ سواری اپنے سامان کی خود حفاظت کرے۔

اگر اتنی بے اعتباری کا یہ ہوٹل، یہ بس، یہ اڈا ہے تو پھر مسافروں کو یہاں آنے کی ضرورت ہی کیا ہے اگر مالکان اس کے سامان کے تحفظ کے لئے کچھ نہیں کر سکتے تو پھر سواری اور مسافر کے درمیان جو صدیوں کا رشتہ قائم ہے وہ ٹوٹ جائے گا۔ آخر مسافر کی بھی کوئی عزت ہوتی ہے وہ کب تک اپنا تھیلا اپنے گلے میں لٹکائے پھرے کوئی تو وہ جو اسے چند لمحوں کے لئے اطمینان دلائے کہ آپ کے سامان کو کوئی خطرہ نہیں۔ اطمینان سے کھانا کھائیں۔ آرام کریں اور اگلی منزل کی راہ لیں مگر محسوس یہ ہوتا ہے کہ یہ سرائے یہ ہوٹل اور یہ بسیں اور یہ اڈے صرف مسافر کو لوٹنا جانتے ہیں سکھ دینا نہیں چاہتے۔ مسافر کے پاس جو بھی پونجی پنجی ہے وہ سب چھیننا چاہتے ہیں اگر اس کی حفاظت کرنا ہوتی تو بھلا ایسے دل آزار جملے لکھتے ہی کیوں کہ سواری اپنے سامان کی خود حفاظت کرے کیا اچھا دور تھا جب ملتان کے ایک نامور شاعر خلیق ملتانی کا بستر بس کی چھت سے ایسا گرا کہ گم ہو گیا جس پر اس نے ایک بستر مرحوم پر مرثیہ لکھا اور عوام میں بہت مقبول ہوا۔ خلیق ملتانی کو اتنے بستر عوام کی طرف سے اور بس مالکان کی طرف سے ملے کہ اس نے وہ بستر بیچ کر اچھی خاصی آمدنی کمالی۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

مرثیہ لکھنے لگا ہوں بستر مرحوم کا
چشتیاں سے لے کر حاصل پور تک موجود تھا
میں تو بس میں تھا مگر بستر امیر ابس میں نہ تھا

خلیق ملتانی نے کچھ اس قسم کے شعر لکھ کر بس مالکان کو احساس دلایا کہ مسافر کی ایک ایک چیز قیمتی ہوتی ہے اسے احتیاط سے لے جانا بس مالکان کی ذمہ داری ہے صرف یہ لکھ کر جان چھڑانا کہاں کی دانشمندی ہے کہ اگر سامان گم ہو گیا ہے تو ہم کیا کریں ہم نے تو پہلے ہی لکھ دیا تھا کوئی یہ بھی تو کہہ سکتا ہے کہ جیسے کسی غریب آدمی کا میلے میں کمبل چوری ہو گیا تھا جب کسی نے اس سے پوچھا کہ میلہ کیسا تھا اس نے جل کر جواب دیا یہ کوئی میلہ تھا یہ تو بس غریب رمضان کے کمبل چوری کا ڈرامہ تھا جو کامیاب ہو گیا کہیں ایسا تو نہیں کہ مسافر کو منزل سے دور کرنے اور راستے میں الجھانے اور اس کے قیمتی اثاثہ سے محروم کرنے اور پھر باقی کے سفر کے لئے ہر راہ چلتے آدمی یہ پیسے مانگ کر سفر کرنے کی راہ دکھانے کا نام یہ تحریر ہے کہ "میں مسافر ہوں ابھی سفر باقی ہے میری امداد کریں" ایسی درد بھری اپیلیں کیوں پیدا ہوتی ہیں مسافر کی بے بسی مجبوری کا مذاق کیوں اڑایا جاتا ہے۔ ہمارے سلیم بخاری جو اولڈ ہیلپن ایسوسی ایشن کے صدر ہیں ایسے ہی ان کا بریف کیس بس والوں نے غائب کر دیا اور آج تک نہیں ملا اس بیدردی کا کہاں احتجاج کریں۔ ہر محفل میں وہ اس کا ذکر کرتے ہیں لیکن جس طرح درد کو جس طرح بھی الٹاؤ درد ہی رہتا ہے اسی طرح مسافر کا احتجاج بھی۔ ویگن اور دکانوں پر تحریر کردا عبارت بھی اپنے اندر کئی معنی رکھتی ہے اور ہر معنی کی تاثیر بھی درد بے دوا ہے۔ وہ درد جس کے ازالہ کے لئے ابھی کوئی دوا کی گولی ایجاد نہیں ہوئی Lost And Found سیکشن اس کا مداوا نہیں بلکہ تسلی دے سکتا ہے کہ بس غم نہ کر اور بھول جا کہ تیرا کوئی بریف کیس بھی تھا۔

غم سے نہ گھبرانا ساتھی
ہمت ہار سے نہ جانا ساتھی
ملے گی منزل کٹے گی مشکل
یہ بھی وقت گزر جائے گا

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

لیکن مسافر کو اپنا سفر جاری رکھنا چاہئے سامان کی حفاظت بس کا مالک نہیں کرے گا بلکہ کائنات کا مالک کرے گا۔ حضرت لقمان نے کیا خوب فرمایا تھا جو چیز اللہ تعالیٰ کے سپرد کی جائے وہ اس کی حفاظت خود کرتا ہے لہذا سواری اپنے سامان کی حفاظت نہ کرے بلکہ اپنی حفاظت کا خیال کرے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ہمارے کان اور بجٹ کا اعلان

وہ جب اعلان کرتے ہیں بجٹ کا غریبوں کا ہی ہو جاتا ہے جھٹکا

ہر سال جب جون کا مہینہ آتا ہے ہر شخص کو حسبِ توفیق تفتیش شروع ہو جاتی ہے والدین کو اپنے بچوں کی کہ گرمی بڑھ رہی ہے اور سکول بند نہیں ہوئے۔ اخباروں میں اپیلیں شائع ہوتی ہیں کہ معصوم بچے اس غضب کی گرمی میں کیسے پڑھیں اور کیسے سکول جائیں بالآخر محکمہ تعلیم موسم گرما کی تعطیلات کا اعلان کرتا ہے پھر ان چھٹیوں کے بعد خیال آتا ہے کہ انہیں کیسے گزارا جائے کئی صحت افزاء مقامات ذہن میں آتے ہیں اور جن کی جیب میں پیسے ہوتے ہیں اور ان کی گاڑیاں پیٹرول سے فل ہوتی ہیں ان کا رُخ کوہِ مری اور جن کی جیب خالی ان کی سیر قلعہ کہنہ تک محدوم ہو جاتی ہے جن کی ٹھنڈے کمرے میسر ہوں وہ گھر سے باہر نہیں نکلتے اور جن کے کمرے گرم ہو وہ سارا دن گلی کی دکان پر یا ستو سربت کی ریڑھی پر گزارتے ہیں گویا جون ایک ایسا مہینہ ہے جو ہر شخص کو ہر طبقہ فکر کو مصروف کر دیتا ہے۔ طالبِ علم ہے تو چھٹیاں منانے کا سوچتا ہے دوستوں سے پروگرام بناتا ہے۔ تاجر ہے تو سارے اثاثے اکٹھے کرتا ہے اگر صنعتی اداروں سے تعلق ہے تو ساری توجہ صنعت کی پیداوار کے بڑھانے اور مارکیٹ میں لانے کی فکر ہوتی ہے تاکہ بجٹ کے آنے سے پہلے یا انہیں سٹاک کر لیا جائے یا نہیں فروخت کر لیا جائے غرض یہ کہ جون کا عمل ہر جگہ دکھائی دیتا ہے اور حالات کی جون تک بدل جاتی ہے۔

جون اور بجٹ کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے ادھر جون شروع ہوا ادھر بجٹ کے ڈرافٹ تیار ہونا شروع ہو گئے کہیں اعداد و شمار کا مرحلہ کہیں آمدنی سے زیادہ اخراجات کا بوجھ کہیں خسارہ اور اس کی سرمایہ کاری اور کہیں پیٹ پر پتھر اور خالی رکابی گویا بجٹ اور جون "ایسی ہستیاں" ہیں جن سے کمزور دلوں کو ڈر لگا رہتا ہے کہ خدا جانے اس دفعہ "جون" کس پر گرے گا۔ دل کے کمزور اور اختلاج قلب کے مریض جون سے اس طرح بھاگتے ہیں جیسے کوا غلیل سے بھاگتا ہے اور بجٹ سے غریب اس طرح بھاگتا ہے جیسے مرغی کا بچہ چیل سے بچنے کے لئے مرغی کے پروں میں چھپ جاتا ہے۔ غریب کو بجٹ سے اس لئے ڈر لگتا ہے کہ نجانے بجٹ کس کس طرف سے حملہ کرے گا کہاں کہاں چوٹ لگائے گا دل کے کون سے تار ہلائے گا یا

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

سیدھا دل پر قبضہ جمائے گا۔ غریب کو کیا دے گا اور امیر کے لئے کن مراعات کا اعلان کرے گا۔ ہر کام بجٹ کے لئے وقف ہو جاتا ہے جونہی بجٹ کا اعلان ہوتا ہے بجٹ جیسا بھی ہو اور جس طرح کا بھی ہو ماہرین اقتصادیات کے تبصرے قابلِ ذکر ہوتے ہیں۔ ان حالات میں اس سے بہتر بجٹ ممکن نہ تھا وزیرِ خزانہ بلاشبہ مبارکباد کے مستحق ہیں دوسرا بجٹ پر منفرد تبصرہ ہوتا ہے۔ کچے گھروں کے دیپ بجھا دیئے گئے ہیں گویا یہ طنز بجلی کے نرخوں پر ہوتے ہیں۔ غریب کے منہ کا نوالہ چھین لیا گیا ہے اس کا اشارہ مہنگائی کی طرف ہوتا ہے۔ چولہے سرد پڑ گئے ہیں ہانڈی خشک ہو گئی ہے اس کا اشارہ گھریلو اشیاء پر مہنگائی اور گیس کے بڑھتے ہوئے نرخوں کی طرف ہوتا ہے۔ حبیب جالب نے شاید اسی حوالہ سے بجٹ پر اپنا ردِ عمل ظاہر کیا تھا اگرچہ بجٹ ۱۹۹۱ء کا تھا لیکن آج بھی یہ شعر درست محسوس ہوتا ہے۔

وہ جب اعلان کرتے ہیں بجٹ کا
غریبوں کا ہی ہو جاتا ہے جھٹکا

ہمارے وزیر خزانہ میاں سرتاج عزیز جہاں ایک طرف ماہر اقتصادیات ہیں دوسری طرف علم و ادب کی شخصیت بھی ہیں۔ انہوں نے اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کی ان تحریکوں میں حصہ لیا ہے جو قیامِ پاکستان کے لئے تھی اور پہلے کالج اور کامرس سے کامرس کی تعلیم نے انہیں ایک اعلیٰ پایہ کا اقتصادی ٹیکنوکریٹ بنا دیا ہے۔ وہ یقیناً جانتے ہیں کہ قوم کے کان کیسا بجٹ سننا چاہتے ہیں۔ ایسا بجٹ جس میں آمدنی کے وسائل اس طرح سے بڑھیں کہ ٹیرف اور ٹیکسوں کا بوجھ کم ہو جس میں زرعی شعبہ جیسے One Crop Economy یعنی کاٹن کی بنیاد پر چلا جا رہا ہے اس کاٹن کی پیداوار کو ۹۲-۱۹۹۱ء کی سطح پر لائیں یعنی ایک کروڑ ۲۳ لاکھ گانٹھیں ہم کاٹن سے حاصل کر چکے ہیں اب ۸۷ لاکھ ملکی سطح پر گانٹھیں ہماری اچھی کارکردگی کی علامت ہیں اس کے کیا اسباب ہیں اس کے بارے میں سوچنا ہمارے وزیرِ خزانہ کی ذمہ داری ہے ملک کو واقعتاً ایک صنعتی قوت بنانے کی ضرورت ہے اس کے لئے روزمرہ استعمال کی عام اشیاء بنانے کی بجائے بنیادی صنعتوں کی طرف توجہ دی جائے اور خود انحصاری کی کوشش کی جائے۔

ہمارا قومی بجٹ ہمیں اکیسویں صدی میں قدم رکھنے کے قابل بنانے ایک طرف وسائل میں اضافہ ٹیکس لگا کر انہیں بلکہ غیر آباد، ویران لاکھوں ایکڑ اراضی کو قابلِ کاشت بنا

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

کر کیا جائے۔ بیمار صنعتی یونٹ کا جدید سائنسی سرجری سے علاج کیا جائے اور عوام پر پڑنے والی مہنگائی، بیروزگاری کے اثرات دور کئے جائیں۔ قومی بجٹ کا لفظ تقریروں میں بڑا استعمال ہوتا ہے لیکن عملاً پیشرفت نہیں ہوتی اس کی وجہ کیا ہے ہم جناب وزیرِ خزانہ سے ادب سے اور اشتہارات کی کمپنیوں سے معذرت سے عرض کریں گے کہ آپ کے نت نئے اشتہارات عوام کو Consnption کو بڑھا رہے ہیں جب ہر چیز خریدنے کے لئے آپ مارکیٹ کا رُخ کریں گے تو بچت کہاں ہو گی یا بچت کرالیں یا اشتہارات سے عوام کو روشناس کرالیں۔ سادہ زندگی اپنانے کی تلقین نہیں کر سکتے۔ ہمارے وزیرِ خزانہ کالج لائف سے مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے خازن رہے ہیں کیا وہ بتا سکتے ہیں کہ مہنگائی پر کیسے قابو پایا جا سکتا ہے بیروزگاری نے نوجوانوں کی آنکھوں میں جو بیزاری پیدا کی ہے اس کا مداوا بجٹ میں کیا ممکن ہے؟ قوم پر قرضوں کا بوجھ ہے اس میں غریب آدمی کا کس قدر دخل ہے اگر اس نے قرضے نہیں لئے تو اسے سزا بھی نہیں ملنی چاہئے اسے آسودہ حال زندگی دینا ہمارے قومی بجٹ کی ذمہ داری ہے حکومت کی آمدنی میں اضافہ کم کیوں ہے اور مصارف زیادہ کیوں ہیں؟ یہ بھی جناب سر تاج عزیز صاحب سوچیں عوام تو صرف گھر کے اندر اور باہر اپنے شہر میں اور اپنے صوبے میں یا پاکستان کے کسی بھی حصے میں پُر سکون ماحول اور احساس تحفظ چاہتے ہیں اور ایک ایسی مثالی زندگی گزارنے کے آرزو مند ہیں جس میں روزگار کے وسائل ہوں۔ کھانے پینے کی اشیاء سستی ہوں۔ ویگن اور بس والے ان کو سوار کریں اور کرایا کم لیں ان کے پیٹرول سستا کرنا جناب سر تاج عزیز صاحب کی ذمہ داری ہے۔ غریب آدمی گھر سے نوکری تک ویگن میں سیٹ چاہتا ہے کم کرایہ چاہتا ہے اور واپس گھر آتے ہوئے اسے روٹی اور سالن تیار ملے اور دفتر سے واپس آتے ہوئے اس کے ایک ہاتھ میں بچوں کے لئے قلم کتاب اور دوسرے ہاتھ میں آموں کا تھیلا ہو۔ اگر تو بجٹ میں ایسی Provisions موجود ہیں تو پھر کان بجٹ کے اعلان کے لئے تیار ہیں۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

یہاں تھوکنا منع ہے

ہم گولڈن جوبلی تقریبات منا رہے ہیں۔ ہمیں آزادی حاصل کئے ہوئے پچاس سال ہو گئے ہیں اس شاندار کامیابی پر اور اس مسرت و جانیت کے موقعہ پر ملک بھر میں جشن کا سماں ہے کیونکہ نہ ہو۔ ایک طویل آمریت کے بعد ہمیں ایک جمہوری ریاست ملی ہے۔ ایک عرصہ ادھر ادھر ہونے کے بعد ملک میں ایک جمہوری مملکت مستحکم ہوئی ہے وگرنہ ماضی میں ہم نے کیا کیا دکھ نہیں اٹھائے جس شعبہ حیات کو سامنے رکھیں ظلم اور زیادتی کی کئی داستانیں سامنے آتی ہیں گزشتہ برسوں میں ہم نے جمہوریت کو کم موقعہ دیا ہے اور مارشل لاء کا زیادہ دور دیکھا ہے۔ عوامی منشا کے قوانین کم بنائے ہیں اور آرڈی نینس زیادہ چلائے ہیں۔ انہیں آرڈی نینسوں میں ایک آرڈی نینس پریس اینڈ پبلی کیشن آڑڈی نینس ۱۹۶۳ بھی ہے جسے عرف عام میں پریس کے کالے قوانین کہتے ہیں جس میں کئی اخبار بند ہوئے۔ کئی اخباروں کے ڈیکلریشن منسوخ ہوئے اور کئی صحافی قوت پرواز سے ایسے محروم ہوئے کہ پھر قلم پکڑنے کی سکت پیدا ہی نہ کر سکے اور کاغذ اور دوات ان کے ہاتھ سے چھوٹ گئے۔ کہتے ہیں ان دنوں اپیل، دلیل اور وکیل کی گنجائش دستیاب نہ تھی۔ ناقدین تو اور بھی بہت کچھ کہتے ہیں کہ ہمارے بنیادی حقوق سلب تھے۔ کہیں آزادی نہ تھی۔ مجید لاہوری نے شاید انہی دنوں کے حوالے سے بات کی ہے۔

76
کرتا نہیں کوئی کرم ، کھاتا نہیں کوئی ترس
پیتے ہیں خونِ جگر جیسے ، ہے یہ گنے کا رس

گزشتہ دنوں کو سامنے رکھنے مارشل لاء کے ۲۳ سال اور جمہوریت کے ماہ و سال کو میزان میں تولنے کے بعد ایک چیز سامنے آتی ہے ماضی کا کوئی عہد ہو۔ جیسے کوئی حکمران ہو ہمیں ایک آزادی ہر دور میں حاصل رہی ہے جسے کسی حکومت نے ڈسٹرب نہیں کیا بلکہ ہر حکومت نے ہماری اس آزادی کو عملاً تسلیم کیا ہے کیونکہ اس پر کوئی تعزیر یا سزا تو نہیں ہوتی۔ آزادیوں میں سے ایک آزادی ہر جگہ تھوکنے کی ہے۔ بلکہ "یہاں تھوکنا منع ہے" آپ مزے سے تھوکیں کوئی آپ کو نہیں ٹوکے گا اور نہ ہی کوئی روکے گا۔ ہم نے کس کس جگہ نہیں تھوکا

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

نہ کوئی جگہ چھوڑی اور نہ کسی شخصیت کو بخشا ہے۔ اقتدار اور کردار پر اس قدر تھوکا ہے کہ شخصیتیں مسخ ہو گئی ہیں اور کئی کردار شہر خاموشاں میں جا بسے ہیں۔ مگر اس کے باوجود ہماری تھوک کم نہیں ہوئی۔ ہمیں آزادی ہے ہم جب چاہیں اور جس جگہ چاہیں اور جس پر چاہیں تھوک دیں اس کے لئے ممکن ہے قانون ہو یا کوئی سزا بھی مقرر ہو مگر قانون تو اس لئے بنائے جاتے ہیں کہ انہیں توڑا جائے (ایک ذمہ دار شہری سے ایسی توقع نہیں) اور پھر بڑے فخر سے کہا جائے کہ قانون ہمارے سامنے بے بس ہے۔ سنا ہے کہ ترقی یافتہ ممالک میں اگر کوئی شخص ادھر ادھر مقررہ جگہ سے ہٹ کر تھوک دے تو اسے سزا ملتی ہے۔ تھوکے ہوئے کو چاٹنے کی سزا تو نہیں دیتے البتہ احساس دلا دیتے ہیں کہ ہر جگہ اور ہر وقت تھوکنا کوئی اچھا شغل نہیں۔ صحت مند معاشرہ ان عوارض سے بچتا ہے مگر ہمارے ہاں کچھ بلاوجہ آزادیاں میسر ہیں اور جن پر Chack And Balance نہیں مثلاً یہاں پارکنگ منع ہے ان بورڈز کے نیچے آپ کو ایک گاڑی اور اسے دیکھتے ہوئے اور کئی گاڑیاں کھڑی ہو جائیں گی۔ ''یہاں سگریٹ پینا منع ہے'' لیکن ایک ذمہ دار شخص مزہ سے کش لگا رہا ہوتا ہے۔ آپ اس کا کیا بگاڑ لیں گے۔ سڑک پر جاتے ہوئے آپ کو ٹریفک کا ایک نشان دیکھنے کو ملے گا جو ہسپتال کا اشارہ دے رہا ہوگا یہاں اونچی آواز میں ہارن بجانا منع ہے مگر رکشا، ٹیکسی اور گاڑیوں والے جس طرح پریشر ہارن کا استعمال کرتے ہیں اور جس اونچی آواز میں آپ کو پنجابی کے بھڑکیلے گانے سناتے ہیں دل کے مریض بھی جھوم اٹھتے ہیں اور داد دیتے ہیں کہ ہمارے معاشرے کی اقدار کی رفتار کتنی تیز ہے حالانکہ ہسپتال ہمارے لئے ترجیحات کی پہلی شرط ہے جسے آواز سے دور اور گرد و غبار سے بچانا پڑتا ہے تاکہ مریض جلد صحت یاب ہوں اور ایک تندرست معاشرہ پروان چڑھ سکے۔ اگر ہسپتال میں جگہ جگہ تھوکنا شروع کر دیا جائے تو پھر جو جراثیم پھیلیں گے اور ان سے جو بیماریاں پیدا ہوں گی وہ اس آزادی کو بھی ہڑپ کر جائیں گی۔ جو آزادی ہم ہر جگہ تھوکتے ہوئے محسوس کرتے ہیں اگر ہم نے یہ آزادی اس دھڑلے سے استعمال کرنی ہے تو پھر ایسے بورڈ لگانے کی کیا ضرورت ہے کہ یہاں تھوکنا منع ہے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

پگڑی

کچہری چوک میں عموماً ٹریفک والے ایسے موٹر سائیکلوں اور ایسی گاڑیوں کو روک لیتے ہیں جن کے ڈرائیور دیہاتی ہوں یا چھوٹے بچے ہوں ٹریفک والوں کے خیال کے مطابق ان کے پاس گاڑی کے کاغذات مکمل نہیں ہوتے یا ڈرائیور کے پاس لائسنس نہیں ہوتا۔

ایک دن ایسا ہی ہجوم اسی چوک میں دیکھنے کو ملا۔ ٹریفک والوں نے ایک موٹر سائیکل کے بابا جی کو روک رکھا تھا۔ بابا جی چالان کٹوانے کے حق میں نہیں تھے اور ٹریفک کا عملہ بابا جی کو چھوڑنے کو تیار نہیں تھا تکرار بڑھتی گئی اور ہجوم اکٹھا ہوتا گیا۔

اتفاق سے ہمارا بھی وہاں سے گزر ہوا میں نے پولیس کے عملہ سے پوچھا کہ بھائی! اس بابا جی کا کیا قصور ہے اس نے اشارہ کی خلاف ورزی کی ہے یا کاغذات مکمل نہیں۔

ٹریفک کے عملہ کا جواب تھا بابا جی جو کہہ رہے ہیں وہ ہمیں سمجھ نہیں آرہا وہ کہتے ہیں کہ میرا چالان اس لئے کر رہے ہو کہ میں نے پگڑی باندھی ہوئی ہے میری گاڑی کو اس لئے روکا ہے کہ میں دیہاتی ہوں اور اس سارے مجمع میں واحد پگڑی بردار ہوں۔

میں نے کہا وہ ٹھیک کہتے ہیں یہی وہ عظیم انسان ہے جس کی ہمیں صدیوں سے تلاش تھی ہمارے فکری اثاثے کا امین یہی شخص ہے جس نے فرنگی کی آج سے ڈیڑھ سو سالہ ثقافتی یلغار کو مسترد کرتے ہوئے اپنی پگڑی، اپنی فضیلت اور اپنی دستار کو محفوظ رکھا ہے۔

اس عظیم انسان کو مکمل "پروٹوکول" ملنا چاہئے جہاں سے گزرے ٹریفک کا عملہ سلام کرے۔ یہ پگڑی ہماری سچائیوں اور اچھائیوں کی علامت ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ ٹریفک کے عملہ کو میری بات سمجھ میں آگئی انہوں نے بابا جی سے معذرت کی اور اسے وہ سلیوٹ پیش کیا جو جنگِ آزادی سے آئے ہوئے غازی کو قوم پیش کرتی ہے۔

مجمع کی طرف سے ٹریفک پولیس زندہ باد کا نعرہ گونجا اور ہجوم منتشر ہو گیا۔ لیکن بابا جی کی شخصیت اور اس کی باتیں کئی سوال پیدا کر گئیں اور کئی الجھنیں ذہن میں ابھر گئیں۔

پگڑی کیا ہے؟ کہاں سے آئی اور کس حال کو پہنچ گئی کبھی یہ پگڑی غازیانِ اسلام کی فتوحات کا طرۂ امتیاز تھی۔

برصغیر کے حکمران مسلمانوں اولیائے عظام، صوفیائے کرام اور علمائے دین کی

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

وجاہتوں کا نشان تھی۔

انگریز بہادر نے جہاں ہمارے قلعے مسمار کئے ہماری فصلیں برباد کیں وہاں ہماری ثقافت کو اور ہماری معاشرتی قدروں کو اس طرح روندا کہ عظمتوں کے سارے نشان تحلیل ہو گئے۔

فرنگی تہذیب اور مغرب کے کلچر کی نقالی ہمارے لئے اعزاز بن گئی اور اصل تہذیب جو انسانیت کی سچی روایات اور اصولوں کی اور تاروں سے جُڑی ہوئی تھی وہ تسبیح کے دانوں کی طرح بکھر گئی۔

ہمارے برصغیر پاک و ہند کے حکمران جس پگڑی کو اپنی آن سمجھتے تھے وہ پگڑی انگریز نے اپنے دربان کو پہنادی۔ اپنے خان ساماں کو تھمادی۔ اپنے دفتری اور اردلی کو وہ لباس دیا جو مغلیا سلطنت کے شہزادوں کا کبھی ہوتا تھا اصول تو یہ تھا کہ ۱۴ اگست کی صبح سے ہمارے پرانے انداز بدل جاتے ہیں ہمارے دفتروں میں پگڑی ہمارے وقار کی علامت بنتی اور "صاحب" سر پر پگڑی کا تاج لہراتا مگر ایسا نہ ہوا۔

ہم نے اپنی شناخت کا یہ عمل نہ اپنایا بلکہ دفتر کے لئے "جناح کیپ" جو ہمارے بڑے افسران کے لئے ضروری تھی ان افسران نے نہایت دانشمندی سے اپنا نائب قاصد اپنے چپڑاسی اور اپنے بستہ بردار کو پہنادی اور خود اسی تہذیب کو سینے سے لگائے رکھا جو ایک بیورو کریٹ کے شایان شان ہو سکتی ہے۔

سر پر پگڑی، شلوار قمیض سے کیا کوئی بڑا افسر بن سکتا ہے! کیا وہ عوام جیسا نہیں ہو جائے گا پھر فرق کیا ہوا۔

افسر اور عوام میں بہر حال ایک Distance ہونا چاہئے ورنہ موثر انتظامی صلاحیت پیدا نہیں ہو سکتی لیکن ایسے گورنر بھی تو تاریخ میں ہو گزرے ہیں جن کے سروں پر پگڑی، شلوار قمیض پہنی ہوتی تھی اور ان کی دہشت کا یہ عالم تھا کہ بلوچستان سے لے کر سرحد تک کسی دکاندار کو نرخ بڑھانے کی جرأت نہ تھی۔

ہونواب کا کالا باغ تھے تو آج کالا باغ ڈیم کیوں نہیں بنتا اس کی وجہ یہ ہے کہ سر پر پگڑی کا فقدان ہے۔

ہمیں ہر چوک میں ایسے بابا جی چاہئیں جو ذہنوں سے فرنگی کی پھیلائی ہوئی جہالت کو دور کر سکیں اور ان جھوٹی قدروں سے نجات دلا سکیں جو ہمیں اندر ہی اندر سے ٹوٹ پھوٹ کا

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

شکار کر رہی ہیں ہمیں باطنی سکون اور طمانیت قلب سے محروم کر رہی ہیں۔

پگڑی اگر کسی کے گھر جاتی تو بات رشتے ناطوں تک پہنچ جاتی ، پگڑی اگر کسی کے قدموں میں رکھ دیتے تو مقتول کے وارثین قتل جیسے بھیانک جرم کو معاف کر دیتے اور کہتے کہ فلاں بزرگ نے اپنی پگڑی ہمارے قدموں میں رکھ دی اور اب کوئی چارہ نہیں رہا۔

پگڑی بدل دوستیاں زمانے بھر میں مشہور تھی لوگ فخر سے ایسی دوستوں کی مثالیں دیتے اب دوستی کی بنیاد کیا ہو۔ کنگا جو اکثر جیب میں رہتا ہے ''چین'' جو گلے میں لٹکتی رہتی ہے اسے کیسے بدلا جائے۔

جناح کیپ جو ہم نے چپڑاسی کو پہنا دی ہے۔ ''صاحب'' ننگے سر دفتر آتے ہیں اور بے چارہ جناح کیپ کی شان دکھاتے ہوئے بستہ ہاتھ لئے ہوئے چپڑاسی داخل ہوتا ہے۔

جی چاہتا ہے کہ اسے سلیوٹ مارا جائے اس کے سر پر شان سے ٹکی ہوئی جناح کیپ کو پیار کیا جائے کہ وہ میرے قائد حضرت قائداعظم محمد علی جناح ؒ کی عظمتوں اور رفعتوں کی علامت ہے اور صاحب کی طرف نظریں پھیر لی جائیں کہ وہ ہمارے کلچر کی نمائندگی نہیں کر رہا۔

اکثر افسران کو گلہ ہے کہ اب عوام ان کا احترام نہیں کرتے اگر افسران عوام میں آ جائیں تو عوام انہیں سروں پر بٹھائیں گے۔

عوام افسر کے سر پگڑی دیکھنا چاہتے ہیں اور جناح کیپ کو دفتری امور نپٹاتے ہوئے سر پر جلوہ افروز دیکھنے کے آرزو مند ہیں۔

دیکھیں! پگڑی کب ہمارے گھروں میں اور جناح کیپ کب دفتروں میں نظر آتی ہے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

جون کا مہینہ - فیلڈ سٹاف کا پسینہ

سرکار انگلشیہ کی برکات پر ہم نے کئی مضامین لکھے شوق سے نہیں بلکہ وہ ہمارے نصابِ تعلیم میں شامل تھے کہ انگریز بہادر نے ہمیں اور ہمارے نظام کو کیسے بدلا ہے۔ ہر چیز ہلا کر رکھ دی ہے۔ ہم عربی فارسی کے سکالر تھے۔ انگریزی کو سرکاری زبان بنا کر ہمیں اس نے ان پڑھ بنادیا ہے۔ ہمارے مالی و انتظامی معاملات کو بھی اپنے ماحول اور موسم کے ایسے تابع کیا ہے کہ اتنے سال گزرنے کے باوجود ہم نے کبھی سوچا ہی نہیں کہ یہ نظام ہمارے معاشرے مزاج سے مطابقت رکھتے ہیں یا نہیں۔ انگلستان میں مئی اور جون کے مہنے موسم بہار کے ہوتے ہیں۔ اسی لئے ان کے مالی سال کا خاتمہ جون میں ہوتا ہے اور نئے مالی سال کا آغاز جولائی سے۔ ہم نے بھی اس کی تقلید کی جاری رکھا ہوا ہے حالانکہ موسم جون ہمارے ہاں سخت ترین گرمی کے دنوں پر محیط ہے۔

آیا مئی جون کا مہینہ
بہا چوٹی سے ایڑی تک پسینہ

لیکن اس کے باوجود ہمارے بجٹ اسی مہینہ میں تیار ہوتے ہیں۔ تمام مالی و انتظامی اصلاحات اسی مہینہ میں مکمل ہوتی ہیں۔ ہمارا مالی سال جون کے اختتام اور جولائی کے آغاز سے ترتیب پاتا ہے اور کیلنڈر سال جنوری سے دسمبر تک محدود ہے۔ کیلنڈر سال سے ہمارے اوقات کار رہتے ہیں یعنی ہم دو نظاموں اور دو سالوں کی تقسیم میں بٹے ہوئے ہیں۔ انہیں یکجا کرنے میں ممکن ہے کوئی الجھن پیدا ہو لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کون سی ہماری حکمتِ عملی ہے کہ ہم نے جو کام مہینہ کے اختتام پر کرنا ہوتا ہے یا جون کے مہینہ میں مکمل کرنا ہے مثلاً بجلی، گیس، پانی کا بل ہم نے مہینہ کے اختتام پر ادا کرنا ہوتا ہے یعنی ۲۹، ۳۰، ۳۱ تاریخیں مقرر ہوتی ہیں اور پھر جرمانے کے ساتھ ادا کریں وگرنہ بجلی، گیس، پانی کے کنکشن کاٹ دیئے جائیں گے اور ٹیلی فون کا بھی یہی حال ہے بلکہ ستم بالائے ستم یہ ہے کہ اگر آپ نے بل ادا نہ کیا تو ٹیلی فون بھی کٹ جائے گا اور نادہندگان کی صورت میں سزا بھی ملے گی۔ بل جیسا ہے ایک بار ادا کریں پھر اس کے بارے میں درخواستیں لکھواتے پھریں۔ داد فریاد کریں اگر تو

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

محکمہ کو رحم آگیا تو آپ کا بل درست ہو جائے گا وگرنہ Found Correct کا جواب آپ کو گھر کے اڈریس پر مل جائے گا۔ ہم نے بلوں کی ادائیگی کے لئے ایسے یک طرفہ نظام کیوں رائج کر رکھے ہیں کہنے کو تو ہم انہیں Utility Bills کہتے ہیں یوٹیلٹی سروس کا نام دیتے ہیں لیکن جس طرح وصول کرتے ہیں عوام کی چیخیں نکلوا دیتے ہیں۔ ہم سرکاری ملازم کے پاس مہینہ کی آخری تاریخوں میں وضعداری کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ جیب بھی تنگ ہوتی ہے اور ہاتھ بھی۔ ان دنوں میں بل کو تھامنا اور جیب سے کچھ نکالنا بڑا مشکل کام ہوتا ہے اور اوپر سے حکم یہ ہوتا ہے کہ بل ادا کر دو ورنہ کنکشن کاٹ دیا جائے گا۔ ان حالات میں کس طرح یہ بل ادا ہوتے ہیں اس کا اندازہ وہ محکمہ نہیں کر سکتے جن محکموں کو سرکاری طور پر بجلی، گیس، پانی کی سہولت ہے۔ اس لئے کہ وہ اس محکمہ کے ملازم ہیں اور اتنے یونٹ کے مستحق ہو۔ یونٹ اتنی احتیاط سے شمار کئے جاتے ہیں کہ اس ادارے میں فٹ ہو جاتے ہیں جس دائرے کا ملازم ہوتا ہے نہ کچھ دینا پڑتا ہے اور نہ کچھ لینا پڑتا ہے بلکہ شیکسپیئر کی زبان میں نہ ادھار لو اور نہ ادھار دو، زندگی کا ماٹو بنا لو۔ اگر یہ بل مہینے کے شروع میں مل جائیں اور پہلے ہفتے میں ادا کر دیئے جائیں تو اس میں محکمہ خزانہ اور جناب میاں سر تاج عزیز صاحب کیا فرماتے ہیں۔ اس میں کوئی قباحت ہے۔ ہر اس قباحت پر قابو پایا جا سکتا ہے جو عوام کی فلاح و رفاہ کے راستے میں رکاوٹ ہو اور صارفین کی فلاہ کے لئے اور کون سوچے گا۔

تمہیں نے درد دیا تمہیں دوا دینا

ہر ملازم کے پاس یکم تاریخ کو تاریخ موجود ہوتی ہے اور یہ بل آسانی سے ادا ہو سکتے ہیں انہیں مہینہ کے اختتام پر لے جانا ایسے ہی ہے جیسے خود بھی پریشان ہو اور مجھے بھی پریشان کر۔ بات جون کے مہنہ کے بارے میں ہو رہی تھی جون بڑا ظالم ہے جو فیلڈ سٹاف پر گزرتی ہے وہ بیچارے کس کو سنائیں اگر سنائیں تو جان سے اور نوکری سے جائیں۔ جون کی گرمی اور ٹارگٹ کا دباؤ انہیں کالے یرکان کا مریض بنا دیتا ہے۔ ائیر کنڈیشنڈ دفتر میں بیٹھنے والے افسران اور ارباب اختیار کو کیا معلوم کہ فیلڈ سٹاف جس میں ایکسائز اینڈ ٹیکسیشن کا عملہ بھی شامل ہے بنک کے مینیجر اور ریکوری ٹیمیں کس طرح آندھی، طوفان، گرمی اور دھوپ میں سائیکلوں پر، موٹر سائیکلوں پر رواں دواں ایک گھر سے دوسرے گھر تک معمولی معمولی رقمیں وصول کرتے ہیں اور محکمہ کو جون کے مہینہ میں اپنا ٹارگٹ مکمل کر کے دیتے ہیں یہ ٹارگٹ مارچ میں کیوں

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

نہیں ہو سکتا۔ اس ''مینوئل'' میں اور کس مالی کتاب میں لکھا ہے کہ ٹارگٹ صرف اور صرف جون ہی میں مکمل کئے جائیں۔ بیشک فیلڈ سٹاف کی جان نکل جائے پھر جون کے مہینہ میں آخری وقت تک بنک کھلے رہتے ہیں اور عملہ انتظار کرتا ہے کہ کوئی ٹیکس جمع کرانے آئے۔ تو ہم اس کے حساب کو بے باق کریں آخری دن۔ آخری وقت عملہ کا بنک کا نظام کس ایمر جنسی کی علامت ہے۔ اسے سہل کیوں نہیں بنایا جا سکتا۔ کیا ٹیکس وصول کرنے اور عوام پر دباؤ ڈالنے کے اور طریقے نہیں ہو سکتے جو آسانی اور بہتری سے سر انجام پا جائیں۔ ضروری ہے کہ انہیں اس طرح ہراساں کر کے اور ان کے احساب پر سوار ہو کر ہم کام کریں۔ اب ہم ایک ایسی فلاحی مملکت کے شہری ہیں اور ہمارے ارباب اختیار بھی فلاحی مملکت کے تحت نظام کو بہتر بنانے کی مساعی کر رہے ہیں۔ ہمیں اپنی خامیوں اور کوتاہیوں پر ایک نظر ڈال کر آئندہ کے لئے بہتر لائحہ عمل اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ واجبات وصول کرنے والے محکمے بلاشبہ ہماری معیشت کی بہتری چاہتے ہیں۔ اور اپنے اہداف پورا کرنا چاہتے ہیں لیکن ایک چیز جو سارے اہداف پر بھاری ہے وہ ہے انسانی طرزِ سلوک وہ اذیتیں اور تکلیفیں ذہن میں رہنی چاہیں جو عوام کو ان محکموں سے ہیں۔ اور خود ان محکموں کے فیلڈ سٹاف کو ہیں اگر محکمہ فیلڈ سٹاف اور صارفین مل کر نظام کی اصلاح کر لیں تو جون ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ وگرنہ بہا چوٹی سے ایڑی تک پسینہ۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ملتان اپنی پہچان مانگتا ہے

ملتان مواصلاتی، جغرافیائی اور تاریخی اعتبار سے ایک ایسی شاہراہ پر واقع ہے جہاں سے تہذیب و تمدن، علم و دانش کے ان گنت قافلے گزرے ہیں۔ ملتان نے کوئی ایک صدی نہیں دیکھی بلکہ ساڑھے پانچ ہزار کے ماہ و سال اس کی نظروں میں ہیں۔ اس نے کسی ایک حملہ آور کو نہیں بلکہ سکندرِ اعظم سے لے کر نہ جانے کتنے حملہ آور اس شہر کی قدامتوں سے ٹکرانے کی کوشش کرتے رہے ہیں، مگر اس شہر نے حریت اور جرأت کی ایسی داستانیں رقم کی ہیں کہ حملہ آور اس شہر کو اپنا شہر نہ بنا سکے البتہ یہ شہر جب بھی فتح ہوا محبت سے ہوا، محمد بن قاسم نے اپنی محبت اور خلوص سے اس شہر کو ایسا فتح کیا کہ یہ شہر وضعداریوں اور محبتوں کا مرکز بن گیا۔ یہ اس نوجوان کی خوبیاں تھیں یا اس پیغام کی اثر آفرینی تھی جو وہ اسلامی اقدار کی صورت میں لایا تھا، اور اس شہر کو اس مٹھاس اور شیرینی سے متعارف کرایا جس کی ظاہری شکلیں کھجور، انار، کنو اور آم کی صورت میں آج بھی موجود ہیں اور ترقی کی یہ کپاس، گندم، چاول، پھل اور سبزیوں کی وافر مقدار کی صورت میں ایکسپورٹ کے تمام وسائل کی حامل ہیں۔ ملتان محبتوں کا شہر، وضعداریوں کا گھر، آنے والے مہمان کا خوبصورت میزبان، تحفے تحائف کی روایتوں کا امین، سوہن حلوہ، تیل دھنیاں، مہندی اور دستکاریوں کا انمول شہر ہے۔ اہلِ ہنر کا حسن و جمال، مصوری، خطاطی اور مٹی سے مختلف نقش تیار کرنے والا شہر اور "ملتانی مٹی" جو رانائی اور لطافت کی صلاحیتوں کی مٹی ہے وسعتوں اور رفعتوں کی امین ہے۔ یہ محبت اور الفت میں کسی سے کم نہیں ہے۔ کوئی ہزار گلے شکوے کرے اس کی قدر پر، اس کی تاریخ پر، اس کے کلچر پر مگر بالآخر اسے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ملتان اپنی پہچان میں منفرد ہے۔ یہ عجز و انکساری والوں کا شہر ہے۔ اس نے روحانیت کے سہ چشموں سے انسان دوستی کا پانی پیا ہے۔

فریدا ایسا ہور ہیو جیسا گھ میت
پیراں بیٹھ ہٹار یئے اوہ کدی نہ چھوڑے پریت

ملتان صدیوں کے حملوں، زیادتیوں اور ظلم و ستم کے باوجود زندہ شہر ہے۔ لیل و نہار کے بدلتے تیوروں میں اس نے اپنی شناخت کو قائم رکھا ہے۔ اپنی تاریخ کو مسخ نہیں ہونے

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

دیا، اسے بجا ناز ہے کہ یہ اللہ والوں کا شہر ہے۔ ان لوگوں کا شہر ہے جنہوں نے ملتان کو اسلام کی پہچان دی، پرپلاد پوری کلچر سے نجات دی، سورج کنڈھ اور بدھلہ سنت کی جگہ اسے غوثؒ کی نگری، حضرت شاہ شمسؒ کا روحانی وقار اور حضرت شاہ یوسف گردیزؒ کی پاکیزہ اقدار کا نکھار بخشا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب ملتان وہ نہیں جو کبھی ملوہی قوم کا ملتان تھا، اب یہ مدینۃ اولیاء ہے، علم و دانش کا گہوارہ ہے۔ دانش کدوں کا مرکز ہے۔ تعلیم و تدریس کو وقیع نام ہے۔ ذراعت، صنعت اور تجارت کی اہمیت کا خطہ ہے۔ اس کی آبادی بیس لاکھ سے تجاوز کر رہی ہے۔ جب ۱۹۴۷ء میں پاکستان قائم ہوا اس کی آبادی تقریباً پانچ لاکھ انسانوں پر مشتمل تھی گذشتہ پچاس سالوں میں اس کی آبادی میں اضافہ اور شہری وسعت پر پھیلاؤ بڑھا ہے لیکن اس شہر کو گذشتہ سالوں میں کیا تمدنی سہولتیں ملی ہیں، آبادی کی نسبت نے اسے کتنی نئی سڑکیں، نئی بسیں، نئے ہسپتال ملے ہیں۔ پانی کی فراہمی، شہر کی صفائی اور تفریح کی کتنی سہولتیں ملی ہیں، تفریح کا یہ حال ہے کہ کئی باغ اس شہر میں ایسے گم ہوئے ہیں کہ مورخ حیران ہے کہ انہیں تاریخ کے اوراق سے نکال کر شہادت اور ثبوت پر کیسے لائے، باغ لانگے خان، نئی معلوم یہ کہاں تھا، اور اب کہاں ہے یہ کبھی عظیم خطیبوں، سیاستدانوں اور علم و ادب کے عظیم انسانوں کی خطابت کا مرکز تھا، اب یہاں چڑیاں بھی ہم کلام ہوں تو عجیب سا لگتا ہے۔ حضوری باغ، باغ عام و خاص اور قلعہ کہنہ کے باغات خشک گھاس اور ویرانی و پریشانی روشوں کا نام رہ گئے ہیں اگر کہیں ذرا سی بھی گھاس ہے تو مالش کے رسیاؤں نے تن سازی کا ایسا مظاہرہ کیا ہے کہ ان کے بھاری بھر کم جسم کی وجہ سے گھاس باہر سر نہیں نکالتی کہ کہیں پہلوان کے قدموں میں دم نہ توڑ دیں۔ ملتان درختوں سے بھی محروم ہو گیا ہے اس کی کوئی اسی سڑک نہیں جہاں سے ٹھنڈی ہوا کا جھونکا میسر آئے۔ آکسیجن کے یہ سارے ٹینٹ اکھڑ گئے ہیں۔ شہر میں آلودگی کے خلاف کبھی کبھی "واک" ہو جاتی ہے لیکن واک والوں کا جو حشر ہوتا ہے وہ جو گرد و غبار ان کے اجلے لباس پر پڑتی ہے، وہ آئندہ کے لئے توبہ کر لیتے ہیں کہ اور انگریزی کا وہ محاورہ یاد کرتے ہیں جس کا اردو ترجمہ "الٹے باس بریلی کو" 'To Carry the Dust to Multan'۔

ملتان میں میونسپل کارپوریشن موجود ہے جس کا وجود کا اگرچہ پتہ نہیں چلتا، کیونکہ کارپوریشن کسی بھی شہر کی ثقافت اور کلچر کی نمائندہ ہوتی ہے۔ مگر ملتان کارپوریشن کے وجود کا اس وقت پتہ نہیں چلتا ہے کہ جب کسی چونگی پر ہونے والی بد عنوانی کی خبر چھپتی ہے، یا کسی فراڈ

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

کا کھوج لگتا ہے۔ وگرنہ کارپوریشن کو شہر اور شہر کو کارپوریشن کا کوئی علم نہیں، نہ کبھی اس کی تعریف ہوتی ہے اور نہ اس نے صفائی اور فراہمی آب میں دلچسپی لی ہے البتہ ایک اچھی گاڑی کارپوریشن کے پاس موجود ہے جس میں اس کا بڑا حاکم بیٹھا ہوا ایسے نظر آتا ہے کہ جیسے والئ ملتان ہو، اور ہم خوش ہو جاتے ہیں کہ ہم اپنی مہربان حاکموں کے درمیان سعادت مند رعایا کے طرح زندگی گزار رہے ہیں۔ حاکم بھی خوش ہیں اور رعایا بھی، شہر میں ایم-ڈی-اے بھی موجود ہے جو نئی کالونیوں، سڑکوں اور پارکوں کی تعمیر و زیبائش کے لئے وجود میں آئی تھی، اس ادارے نے سب سے پہلے اپنی کالونی بنائی تاکہ ہر خاص و عام کو علم ہو جائے کہ یہاں ایم-ڈی-اے، جیسا ادارہ موجود ہے، پر اس ادارے پر زوال کے ایسے دن آئے کہ ابھی تک یہ اس انحطاط سے باہر نہیں نکل سکا، اگرچہ اس کے سربراہوں نے اس کا امیج بہتر بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی لیکن اب یہ ادارہ یونین کی سرگرمیوں تک محدود ہو گیا ہے، جو کبھی تنخواہ کے لئے اور کبھی اپنی بقاء کے لئے سرگرمِ عمل رہتی ہے۔ اب حالیہ بجٹ ۹۸-۱۹۹۷ء میں اس ادارے کو خطیر گرانٹ ملنے کا امکان ہے۔ انشاء اللہ امید کی جاتی ہے کہ اس ادارے کے پھر دن بدل جائیں گے۔ پھر شہر میں کالونیاں، راستے، تفریح مقام تعیر ہوں گے۔ پھر کوئی اسی سڑک تعمیر ہو گی جس کے گرد درخت، سبزہ اور خوبصورت ماحول ہو گا۔ سڑک بھی کوشادہ ہو گی، اگر ایم-ڈی-اے کے کرم فرما کسی نہر کو بھی اس سڑک کے ساتھ وابستہ کر لیں بے شک قاسم بیلا کی شجاع آباد نہر، ایسے خوبصورت ماحول کی رفاقت کے لئے تیار ہو جائے تو ملتان کے نوجوان کا گلہ جاتا رہے گا کہ ملتان میں تفریح کی سہولتوں کا فقدان ہے۔ ویسے تو یہاں کے نوجوانوں کو ون ڈے انٹرنیشنل کرکٹ میچ کا بھی گلہ ہے ہزار التجائیں کرنے کے باوجود ایسے میچ کا انتظام نہیں ہوتا، کبھی پورا چندہ اکٹھا نہیں ہوتا اور کبھی گراؤنڈ کی گھاس درست نہیں ہوتی، بہر حال میچ کا نہ ہونا یہاں کے نوجوانوں کو کرکٹ کے ابھرتے ہوئے مستقبل سے مایوس کرتا ہے۔ کبھی جب ہم بچے ہوا کرتے تھے تو ہمارے بزرگ بتایا کرتے تھے کہ وہاڑی روڈ پر ایک سپورٹس گراؤنڈ تعمیر ہو رہا ہے شاید وہ مکمل ہو چکا ہو گا لیکن ہماری لاعلمی کی انتہا ہے کہ ہمیں آج تک پتہ نہیں چل سکا ملتان آرٹس کونسل پر شکوہ عمارت کی صورت میں تعمیر ہو چکی ہے، نامور مصور فرح رحمان کی نادر، خوبصورت پینٹنگ کی نمائش بھی ہو چکی ہے مگر یہ عمارت کیا مکمل ہو چکی ہے اور اس کے اندر جانے کے لئے کون سا صحیح راستہ ہے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

جو ہال کے اندر لے جاتا ہے۔ اس کا تعین ابھی باقی ہے، پُر اسرار راستوں کی یہ عکاس عمارت اپنے مرکزی صدر دروازے کی تلاش میں ہے اس کا افتتاح کون کرے گا اور کون اسے ملتان آرٹس کونسل کی صورت میں ملتان کی ثقافت کا ترجمان بنائے نظریں اس مسیحا اور اس رہنما کی طرف لگی ہیں۔ جو بالآخر یہ نوید سنائے گا کہ صاحبو، آرٹس کونسل کا یہ مرکزی دروازہ ہے، آیئے آپ کو ''جشنِ ملتان'' کی ان تقریبات میں لے جائیں جو ۱۹۶۶ء سے گم ہو گئی تھیں اور اب آرٹس کونسل ملتان نے انہیں دریافت کر لیا ہے۔ ہمارے دوست در محمد خان کو ہم سے گلہ ہے کہ ہم اپنے کالم میں آثار قدیمہ، آرکیالوجی کے بارے میں نہیں لکھتے، ملتان کی ان دفینوں سنگ و خشت کا ذکر نہیں کرتے جو آج بھی ملتان کے اردگرد موجود ہیں، جلیل پور ہو یا ہڑپہ، قلعہ کہنہ ہو یا خطی پور کا وہ پرانا راستہ جو کبھی ملتان سے لاہور اور لاہور سے دہلی تک کی رہنمائی کرتا تھا، ہمارے دوست کا مطالبہ ہے کہ ملتان میں میوزیم کی شدید ضرورت ہے میں اپنے دوست کو کیسے بتاؤں کہ یہاں ٹیلی ویژن سنٹر کی بھی شدید ضرورت ہے۔ ہمارے ایک انتہائی محترم دوست اور شجاع آباد کے مرکزی رہنما سید جاوید علی شاہ ایم این اے کبھی کبھی ٹیلی ویژن کے قیام کی خوشخبری سناتے ہیں اور ہم بھی خوش ہو جاتے ہیں کہ ہمارا یہ نوجوان لیڈر جو وارث شاہ کی شعری لطافتوں سے آگاہ ہے، کبھی نہ کبھی ہمیں ٹیلی ویژن سنٹر دلائے گا۔ دیکھئے کیا گزرے ہے، قطرہ پہ گہر ہونے تک بہر حال ابھی ملتان کو مزید پہچان کی ضرورت ہے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

مائی بھاگاں

اہلِ علم اور اہلِ ہنر کو اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے گلہ رہتا ہے کہ یہ ادارے ان کے کمالات، ایجادات کو مناسب جگہ نہیں دیتے ان کی عملی اور فکری کاوشوں کو اپنے اخبارات میں اس طرح نہیں اجاگر کرتے جس طرح فلم، ٹی وی اور شوبز سے وابستہ آرٹسٹوں کو روزانہ جگہ دیتے ہیں۔ ان پر دستاویزی فلم بناتے ہیں اور ان کی معمولی معمولی باتوں کو اس طرح اونچا کرتے ہیں جیسے یہی معاشرہ کے لئے اور قوم کے لئے رہ گئے ہیں۔ ذرائع ابلاغ کے یہ ادارے عموماً یہی جواب دیتے ہیں کہ ہمیں اپنے قارئین کرام، اپنے ناظرین اور سامعین کے لئے تفریح مہیا کرنی ہوتی ہے اس لئے ان فنکاروں کو اہمیت دینا ضروری ہے۔ عوام تفریح چاہتے ہیں اور ذرائع ابلاغ کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ تفریح کو زیادہ وقت دے۔ اگر ذرائع ابلاغ کا کردار تفریح، تعلیم اور اطلاعات اور ایڈورٹائزنگ کی خدمات سر انجام دینا ہے پھر تعلیم، انفارمیشن اور ایڈورٹائزنگ کو چھوڑ کر صرف Entertainment کے لئے وقف ہو جانا کون سی ترجیح ہے۔ معاشرے میں ان گنت کردار ایسے بھی ہیں جن کے انٹرویو، جن کے فیچر، دستاویزی فلم اور کالم چھپنے چاہئیں مگر اس طرف کس کی نگاہ جائے گی۔

پچھلے دنوں لاہور جانے کا اتفاق ہوا جس دوست کے ہاں قیام تھا انہوں نے ایک صائب مشورہ دیا کہ ایک ایسی شخصیت بھی ہے جس کا انٹرویو ہونا چاہئے۔ میں نے ان سے پوچھا وہ کون ہے؟ کوئی صاحبِ علم، کوئی سیاستدان، کوئی بڑا انتظامی آفیسر یا کسی کلیدی منصب پر فائز شخصیت، کوئی صنعت کار، کوئی بہت بڑا جاگیر دار میرے دوست کا جواب تھا کوئی ایسی شخصیت نہیں مگر اس کے باوجود وہ اپنی ذات میں ایک اعظم و ہمت کی شخصیت ضرور ہے۔ ہمیں اشتیاق ہوا کہ چلو اس شخصیت سے مل لیتے ہیں اور ہم اپنے دوست کے ہمراہ چل پڑے۔ ایک آدھ فرلانگ پر ہمارے دوست ہمیں ایک تنور پر لے گئے۔ کے ایف سی (KFC) اور ہانگ کانگ جیسے ہوٹلوں پر عوام کا رش تو سمجھ میں آتا ہے کہ یہ جدید کھانوں اور Status کا رعب جمانے والے ہوٹل ہیں مگر ایک عام دیسی تنور پر عوام کے ہجوم کو دیکھ کر حیرت بھی ہوئی اور وہاں اس منظر کو دیکھنے کی دلچسپی بھی۔ پروفیسر محمد افضل خان نے بتایا کہ وحدت کالونی کے سارے مرد و زن اس تنور پر ضرور آتے ہیں۔ بعض بڑے بڑے سیکشن آفیسر

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

اسی تنور کی روٹیاں کھا کر ڈپٹی سیکرٹری کے منصب تک جا پہنچے ہیں۔ اس تنور کی روٹی اور دال میں نہ جانے کیا تاثیر ہے جو ایک دفعہ کھالے پھر جدید ہوٹلوں کا رُخ نہیں کرتا۔ یہ تنور سستا بھی ہے اور معیاری کھانوں کا مرکز بھی جو روٹی تنور کے ٹیمپریچر پر پکے تھی اس میں کسی قسم کی کثافت باقی نہیں رہے گی۔ اس تنور کی مالکہ مائی بھاگاں گذشتہ ۲۵ سال سے وحدت کالونی لاہور کے آخری سٹاپ سے پائلٹ سکول کو جانے والی سڑک کے چوک میں تنور پر اپنی خدمات سر انجام دے رہی ہے۔ اس کے کرم فرماؤں کی تعداد وحدت کالونی، امید کالونی اور پاک کالونی تک پھیلی ہوئی ہے اس کے تنور کی دال اور روٹی اپنی لذت میں منفرد ہوتی ہے۔ میں نے اس سارے پسِ منظر کو سامنے رکھتے ہوئے مائی بھاگاں سے پہلا سوال کیا کہ آپ کب سے اس تنور کو چلا رہی ہیں "مجھے تقریباً تیس سال ہو گئے ہیں"

اتنی گرمی میں اور اس موسم کی حدت میں روزانہ تنور پر روٹیاں لگانا کیسے لگتا ہے۔ مائی بھاگاں نے اپنے پروفیشن کے وقار پر پورا اعتماد کرتے ہوئے جواب دیا "کہ جب تنور پر بیٹھ جاتی ہوں مجھے ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے میں کسی اعوان اقتدار میں پہنچ گئی ہوں، میرے اختیارات کسی صدر، وزیر سے کم نہیں ہوتے۔ جب کوئی پانچ چھ روٹیاں مانگتا ہے دال کی خواہش کرتا ہے تو میں انہیں میرٹ پر پہلے آئیے اور پہلے پائیے کی بنیاد پر روٹیاں دیتی ہوں۔ اگر کوئی جلدی کرے تو میں روٹیاں ہرگز نہیں دیتی میں نے کبھی کسی کو ترجیح نہیں دی۔ میرٹ پر روٹی اور دال بانٹتی ہوں اگر کوئی مداخلت کرے تو میں اسے پانے تنور سے انکار کر دیتی ہوں۔ میں تنور کی ایک مرحلہ کی چوتھائی پر واقع اپنی راجہ ھانی میں بالکل آزاد ہوں نا ہی مجھ پر عالمی بنک کا دباؤ ہے کہ میں اپنی روٹی کے اور دال کے نرخ بڑھادوں اور نہ ہی اندرونی پریشر ہے کہ میں اپنے تنور میں کوئی تبدیلی کروں لیکن میں انصاف کرتی ہوں۔ روٹی کے وزن اور دال کی مقدار میں ڈنڈی نہیں مارتی اور نہ ہی راتوں رات امیر بننے کے خواب دیکھتی ہوں اور نہ کبھی اس لالچ میں پڑتی ہوں کہ ایک دفعہ اتنا ہاتھ ماروں کہ آئندہ میری تین پشتیں عیش کریں اور پھر بھی وسائل ختم نہ ہوں۔ میں نے پائی پائی جوڑ کر علامہ اقبال ٹاؤن میں ایک کوٹھی بنائی ہے اور اس کوٹھی ایک حصہ میں چھ دکانیں بنائی ہیں مجھے کرایہ کی صورت میں اتنے پیسے مل جاتے ہیں کہ میں بھی خوش ہوں اور میرا میاں بھی۔ وہ گورنمنٹ کالج وحدت روڈ پر گذشتہ کئی سالوں سے مالی کے طور پر کام کر رہا ہے۔ میں نے اپنے بیٹے کو پڑھا کر پولیس میں

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

بھرتی کرادیا ہے وہ اس وقت تھانہ میں بطور اے ایس آئی کام کر رہا ہے میں نے اس کی شادی کر دی ہے اور اب صرف چھوٹی بیٹی رہ گئی ہے جسے میں نے روٹیاں پکانے اور تنور سے وابستہ امور کو نبٹانے کی ساری مشق کرادی ہے جونہی کوئی اچھا لڑکا نظر آیا اسے ''زیور تنور'' سے آراستہ تربیت سے رخصت کر دوں گی۔''

میرے دوست محمد افضل خاں کا موقف تھا کہ یہ محنت کش، یہ پُر عظم خاتون اپنے خیالات میں اور عمل کیسے یکسوئی رکھتی ہے۔اس کی ذات میں کتنی قناعت ہے اور محنت کے ثمر پر کتنا یقین ہے یہ ڈیوٹی کو ڈیوٹی سمجھتی ہے کبھی چھٹی نہیں کرتی۔ دھوپ چھاؤں میں، موسموں کی حدت اور شدت میں تنور جلاتی ہے۔ کبھی کسی ہڑتال کسی جلوس میں نہیں جاتی۔ اسے بجٹ سے کوئی گلہ نہیں اسے صرف اپنی محنت اور رزق حلال کھانے سے دلچسپی ہے۔ اسے اخبار والوں سے کوئی توقع نہیں کہ وہ اس پر فیچر یا کالم چھاپیں۔ ٹی وی والے سے کوئی امید نہیں کہ وہ اس کی زندگی کو موضوع بنا کر کوئی دستاویزی فلم بنائیں۔ ریڈیو والوں سے بھی کوئی واسطہ نہیں کہ وہ ہوا کے دوش پر اس پر کون سا پروگرام نشر کرتے ہیں۔ مائی بھاگاں کی کائنات صرف اور صرف تنور ہے جس کی آگ تیز ہو جائے تو وہ پانی کا چھٹا دے دیتی ہے تاکہ آگ تیزی نہ پکڑے اور روٹی جلنے سے بچ جائے۔ تنور کب آگ پکڑتا ہے اور روٹی کب جلتی ہے اس کا علم کسی کتاب میں نہیں اور نہ ہی کسی لیبارٹری میں اس کا تجربہ سکھایا جاتا ہے اس کا صرف ایک ادارہ ہے اور وہ ہے مائی بھاگاں۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

جمعۃ الوداع سے حجۃ الوداع تک

حکومت نے دینی حلقوں کی دیرینہ خواہش کا احترام کرتے ہوئے بالآخر جمعۃ الوداع کی چھٹی کا باقاعدہ نوٹیفیکیشن جاری کر دیا ہے اب پہلی دفعہ ۲۱ سال کے بعد ۲۳ جنوری کو جمعۃ الوداع کی چھٹی ہوئی ہے۔ رمضان المبارک کی برکتوں، سعادتوں اور مغفرتوں کو اکٹھا کرنے، سنبھالنے اور حاصل کرنے کا نام جمعۃ الوداع ہے۔ جمعۃ الوداع ماہ مقدس کو الوداع کہنے اور اپنی نسبت کو مستحکم کرنے کا نام ہے۔ تزکیہ نفس اور خیر و برکت اور تعمیر ذات کا نام ہے۔ جمعۃ الوداع کے نام کے ساتھ وہ دن وہ سعادت بھی یاد آتی ہے جب انسانیت کو محسن اعظم پیغمبر اعظم و آخر نے منشور کامل دیا جسے تاریخ حجۃ الوداع کا نام دیتی ہے۔ یہ دن ہمیں ایسے چارٹر سے متعارف کراتا ہے جو U.N.O کے چارٹر سے ہزار درجے ارفع و اعلیٰ ہے جس میں دین متین کی تکمیل اور پوری انسانیت سے روابط کو مضبوط کرنے کا حکم ملتا ہے۔

تاریخ ان لمحوں کو یاد کرتی ہے جب ۲۵ ذیقعدہ ۱۰ھ کو اسلام کے جانثاروں کا قافلہ بیت اللہ کی طرف رواں دواں تھا اور پیغمبر اعظم و آخر اپنے اصحاب ذی وقار کو وادی بہ وادی شعائر اسلام سے آگاہ فرما رہے تھے۔ آپ اپنے دست مبارک کو اٹھاتے اور تکبیر کہتے اور فرماتے "اے اللہ جو تیرے گھر کا حج کرے یا عمرہ کرے اس کی بھی بزرگی، عزت، بڑائی اور عظمت میں اضافہ فرما"۔

۹ ذی الحجہ کا وہ تاریخی دن یاد آتا ہے جب روئے زمین کی پیاسی انسانیت جو رشد و ہدایت سے محروم تھی اسے پہلی بار ایک مربوط، مضبوط امت کا پیغام مل رہا تھا۔ آپ نے اس موقع پر اپنے خطبہ میں فرمایا "اے لوگو! تمہارے خون اور تمہارے مال تم پر حرام ہیں یعنی ناحق کسی کا خون کرنا اور ناجائز طریقے پر کسی کا مال لینا تمہارے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حرام ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح آج یوم عرفہ کے دن ذی الحجہ کے اس مبارک مہینہ میں اس مقدس شہر میں ہیں۔"

"اے لوگو! عورتوں کے حقوق اور ان کے ساتھ برتاؤ کے بارے میں خدا سے ڈرو اس لئے تم نے ان کو اللہ کی امانت کے طور پر لیا ہے۔" آپ ﷺ نے مزید فرمایا۔ "میں تمہارے لئے وہ سامان ہدایت چھوڑ کر جا رہا ہوں اگر تم نے اس ہدایت کو تھام لیا اس سے

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

وابستہ رہے اور اس کی پیروی کرتے رہے تو پھر کبھی تم گمراہ نہ ہو گے۔"

آخر میں وہ مرحلہ بھی آن پہنچا جب Vote of Thanks کا ہونا ہے۔ آپ نے لوگوں سے پوچھا کہ تم قیامت کے دن میرے بارے میں کیا کہو گے کہ میں نے تمہیں اللہ کا پیغام دے دیا ہے یا نہیں۔ سب نے اس بات کی تصدیق کی کہ بالا شبہ آپ نے رہنمائی، تبلیغ، اصلاح کا کام مکمل کر لیا ہے۔ اس پر آپ نے اپنی انگشت شہادت آسمان کی طرف اٹھاتے ہوئے اور لوگوں کے مجمع کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تین دفعہ فرمایا "اے اللہ تو گواہ رہ کہ میں نے تیرا پیام اور تیرے احکام تیرے بندوں تک پہنچا دیئے ہیں اور تیرے یہ بندے اقرار کر رہے ہیں۔"

اسلام کی چودہ صدیاں بیت گئیں اور پندرہویں صدی کے ۱۸ سال ہو گئی ہے۔ اسلام دنیا کے ہر کونے اور ہر خطہ میں پہنچ رہا ہے۔ افریقہ، یورپ، امریکہ، روس اور ان خطوں میں بھی جہاں پہلے کوئی بھی نہیں گیا۔ آج برطانیہ کے بڑے بڑے لارڈ اسلام کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ اسلام تک رسائی حاصل کر رہا ہے۔ امریکہ کی بڑی بڑی ریاستیں اپنے تمام تر تعصب کے باوجود اسلام کی سچائی سے دور نہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اسلام کو پوری دنیا میں غالب کیا جائے۔ مسلم تہذیب کے نقوش عام انسان تک پہنچائے جائیں۔ جو مادی نظاموں سے تنگ آ چکا ہے۔ مادیت کی اندھی قوتوں سے خوفزدہ ہے۔ اندر سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ اسے سکون قلب چاہئے۔ پوری دنیا کی انسانیت جس کرب انتشار سے دوچار ہے اسے حجتہ الوداع کا پیغام ملنا چاہئے۔ مہذب اور تہذیب کا راستہ ملنا چاہئے۔ عدل اور انصاف کی میزان نصیب ہونی چاہئے۔

جمعتہ الوداع سے حجتہ الوداع کا راستہ فلاح اور بھلائی کا راستہ ہے۔ ہمدردی، ایثار اور قربانی کا راستہ ہے۔ سرورِ کائناتؐ فخر موجودات نے فرمایا تھا "تمہارا قریب دور والے کو یہ بات پہنچا دے کیا ہم دین متین کا وہ پیغام دکھی انسانیت تک پہنچا رہے ہیں۔ کیا ہم نے وہ فریضہ سر انجام دیا ہے کہ مظلوموں کو انصاف ملے۔ بے گھروں کو گھر ملے اور معیشت کے بوجھ تلے دبے انسانوں کو اس سود در سود کی لعنت سے نجات ملے۔ کیا ہم دنیا کو وہ تعلیم، تربیت دے رہے ہیں جو انسان کو مسجود ملائک بنانے کی تلقین کرتی ہے۔

جمعتہ الوداع ..... رمضان کی تجلیوں کو سمیٹنے اور انہیں حجتہ الوداع کو عملی شکل

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

دینے کا نام ہے۔ جمعتہ الوداع مل بیٹھ کر ایک ساتھ۔ ایک صف پر بیٹھ کر اللہ کی نعمتوں کو کھانے، شکر بجا لانے کا نام ہے۔ تمیز بندہ و آقا نہیں بلکہ سب ایک ہیں اور ایک ہونے کی اساس تقویٰ ہے۔ رنگ و نسل، حسب و نسب کے تمام امتیازات ختم ہو جاتے ہیں۔ جب سلمان فارسی "ابن اسلام" بن جاتا ہے۔ حجتہ الوداع حضرت بلال کی اذان پر اختتام پزیر ہوتا ہے اور حضرت بلال رنگ و نسب کے امتیازات سے ہٹ کر صرف اور صرف اسلام کا فرزند بن جاتا ہے۔ آیئے ہم بھی جمعتہ الوداع سے حجتہ الوداع کا سفر کریں یعنی نیکی سے نیکی کے چراغ کو روشن کرنے کا سفر۔ تجلیات ذات سے تجلیات کائنات کی حقیقتوں کا سفر جو ہماری پہچان کا سفر ہے۔

ہم نے جمعتہ الوداع کے لئے مسجد کے دروازے پر قدم رکھتے ہوئے احساس کر لیا ہے کہ آج ہماری منزل حجتہ الوداع کی ہے جس میں خون اور مال دوسرے مسلمان کے لئے حرام کر دیئے گئے ہیں۔ ہماری عبادت گاہیں، ہماری سوچ کی راہیں اسی حجتہ الوداع سے عبارت ہوں جس کی اساس پر مسلمان صرف ۲۳ سالوں میں بارہ لاکھ مربع میل پر حکومت کرنے لگے۔ تین براعظموں میں اسلام کی شمع روشن نظر آنے لگی۔ اگر ہم آج اس بنیادی اصول سے آراستہ ہوں تو اسلام دیگر نظاموں اور خطوں میں اس طرح چھا جائے گا جس طرح سچ جھوٹ پر غالب ہو جاتا ہے۔ جمعتہ الوداع سے لے کر حجتہ الوداع سچ کا راستہ ہے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

فالسہ کا جوس - سوانجڑاں کے پھول

جنوبی پنجاب پھلوں اور سبزیوں کے حوالے سے بھی دنیا بھر میں جانا پہچانا جاتا ہے

ہر خطے کی پہچان صرف انسان ہی نہیں ہوتے بلکہ ایسے درخت۔ ایسے پھل اور سبزیاں بھی ہوتی ہیں جو اس علاقے کی شناخت بن جاتی ہے اور اس علاقے کی وجہ شہرت بنتی ہیں ۔ جیسے خانیوال کے خربوزے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ میٹھے ہوتے ہیں لیکن جب کبھی خانیوال سٹیشن سے گزرنے کا اتفاق ہوا اور سنی سنائی بات پر عمل کرتے ہوئے خربوزے خرید لئے تو پہلی بار افسوس ہوا کہ سفر میں چینی رکھنا بھی ضروری ہے۔ اس طرح عارف والے کے خربوزے مارکیٹ میں خوب بکتے ہیں اور ان کے میٹھے ہونے کی روایات سنائی جاتی ہیں لیکن حیرت ہوتی ہے کہ خربوزوں نے رنگ بدلنے کا ہنر تو سیکھا تھا مگر تاثیر سے محروم ہونے کا فن انہیں کہاں سے اور کب سے نصیب ہو گیا۔ تربوز کے میٹھے ہونے اور لال کہلانے اوپر سے سبز اور اندر سے سرخ ہونے کا جو اعزاز دیا جاتا تھا وہ اب صرف کہانیوں تک رہ گیا ہے۔ جنوبی پنجاب کا خطہ خوش نصیب ہے کہ اس کا مزاج میدانی بھی ہے اور صحرائی بھی ہے۔ ایک طرف سرسبز و شاداب خطے ہیں اور دوسری طرف جنگل بیلے اور تھل کے ریگستان ہیں اللہ سلامت رکھے ان نمائندگان کو جنہیں ایسے علاقے الاٹ کرانے کا فن آتا ہے اور جس طرح آباد کرتے ہیں اور فضلیں اٹھاتے ہیں ان کی ترقی کی سمجھ کچھ گہری ہو جاتی ہے۔ اسی صحرائی خطہ میں ایک ایسا پھل بھی ہے جو اس علاقہ کے نامور بزرگ شاعر حضرت خواجہ فریدؒ کو پسند تھا جسے ''پیلوں'' کہتے ہیں پیلوں سے متعلقہ گیت گانے والوں کو خود اندازہ نہیں کہ یہ ''پیلوں'' کیا ہیں ؟ وہ شاید سمجھتے ہیں ''پیلوں'' صحرائی خاتون کا نام ہے جسے حضرت خواجہ صاحب خراجِ عقیدت اور خراجِ محبت ادا کر رہے ہیں۔ ایسا نہیں اس پھل کے بارے اور اس کے جغرافیائی اہمیت سے آگاہ وہ اونٹوں کے قافلے والے ہیں جو جانتے ہیں کہ یہ پھل کن حقیقتوں کو آشکار کرتا ہے اونٹ کو خوراک مالک کو پھل اور اس خطہ کے باسی کو ایسی لکڑی مہیا کرتا ہے جو کبھی اوزار بن جاتی ہے اور کبھی فنون مفیدہ کے ایسے شاہکار پیدا کرتی ہے کہ لوگ عش عش کر اٹھتے ہیں کہ حضرت غلام فرید نے پیلوں سے کیوں اس قدر محبت کا اظہار کیا۔

''پیلوں'' ایک مسکین الطبع درخت ہے جو خشک اور ہواؤں میں زندگی کے دن طے

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

کرتا ہے اور ایسی رومانی داستانوں کو جنم دیتا ہے جو جنوبی پنجاب کی محبتوں اور لازوال دوستیوں سے عبارت ہوتی ہے۔ جنوبی پنجاب ایسے اہی انمول پھلوں، سبزیوں اور کئی گھریلو پکوان بنانے والوں کا خطہ ہے۔ ایک طرف اس خطے کے میٹھے پیڑ ہیں دوسری طرف اچار کے کام آنے والے ''لسوڑے'' ہیں یہ وہ لسوڑے نہیں جو چمٹ جاتے ہیں اور جن سے جان چھڑانا ممکن نہیں ہوتا۔ لسوڑے کی طرح چمٹنے والا محاورہ انہی کی وجہ سے پیدا ہوا ہے اگر بھارت والوں کو پتہ چل جائے تو وہ ''اٹوٹ انگ'' کہنے والی رٹ سے باز آجائیں اور لسوڑے کی طرح چمٹتے چلے جائیں۔

انہی پھلوں میں ایک پھل فالسہ ہے جس کے بارے میں حکماء نے بڑے فوائد بیان کئے ہیں کہتے ہیں کہ یہ وہ پھل ہے جو دل و دماغ کو تقویت دیتا ہے ''ڈی ہائیڈریشن'' سے بچاتا ہے اعصابی تناؤ کو روکتا ہے اس پھل کی ایک ایسی خصوصیت بھی حکماء نے بیان کی ہے جو ہمارے عہد کے ان لوگوں پر بالکل منطبق ہوتی ہے جن کے منہ میں اکثر رال ٹپکتی ہے کسی کو آسودہ حال دیکھ کر خوش نہیں ہوتے کسی کے نفع پر اور کسی کے مال پر ایسے رال ٹپکاتے ہیں کہ آدمی حیران ہوتا ہے کہ انسان اس قدر اور اس حد تک جا سکتا ہے بہر حال ایسے لوگوں کے لئے فالسہ انتہائی مفید پھل ہے یہ انسان کو صبر و شکر سے آشنا کرتا ہے۔

یہ پھل اکثر لوگ ''نمک مرچ'' لگا کر کھاتے ہیں اس سے لطف تو پیدا ہوتا ہے کہ ترش اور نمک کے ملاپ سے دو آتشہ ہو جاتا ہے البتہ ایک فن بھی آجاتا ہے جسے نمک مرچ لگانے کا فن کہتے ہیں بہر حال فالسہ انتہائی مفید اور جنوبی پنجاب کا منفرد پھل ہے اگر حکیم محمد شریف دنیاپور والے زندہ ہوتے تو ان سے اس کے بارے میں مزید پوچھتے مگر حکیم صاحب اس دنیا سے اٹھ گئے اور ان کے ساتھ مفردات پر کتابیں لکھنے والوں کا بھی فقدان ہو گیا۔

فالسہ ایک ایسا پھل ہے جو Sliming Centre کی بھاری فیسوں اور الٹی سیدھی مشینوں کی ورزش سے جان چھڑاتا ہے جوس پیو جوس پیئے جائیں اور سمارٹ اور خوبصورت بنتے جائیں ایسا مفید پھل آپ کو روز روز نہیں ملے گا فالسہ ایک غریب الایار پھل ہے جو نہ کھاد مانگتا ہے اور نہ ہی جراثیم قدادویات، بس ایک دفعہ لگا دیں پھر ہر سال منافع کمائیں ملتان میں تیرہ روپے فی کلو بکتا ہے اور لاہور میں ۱۶ روپے فی پاؤ فروخت ہوتا ہے۔

یہ پھل حساس اتنا ہے کہ اگر اسے آپ مومی لفافے میں لے جائیں تو راستے میں پانی

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

پانی ہو جاتا ہے بے عزتی برداشت نہیں کرتا اسے غریبوں سے پیار ہے دریائی لکڑیوں سے بنی ٹوکریوں میں یہ خوشی خوشی بڑے بڑے شہروں میں چلا جاتا ہے اور مجال ہے کہ اس کی طبیعت ناگوار ہو مگر اس کے ساتھ وابستہ لیبر کے جو اوقات ہیں اس حساس پودے کو بھی پسند نہیں۔ اس پھل کو ٹہنیوں سے توڑنے والی خواتین کو آج کی جدید دنیا میں "لوٹوں کی تعداد" پر مزدوری ملتی ہے مگر یہ خواتین اپنی نمائندہ تنظیم نہ ہونے کی وجہ سے خاموش ہیں کاش کوئی NGO ان خواتین سے ہونے والی بے انصافی پر بھی آواز اٹھائے۔

جنوبی پنجاب کا دوسرا پھل بلکہ پکوان "سوانجڑاں" ہے اس کے پھول پکائے جاتے ہیں اور سبزی کے طور پر کھائے جاتے ہیں اس سبزی میں اگر بکری کا گوشت شامل کر لیا جائے اور اسلام آباد کے کسی مہمان کو کھلا دیا جائے تو وہ کم از کم آپ کو امریکہ کا ویزا ضرور دلا دے گا۔ اس پکوان کی تاثیر اور اس کے لذیذ ہونے کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت کہ مہمان اسے اپنے ساتھ اسلام آباد بذریعہ جہاز لے جاتا ہے اور اپنے عزیزوں اور دوستوں کو کھلاتا ہے اور سب خوب لطف اٹھاتے ہیں اور جنوبی پنجاب کے اس پکوان پر داد دیتے ہیں کہ ملتان تیری عظمتوں کو سلام تیرے فالسے اور تیرے سوانجڑیں سدا پھلتے پھولتے رہیں۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

اللہ کرے سی-بیوروکریسی

اکثر ساستدان اور عوام لفظ بیوروکریسی استعمال کرتے ہیں کہ بیوروکریسی ہمارے کام نہیں کرنے دیتی۔ بڑی منظم ہے۔ سیاستدانوں کو بے بس کر دیتی ہے وہ صرف ٹیلی فون کے سیٹ اور پردوں کے انتخاب تک محدود ہو کر رہ جاتے ہیں اور بیوروکریسی جس طرح چاہتی ہے اپنے اختیارات استعمال کرتی ہے۔ بڑے بڑے منصوبے سرد خانوں کی نذر ہو جاتے ہیں۔ ساری پالیسیاں فائلوں میں دب کر رہ جاتی ہیں اور سیاستدان جب کچھ نہیں کر سکتے تو سارا بوجھ بیوروکریسی پر ڈال کر عوام کی نظروں میں ہیرو بن جاتے ہیں۔ آخر یہ بیوروکریسی کیا ہے جس سے سیاستدان ڈرتے ہیں اور اسے درست کرنے کے دعوے کرتے ہیں اور پھر تھک ہار کر بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ بیوروکریسی کبھی معتوب ہوتی ہے اور کبھی مقبول ہوتی ہے کبھی اس کے خلاف نعرے لگتے ہیں کہ فلاں کو تبدیل کرو کہ عوام کی تحقیر کرتا ہے۔ سیدھے منہ بات نہیں کرتا عوام کا جینا حرام کر دیا ہے پورے شہر کو قبرستان بنا دیا ہے ایسے سخت احکامات جاری کرتا ہے کہ عوام کی چیخیں نکل جاتی ہے اور کبھی تعریفیں ہوتی ہیں کہ ایسا نیک دل عوام دوست افسر کو تبدیل نہ کیا جائے علاقہ کی ترقی کے لئے اس کی موجودگی بڑی ضروری ہے۔ اس کے اعزاز میں دعوتیں ہوتی ہیں۔ خبریں چھپتی ہیں کہ ان کا دورِ حکومت مثالی تھا اور معیاری تھا صحیح بیوروکریسی کیا ہے اس کا مزاج اور کردار کیا ہے اس سے آگاہ کرنا صحافت کی ذمہ داری ہے۔

بیوروکریسی انگریزی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی نوکر شاہی کے ہیں۔ اس کا یہ عاجزانہ ترجمہ کس نے کیا ہے شاید اسے بیوروکریسی کی طاقت کا اندازہ نہ تھا۔ بیورو کے معنی میز اور کریسی کو اصطلاحاً آپ کرسی کہہ سکتے ہیں۔ یعنی ایسے حکمران جنہیں میز، کرسی نصیب ہو یا ایسے مقتدر حکمران جنہیں عوام کے ووٹ کی ضرورت نہ ہو صرف صوابدیدی اختیارات ہوں جب چاہیں استعمال میں لائیں اسی بیوروکریسی سے بیوروکریٹ کا لفظ نکلتا ہے جو بیوروکریسی کو استعمال میں لائے بیوروکریٹ کی شان اس بات میں پوشیدہ ہوتی ہے کہ جس کے چہرے پر مسکراہٹ کا گمان نہ ہو اور اگر خفیف سی مسکراہٹ آ بھی جائے تو وہ اپنے صوابدیدی اختیارات سے اسے بھگا دیتے ہیں۔ بات مختصر کریں گے اگر کوئی زبردستی سنانا چاہئے تو فوراً جھٹک دیں

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

گے کہ وقت ضائع کر رہے ہو کہ تمہیں معلوم نہیں کہ ہمارا کتنا قیمتی وقت ہوتا ہے کہ ضروری نہیں کہ سارے بیوروکریٹ ایسے ہوں خداترس۔ ہمدرد، مخلص بیوروکریٹ بھی موجود ہیں جو دوسرے کے راستے میں بکھرے کانٹوں کو اپنی پلکوں سے چنتے ہیں۔ بیوروکریسی ایسی مخصوص انتظامی یونٹ ہے جسے بہترین دماغ چلاتے ہیں جن کے نوٹ، جن کے ڈرافٹ تیار کردہ سمریاں ان کے فہم و فراست کے شاہکار ہوتے ہیں۔ ان کے نوک قلم سے اختیارات ہی اختیارات ٹپکتے ہیں ان کی طرزِ زندگی پُرکشش اور انداز اتنا حاکمانہ ہوتا ہے کہ عوام کو ان کے قریب آنے کا موقع نہیں دیتا۔ عوام دور سے صرف ان کی زیارت کر سکتے ہیں۔ ایک Distance سے رہنا اور اعوام کو رکھنا یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ اگر اتنی بے تکلفی ہو جائے تو امور سلطنت سرانجام دینا مشکل ہو جاتا ہے اور پھر افسران کا عوام سے مل کر کام کرنے سے کرپشن اور اقربا پروری کا مرض بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ اس لئے ان کو عوام سے اور عوام کو ان سے دور رکھنے کی حکمت یہی بیان کی جاتی ہے۔ انگریزی دور میں اس کا انداز اور تھا لیکن جب پاکستان بنا تو بیوروکریسی نے دیگر شعبوں کی طرح پاکستان کے لئے لازوال قربانیاں دیں ملک میں کوئی انتظامی ڈھانچہ موجود نہ تھا۔ دفتروں میں میز کرسی موجود نہ تھی اس بیوروکریسی کے بغیر، میز کرسی کے نظام چلایا۔ سٹیشنری کے بغیر اپنی جیب سے کاغذ، قلم سے احکامات لکھے۔ نامساعد حالات میں پاکستان کے استحکام کو عملی شکل دی۔ آج کوئی ان پر ہزار تنقید کرے لیکن ان کے یہ کارہائے نمایاں تاریخ کا حصہ بنیں گے۔

انحطاط کہاں نہیں؟ اس انحطاط کے سائے بیوروکریسی پر بھی پڑے ہیں۔ اگرچہ ''صاحب بہادر'' اور "Your Obedient Servant" کے لفظ متروک ہو گئے ہیں۔ بیوروکریسی کو عوام کا خادم بنایا گیا ہے مگر تمیز بندہ و آقا کا نظام تبدیل نہیں ہو سکا۔ بیوروکریسی نے اپنے مزاج میں کچھ لچک پیدا کی مگر تنقید سننے کا حوصلہ پیدا نہ کر سکی۔ برہمی کا اظہار اور مخالف رائے کو دبانے کا شوق اس کے اندر سے نہ نکل سکا۔ اگر کسی نے اصلاح احوال کی ضرورت محسوس کی تو اسے حکومت پر تنقید سمجھا گیا اور بیوروکریسی نے اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کئی ایسے لیبل لگوائے کہ اس آدمی کا معاشرے میں جینا محال ہو گیا اور ان سختیوں کا جواز یہ پیش کیا کاروبار مملکت چلانے کے لئے کچھ لوگوں پر سختیاں کرنی پڑتی ہیں مگر مجموعی نتائج اچھے تو اس سے بیوروکریسی کے وقار میں اضافہ ہوتا ہے اور حکومت کا نظام بھی درست

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

چلتا ہے مگر ایسا کیسے ممکن ہو جب صاحب دفتر میں نہ ہوں۔ میٹنگ میں رہتے ہوں اور اگر میٹنگ سے فارغ ہوں تو لنچ اور ڈنر انہیں سکھ کا سانس لینے نہ دے تو امور مملکت کیسے چلیں گے ؟

ان کو ملتی ہی نہیں لنچ اور ڈنر سے فرصت
حال دل ان کو سنانے کی ضرورت کیا ہے
دردِ دل کھانے کو ہے خونِ جگر پینے کو
اور تفصیل میں جانے کی ضرورت کیا ہے

پھر وزیروں کے دورے انہیں مصروف رکھتے ہیں اور سائل نئی تاریخ لے کر دورہ افتادہ گاؤں میں چلا جاتا ہے اور پھر انصاف کی راہیں دکھاتا رہتا ہے جب نئی تاریخ ملتی ہے تو مقدمات کی بھرمار اس کا نمبر ہی آنے نہیں دیتی۔ Justice delayed justice dinied

اگر انصاف میں تاخیر ہو جائے تو انصاف کرنے سے انکار ہو جاتا ہے اور دوسری طرف سے جواب آتا ہے کہ ایسا نہیں تاخیر ہی درست ہے تاکہ انصاف صحیح ہو جائے۔ جلدی کے فیصلے ابہام پیدا ہوتے ہیں۔

Hurried justice burried اس لئے سرخ فیتا دریافت کیا گیا تاکہ جی بھر کر تاخیر کی جائے۔ عوام کو دفتروں کے اس قدر دھکے پھیرے لگوائے جائیں کہ انہیں احساس ہو جائے کہ انصاف کا حصول ایک Painful Act ہے۔

ممکن ہے ماضی میں ایسا ہوتا ہو مگر اب خدا کے فضل سے ہمارا اپنا ملک ہے۔ اپنے عوام ہیں اور اپنے حاکم ہیں اور اپنی پیاری معصوم سی بیوروکریسی ہے۔ اس لئے ہماری توقعات بھی زیادہ ہیں۔ ہم عدل گستری کا وہ طریقہ اختیار کریں جس سے لوگوں کو بروقت انصاف مل سکے۔ دفتروں میں جلد کام ہو سکے۔

کئی کئی گھنٹے بھوک، پیاس اور دھوپ کی حالت میں انتظام نہ کرنا پڑے۔ مظلوم کی دادرسی ہو سکے اور مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچایا جا سکے۔ اگر ہماری بیوروکریسی درد کے اس احساس سے آگاہ ہو جائے اور تربیت میں بھی اس جزو کو شامل کر لیا جائے تو فلاح اور خیر کا معاشرہ وجود میں آجائے گا جس میں افسر عوام کی خدمت کرتا نظر آئے گا۔ عوام کا نمائندہ صاحب کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ کر اعتماد سے کہہ سکے گا کہ جناب میں آپ کے ضلع کا ایک

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

باشندہ ہوں اور افسر اس پر خوشی کا اظہار کر کے کہے گا کہ مجھے آپ کی خدمت کر کے خوشی محسوس ہو رہی ہے۔ میرے دروازے آپ کے اپنے دروازے ہیں آپ کے ٹیکس کی آمدنی سے بنے ہیں یہ دفتر۔ یہ کار، یہ کوٹھی، آپ کی ہے کہ آپ کے خون پسینے سے تعمیر ہوئی ہے میں اس میں چند روزہ مسافر ہوں مجھے آپ کی خدمت کے لئے تعینات کیا گیا ہے۔ جب تک آپ خوش ہیں اور میں آپ کے اعتماد اور توقعات پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا تو آپ بھی مجھے قبول کریں اگر آپ سمجھیں کہ میں انصاف میں، عدل میں، اپنے فرائض کے انجام دہی میں کوتاہی کا مرتکب ہو رہا ہوں آپ میری کھلی کچہری میں مجھ پر تنقید کریں میں اپنا تبادلہ کرالوں گا یا حالات کو ٹھیک کر لوں گا۔ مجھے احساس ہے کہ اب برطانیہ کا راج نہیں نہ ہی وہ روایتی بیوروکریسی ہے اب تو اللہ کریسی ہے کہ جس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا کہ میں لوگوں کی دعاؤں سے پہلے ان کے مسائل حل کر لوں کہ جب وہ اللہ تعالیٰ سے کچھ مانگتے تو گویا میری کارکردگی کی شکایت ہوتی ہے کہ میں نے ان کے مسائل حل کرنے میں کوتاہی کی ہے۔ اللہ کریسی دراصل اس روایتی کریسی کو مشرف بہ اسلام کرنے کا عزم ہے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

کیا ملتان میں احمد شاہ ابدالی کا کوئی ولی وارث نہیں ؟

ملتان تاریخی یادگاروں کا شہر ہے اس کے سنگ و خشت عظمت رفتہ کے افسانے تازہ کرتے ہیں یہاں کے مقابر ، مساجد ، خانقاہیں ، سرائیں ، فصیلیں ، دمدمے ، گزرے ہوئے ایام کی شان و شوکت اور ان میں بسنے والے انسانوں کے سوز دل کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔

کسی شاعر نے کیا خوب ارضِ ملتان کی عظمتوں کو اجاگر کیا ہے۔

ارض ملتان ، تیرے لاڈلے جانبازوں نے
اپنی شمشیر سے روکے تھے سکندر کے قدم
ان قبائل کے مقدر میں تھی ہر چند شکست
تیغ یونان کی یہیں آب ہوئی تھی مدہم
تیرے محلوں ، تیری فصیلوں نے کبھی
اہلِ غزنی سے بھی افسانہ شمشیر سنا
کبھی نادر ، کبھی غوری کبھی بن قاسم سے
نعرہ وحدت حق نعرہ تکبیر سنا

جائے پیدائش احمد شاہ ابدالی امیر افغانستان انہی یادگاروں میں شامل ہے ملتان کا ابدالی روڈ اس تاریخی شاہراہ کی مناسبت رکھتا ہے۔

کمشنر ہاؤس کے عین سامنے جائے ولادت احمد شاہ ابدالی قومی اسمبلی کے توجہ طلب نوٹس کی طرح موجود ہے۔ ہر روز اس سڑک سے کئی صحافی ، کئی ریڈیو سے وابستہ پروڈیوسر اور کئی ٹیلی ویژن کے نمائندے گزرتے ہیں۔ کئی سرکاری و غیر سرکاری افسر اس راستے سے ہالیڈے ان اور کینٹ کی طرف جاتے ہیں مگر کبھی کسی نے اس طرف دھیان ہی نہیں کیا کہ یہ چھوٹی سی یادگار اپنے اندر کتنی شکائتیں اور حکائیتیں لئے موجود ہے۔

اس یادگار کو سب سے بڑی شکایت اپنے سدوزئی خاندان کے افراد سے ہے جنہوں نے کبھی اس یادگار کو اہمیت ہی نہیں دی۔ اس عمارت کی شکل مسخ ہو رہی ہے اور کوئی کوئی نہ کوئی کسی دوائی بیچنے والے کا اشتہار چسپاں ہوتا ہے۔ کہیں نہ کہیں کوئی نئی تحریر لکھی ہوتی ہے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

اینٹین بوسیدہ ہوتی جارہی ہیں عمارت کی لوح کی تحریر کے کئی لفظ اکھڑ گئے ہیں۔

یہ یادگار اپنے خاندانوں کے دانشوروں کو دعوتِ فکر دے رہی ہے کہ میں نے تمہیں ملتان کی حکومت دی سرسبز وشاداب کھیت اور کھلیان دیئے پر شکوہ عمارات دیں میرے نام سے تمہاری پہچان ہے مگر تم نے مجھے کیا دیا کہ ایک معمولی سی جائے پیدائش کی دیکھ بھال بھی نہ کر سکے۔

ایک آدھ اشتہار اتارنے کی توفیق نہ مل سکی ایک مختصر جنگلا ایک خوبصورت پارک ایک مختصر تاریخ اس یادگار سے وابستہ ہو لکھوا دیتے کہ اس یادگار کا مالک کتنا جلیل القدر تھا جس نے سدوزئی خاندان کو اتنا مقام دلایا۔

ابدالی خاندان کی پہچان کرائی۔ بلکہ بعض مقتدر شخصیات نے اپنے گھروں کے باہر احمد شاہ ابدالی کی مناسبت سے ''ابدالی ہاؤس'' کے بورڈ لگوائے مگر اس یادگار کو ایسے بھول گئے جیسے ان سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔

حالانکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ یہاں غیر ملکی سیاحوں کے لئے انگریزی، اردو اور فارسی میں خوبصورت تحریر ہونی چاہئے جس میں احمد شاہ ابدالی کی پیدائش سے لے کر کارہائے نمایاں کا ذکر ہوتا کہ پڑھنے والا اندازہ کر سکے کہ وہ کسی اہمیت کی یادگار پر حاضر ہے صرف جائے پیدائش اور امیر افغانستان کے الفاظ کافی نہیں۔

جائے پیدائش احمد شاہ ابدالی کے سامنے تبلیغی جماعت کی مسجد ہے۔ وہاں سے کئی نوجوان، بزرگ تبلیغ اسلام کے لئے قافلوں کی صورت گزرتے رہتے ہیں کبھی ان کی نگاہ اس عظیم تبلیغی پر نہیں گئی جو کابل و قندھار کے دور دراز علاقوں میں اسلام اور عالمِ اسلام کی بالا دستی کے لئے گھوڑے کی پشت پر بیٹھے سفر کی صعوبتیں برداشت کرتا تھا۔

ایک بار نہیں، کئی بار ملتان اور دہلی کے مضافات میں اسلام کو ایک قوت بنانے کے لئے سرگرم عمل تھا۔

ملتان کی تاریخی فضیلتوں پر جانثار ہونے والوں کو علم ہونا چاہئے کہ احمد شاہ ابدالی کو ملتان سے بے حد لگاؤ تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ملتان میں پیدا ہوئے اور ساتھ سال تک ملتان میں رہے۔ بچپن کے دن یادوں کا حسین سرمایہ ہوتا ہے

دوسرا وہ ملتان اور ہندوستان میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کی دعوت پر آئے کہ یہاں ہندو

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

آمریت اور ظلم کا خاتمہ ہو اس اعتبار سے انہوں نے بر صغیر میں پاکستان کے لئے اساس فراہم کی اور ہندوؤں کے ظلم و ستم سے مسلمانوں کو نجات دی۔

آج یہاں ان کی یادگار ہے اس علاقے میں کئی شاندار دفاتر کوٹھیاں اور بینک موجود ہیں سب کی تعمیر بہتر ہے سوائے ان کی یادگار کے۔

پوری سڑک پر پسماندہ اور توجہ سے محروم عمارت احمد شاہ ابدالی کا کوئی ولی وارث نہیں۔ اس عمارت کا کسی سے کوئی تعلق نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔

اگر حق شفع کا قانون موجود ہے تو پھر سب سے فائق حق جناب ہر دلعزیز کمشنر ملتان ڈویژن جناب محمد عامر خان کا ہے۔ وہ اس عمارت کے سب سے قریبی ہمسائے ہیں۔

جناب کمشنر! علم دوست، تہذیب و ثقافت سے لگاؤ رکھنے والی شخصیت ہیں یقیناً اس عمارت کی فرسودگی پر انہیں رنج ہو گا ان سے ادب سے غرض ہے کہ وہ اپنے خصوصی اختیارات سے اس اہم تاریخی عمارت کو ایک خوبصورت جگہ ایک دلکش لان دلوادیں تاکہ یہ جگہ دوسروں کی نظروں میں رعنائی اور دلچسپی کا باعث بنے۔

احمد شاہ ابدالی کے خاندان کے تین بزرگ ایسے بھی ہیں جو اس ضمن میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ جناب محمد سلیم خان سدوزئی جو چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری کے صدر رہ چکے ہیں جناب عمر کمال خان ایڈووکیٹ ایک محقق اور دانشور ہیں بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان کے وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر عاشق محمد خان درانی جن کا احمد شاہ ابدالی سے صدیوں کا رشتہ ہے یہ ہستیاں مل کر اس مقام کو تاریخ کا وہ نقطہ بنا سکتے ہیں جو تحریک پاکستان کی منزل بنا۔ جس نے مرہٹوں کو شکست دی جس نے ۱۱۶۵ھ میں ملتان پر اسلامی حکومت قائم کی۔ جس نے کوژامل کو اور اس کی آمریت کو ختم کر کے عام انسانوں کو عافیت اور امان دی۔

جو اسلام کے لئے اور دین متین کے لئے گہرا جذباتی لگاؤ رکھتا تھا وہ بر صغیر پاک و ہند میں اسلام کو ایک قوت دیکھنا چاہتا تھا آج اس کی جائے پیدائش بے بسی اور لاوارثی کی علامت ہے۔

کیا ہم اپنے بزرگوں سے اور اپنے اثاثہ اور ورثہ سے یہی محبت کرتے ہیں؟

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

"ہور کی حال اے"

ہر زبان کی اپنی چاشنی ہوتی ہے۔ لفظوں میں مخصوص نکھار ہوتا ہے پنجابی بھی اس میدان میں پیچھے نہیں۔ اس میں نکھار اور پیار دونوں موجود ہیں۔ اور خاص طور پر ایسے جملے، ایسے الفاظ کبھی نہیں بولتے مثلاً آگے تیرے بھاگ لچھیئے۔

منڈا ویکھ لے کبوتر ورگا

کچھ اس قسم کا حال اس جملے میں بھی موجود ہے "ہور کی حال اے" یعنی اور کیا حال ہے اور پھر جال اتنا لمبا ہو جاتا ہے کہ اگر تحریر میں ہو تو دفتر کے دفتر بھر جائیں اور اق ختم ہو جائیں اور اگر تقریر میں ہو تو جہاں مواد ختم ہوا تو روائتی مقرر کی طرح "ہاں تو میں کہہ رہا تھا" اور مقصود یہی ہوتا ہے "ہور کی حال اے" یعنی جملے جوڑنے اور ٹوٹے سلسلوں کو بحال کرنے کا یہی انداز ہے۔ گرمی ہو یا سردی آندھی ہو یا طوفان ان جملوں کا وزن کم نہیں ہوتا اور اگر حسنِ اتفاق سے اس جملہ کا استعمال ٹیلی فون پر ہو جائے تو اس جملے کی طوالت زلف زنجیر سے کم نہیں ہوتی اگر کسی کو دعویٰ اختر شماری کا ہو یا ریاضی دان ہونے کا ہو تو وہ استعمال ہونے والے جملوں کی طوالت کو شمار کر کے بتا دیں تو ہم ان کے علم اور ان کے تجربہ کے قائل ہو جائیں گے۔ مگر ایسا ممکن نہیں ؟ٹرگنو میٹری، جیو میٹری، ریاضی اور کیلولیس کی مہارت اپنی جگہ مگر "ہور کی حال اے" کی وسعت اپنے اندر جہان معنی سمیٹے ہوئے ہے۔

ملتان کی گرمی جو ملتان کو Burning Desert ہونے کا درجہ دیتی ہے۔ کمرے کی لائٹ چلی جائے۔ بجلی کے پنکھے چلنے بند ہو جائیں آدمی پسینہ پسینہ ہو جائے مگر "کی حال اے" کی بات ختم نہیں ہوتی۔ ٹیلی فون کا بل جس قدر بڑھ جائے ضروری کالیں کتنی رک جائیں۔ ٹیلی فون فنی خرابی سے کٹ جائے مگر "کی حال اے" کا ابلاغ ختم نہیں ہوتا۔ "ہور کی حال اے" کے جملے میں نا جانے وہ کون سی لذت پوشیدہ ہے کہ جس شخص کے ہتھے یہ جملہ چڑھ جائے تو وہ باتوں میں غنی اور قلم کا دھنی بن جاتا ہے۔ گفتگو کی لذت تکلم کا انداز آجاتا ہے۔ لوگ عش عش کر اٹھتے ہیں کہ جس سلیقے سے اور وقت کا استعمال ہو رہا ہے۔ وقت گزرتا جا رہا ہے اور حسن کلام میں نکھار آتا جا رہا ہے۔ جہاں جملے میں بے ربطی پیدا ہوئی وہیں سے ٹھک سے یہ آواز آئی۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

"ہور کی حال اے"

آموں کی پیٹیاں ہوں یا کپاس کا بھاؤ ہو آٹے کا بحران ہو، ٹیلی فون کی کال طویل سے طویل تر ہو جاتی ہے اگر کسی PCO سے بات ہو رہی ہو تو دوسرے آدمی کی ٹرین پکڑنی ہو یا جہاز کی سیٹ محفوظ کرانی ہو کچھ بھی ہو جائے۔ ٹرین جا سکتی ہے جہاز کی سیٹ رہ سکتی ہے مگر کیا مجال ہے کہ "ہور کی حال اے" سے شروع ہونے والی گفتگو اختتام پذیر ہو جائے۔ وارث شاہ نے ہیر وارث شاہ لکھی تو لوگوں نے کہا کہ لافانی شاہکار ہے مگر وارث شاہ کو اس ابلاغ کا علم ہوتا تو ہیر وارث شاہ پر طبع آزمائی کرنے کی بجائے "ہور کی حال اے" کی رومانی اور طولانی مفہوم کو بیان کرنے پر ترجیح دیتے ہیں۔

ایک موقع پر کہا گیا ہے کہ "قسم ہے زمانے کی کہ انسان خسارے میں ہے" زمانے کی قسم اٹھانے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی کہ کوئی شخص وقت ضائع نہ کرے کہ وقت ضائع کرنے والا خسارے میں ہے لیکن ٹیلی فون کی کال کرنے والا جس قدر چاہئے وقت ضائع کرے نہ سنانے پر ٹیلی فون کا گھاٹا ہوتا ہے اور نہ سننے والے کی قوت سماعت متاثر ہوتی ہے۔ ایسے ٹیلی فون اس حقیقت سے بھی ماورا ہوتے ہیں جس میں کہا گیا ہے "یک لحظہ غافل گشتم صد سالہ راہم دور شد" ایک لمحہ غافل ہو جاؤں تو اپنی راہ سے دور ہونے کا احتمال رہتا ہے مگر نہیں معلوم کہ ٹیلی فون کی کال کرنے اور بار بار موسم کا کیا حال ہے آم کا کیا بھاؤ ہے۔ بچے کیوں رو رہے ہیں۔ آج سبزی کیا پکائی ہے۔ کپڑے کہاں سے خریدتے ہیں میک اپ کا سامان کہاں سے ملتا ہے۔ اور پھر گفتگو میں وقفہ ڈالتے ہوئے کہیں گے۔

"ہو کی حال اے"

کیا یہ ممکن نہیں کہ جس طرح نپولین بوناپارٹ نے ڈکشنری سے لفظ ناممکن (Impossible) کو نکال دیا تھا۔ ہمیں بھی اپنی قوم کو اکیسویں صدی کے تقاضے سنبھالنے کے لئے اور زمانے کی رفتار سے ہم رکاب ہونے کے لئے اپنے کلام سے اور اپنے بیان سے اس جملے کو نکالنا پڑے گا۔ تاکہ ہم ترقی کر سکیں اور وقت کی قدر کر سکیں اور ایک دوسرے کو یہ کہنے سے جان چھڑا سکیں۔

"ہور کی حال اے"

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

جنوبی پنجاب میں صحافتی اقدار کا جائزہ

ملتان میں دوروزہ جرنلسٹس ورکشاپ کی رسم افتتاح آج جناب مجید نظامی ادا کرینگے

بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان کے شعبہ ابلاغیات اور ایف ای ایس اسلام آباد کے باہمی اشتراک سے ملتان میں جنوبی پنجاب کی تعمیر و ترقی اور جمہوریت کو درپیش مشکلات کے حوالے سے دوروزہ جرنلسٹ ورکشاپ منعقد ہو رہی ہے جس میں مختلف اضلاع سے نامہ نگار، مختلف ذرائع سے تعلق رکھنے والے نمائندے، ریڈیو، ٹیلی ویژن کے حضرات شرکت کر رہے ہیں۔ اس اہم قومی ورکشاپ کا افتتاح جناب مجید نظامی چیف ایڈیٹر روزنامہ نوائے وقت کریں گے۔ یہ خوش قسمتی ہے کہ ورکشاپ میں اٹھائے جانے والے نکات پر جناب مجید نظامی اس حوالہ سے اتھارٹی ہیں کہ وہ اے پی این ایس کے صدر بھی ہیں اور ملک کے قابلِ قدر صحافی بھی ہیں۔ اس حوالہ سے ان کی خدمات کا دائرہ کم و بیش نصف صدی کے ماہ و سال پر محیط ہے۔ انہوں نے صحافت کو ملک میں مضبوط کرنے اور اس کی اقدار کی اٹھان میں جو عہد ساز کردار ادا کیا ہے اس کی قدر و قیمت میں اہلِ صحافت نہ صرف باخبر ہیں بلکہ احسان مند ہے۔ اس کے علاوہ اس ورکشاپ میں جنوبی پنجاب کی غربت، ناخواندگی، معاشی اور معاشرتی استحصال پر خصوصی مقالے پڑھے جائیں گے اس۔ اور جمہوریت کو درپیش مشکلات کا جرئزہ لیا جائے گا اور خاص طور پر ایسے خطوں میں جہاں عوام کی تنقیدی صلاحیتیں اس حد تک بیدار نہیں ہوئیں جو دیگر ترقی یافتہ خطوں میں موجود ہیں۔ اس خطے کے لوگ غربت، افلاس اور پسماندگی کی وجہ سے لفظوں کے ہیر پھیر، خوشنما اور خوش اداد عوؤں میں آسکتے ہیں اس لئے جمہوریت کی اقدار کو استحکام دینے اور انہیں ان علاقوں میں موثر کردار ادا کرنے کے لئے ایک خوشگوار اور قابلِ عمل فضا پیدا کرنی ہے یہ دوروزہ ورکشاپ نہ صرف اخبارات کے کردار کو موثر بنائے گی بلکہ اس خطے میں اخبارات کے پھیلاؤ اور ذرائع ابلاغ کے نمائندوں کی بہتر جانکاری میں تعاون کرے گی۔ خاص طور پر الیکٹرانک میڈیا ان خطوں میں کسی سطح کا انقلاب لا سکتا ہے اور شعور واگہی کے لئے کیا وسائل پیدا کر سکتی ہے۔ اس حوالہ سے ڈاکٹر صبور غیور کے پُر مغز مقالے اس ورکشاپ میں سوچ کی اساس کو مضبوط کریں گے اور ملتان میں قائم ذرائع ابلاغ

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

کے ادارے، ان کے نمائندے اور بہتر اپنی کارکردگی سے ملتان اور جنوبی پنجاب کی محرومی کی آواز اٹھائیں گے۔ ایسے پروگرام پیش کریں گے جن سے یہ علاقے وطن عزیز کے دیگر خطوں کے ہم پلہ ہو سکیں گے۔

صحافتی روایات اور ملتان

مدینتہ الاولیاء ملتان کو صحافتی دنیا میں ایک خاص مقام حاصل ہے یہاں سے کئی روز نامے، ہفت وار اخبار اور مہانہ اخبارات ورسائل شائع ہوتے ہیں۔ صحافتی انڈسٹری میں ملتان کو ایک تروتازہ نرسری کا درجہ حاصل ہے جس طرح مغرب میں کاؤنٹی پیپرز شائع ہوتے ہیں اسی طرح ملتان سے کئی مقامی علاقائی پرچے باقاعدگی سے جاری ہوتے ہیں اوران کی سرکولیشن بھی قابلِ قدر ہے۔ یہ تحقیقت قدیم سے لے کر آج کے پرچوں کے بارے میں ہے مقصود کسی پر تنقید کرنا نہیں بلکہ ان کی اشاعت کو بڑھانا اوران سے وابستہ توقعات کو پورا کرنا ہے۔

ملتان میں صحافت کی روایت

اسی پس منظر میں ملتان کی صحافت کی ارتقائی تاریخ سامنے آتی ہے۔ رشید احمد صدیقی نے کیا معنی خیز بات کہی ہے کہ "ادب خواہ کسی ملک یا قوم کا ہو بڑے ذہن کے اچھے لمحوں یا تجربوں کا موزوں اظہار ہے۔ دنیا کتنی ہی تیزی سے آگے کیوں نہ بڑھ رہی ہو انسان کا ذہن ہمیشہ اس سے آگے ہوتا ہے۔ انسانی ذہن اپنے کارنامے پیچھے چھوڑتا ہوا آگے بڑھتا ہے اور ان کارناموں میں نہ پناہ لیتا ہے اور نہ ان کو پناہ دینے کی خواہ مخواہ کوشش کرتا ہے۔ اچھے اور بڑے کارنامے اپنی حفاظت خود کرتے ہیں۔"

ملتان کی صحافت بھی کچھ انہیں اثاثوں سے عبارت ہے۔ ملتان میں باقاعدہ صحافت کا آغاز ۱۸۵۲ء میں اردو کے مایہ ناز انشا پرداز منشی مہدی حسین جنہوں نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز دریائے نور لاہور کے پرچہ سے کیا اور اسی تجسس کی بنیاد پر ملتان سے "ریاض نور" پرچہ نکالا۔ ریاض نور کے ڈیڑھ سال بعد فقیر غلام نصیر الدین نے ملتان سے اپنا اخبار شعاع الشمس جاری کیا اور یہ دونوں پرچے اپنی صحافتی خدمات سرانجام دیتے رہے اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ہنگامہ آرائیوں میں دب گئے۔ ملتان سے دوسرا پرچہ ہفت روزہ کی شکل میں "شمس" ۱۹۲۲ء میں جاری ہوا۔ اس کے مدیر اسد ملتانی تھے جو مایہ ناز شاعر بھی تھے۔ اسد ملتانی کے بعد ان کے بھائی محمد اکرم خاں نے اسے جاری رکھا اور آج بھی یہ پرچہ جاری وساری ہے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ملتان میں اس وقت پریس کلب ملتان اور دفتر تعلقات عامہ کی فائلوں سے جن پرچوں کا پتہ چلا ہے ان کی تعداد اس وقت تقریباً ۲۰۰ کے قریب ہے اور ان کے وابستہ صحافیوں کی تعداد سینکڑوں میں پہنچتی ہے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ابھی راکھ میں چنگاریاں باقی ہیں

مسئلہ مقامی سطح کا ہو یا قومی سطح کا۔ بات قومی یک جہتی کا ہو یا صوبوں کے اختیارات کی ہو بات مقامی سطح کی ترقی کی ہو یا پورے نظام کی بہتری کی ہو۔ غرض یہ کہ مہنگائی سے لے کر غربت و افلاس تک بات جہاں کی ہو اور جس سطح کی ہو ہم اس کے حل کے لئے پریشان رہتے ہیں۔ ہم پریشان کیوں رہتے ہیں؟ اس کا ہمیں خود بھی اندازہ نہیں ہماری پریشانیاں کچھ ہماری خود پیدا کردہ ہے اور کچھ پریشانیاں ہمیں ماحول نے اس لئے دی ہیں کہ ہم ان کا مل جل کر حل نکالیں۔ اس ناخن تدبر کو تلاش کریں جس سے مسئلے حل ہوتے ہیں اس سوچ کو زندہ کریں جو تجویز سے پہلے اس کی تکمیل کے لئے کوشاں ہوتی ہے۔ پچھلے دنوں ہم نے ملتان کی مقامی انتظامیہ کو جائے پیدائش احمد شاہ ابدالی کی زبوں حالی کی طرف توجہ دلائی ابھی لفظوں کی روشنائی خشک نہیں ہوئی تھی کہ جائے پیدائش احمد شاہ ابدالی پر میونسپل کارپوریشن کی گاڑیاں عملہ اور افسران وہاں موجود تھے اور سارے شہر نے یہ منظر دیکھا کہ آثارِ قدیمہ جو ملتان کی پہچان ہیں ان کے محافظ میدان میں آگئے ہیں۔ احمد شاہ ابدالی کی جائے پیدائش کے تمام پہلوؤں کو خوبصورتی سے درست کیا گیا اگرچہ ابھی جنگلہ اور احمد شاہ ابدالی کی شخصیت اور ان کے کارناموں کی تحریر باقی ہے جنگلہ تو سرکار تعمیر کرادے گی مگر تحریر کون آویزاں کرے گا؟ اس کام کے لئے بالآخر ان کے خاندان کے افراد کو سامنے آنا چاہئے ہر قوم، ہر قبیلہ اور ہر خاندان اپنے سربراہ پر فخر کرتا ہے کہ اس کے کارنامے ان کے خاندان کی پہچان بنتے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم سدوزئی خاندان کے افراد اپنے بزرگ (احمد شاہ ابدالی) سے اپنا تعلق جوڑنے میں کیا عار محسوس کرتے ہیں ایسے بزرگ صدیوں بعد پیدا ہوتے ہیں ان کی ذات پر اور ان کے کارناموں پر قومیں فخر کرتی ہیں۔ ہمیں نہ جانے کیوں شرم محسوس ہوتی ہے۔

بہر حال ابھی بادلوں میں بجلیاں باقی ہیں۔ مایوسی نہیں۔ امید کی کرن موجود ہے۔ اس امید کی کرن کو قلعہ کہنہ کی قدیم دیواروں، دمدموں اور غاروں کی طرف لے جانا چاہتا ہوں اور کھنڈرات میں اس روح کو تلاش کرنا چاہتا ہوں جو میاں محمد شفیع ناظم بلدیہ ملتان کی صورت میں موجود ہے جس نے پہلے پہل اس قلعہ کو اور اس کی گرتی دیواروں کو سہارا دیا پھر محترم جناب محمد عامر خاں صاحب کمشنر ملتان کی اس کاوش کو تلاش کر رہا ہوں جنہوں نے

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

اپنے عہد میں اسے دوبارہ رنگ و نور بخشا اس سے پہلے کہ یہ رنگ و نور بکھر جائے اسے مضبوط اور سنبھالنے کی شدید ضرورت ہے۔ ہم ملتان کو تاریخ کا وہ شہر لکھتے ہیں جو گذشتہ ساڑھے پانچ ہزار سال سے زندہ ہے۔ آباد اور شاد ہے اور ہمارے اس دعویٰ کی دلیل صرف اور صرف قلعہ کہنہ ابن قاسم باغ ہے جس کے کھنڈرات اور آثار ہمارے دعوی کی تصدیق کرتے ہیں کہ واقعی یہ تاریخ برصغیر کے دیگر شہروں پر اپنی قدامت اور تاریخی عظمت کی وجہ سے برتری رکھتا ہے۔ قلعہ کہنہ کے در و دیوار، دمدمہ اور اس کی ساتھ کی عمارتیں ہماری فوری توجہ چاہتی ہیں۔ اس کے لئے میونسپل کارپوریشن کے ایڈمنسٹریٹر کی ذمہ داری ہے کہ وہ حکام بالا کو احساس دلائیں کہ یہ تاریخی ورثہ کی اگر اب حفاظت نہ کی گئی تو ملتان کی پہچان گم ہو جائے گی اس کے لئے عالمی اداروں کو احساس دلانے اور ان سے امداد حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ ایشین ڈیویلپمنٹ بنک اگر ڈیرہ غازیخان کے درختوں کو بچانے کی کوشش کر سکتا ہے تو ملتان کے آثار و صنادید کو بچانے کا ہم انہیں خیال کیوں نہیں دے سکتے۔ موہنجوڈارو پر ساری توجہ ہو سکتی ہے جو اب کھنڈرات پر مشتمل ہے اور جو شہر آباد ہے اور قلعہ کہنہ پر جس کی زندگی کے آثار نمایاں ہیں اسے مسلسل فراموش کرنا عقل و دانش کے خلاف ایک اقدام لگتا ہے۔ ملتان کسی طرح بھی موہنجوڈارو سے کم نہیں بلکہ یہ ہم عصر شہر ہے اور اب جو اسے مدینہ اولیاء ہونے کا شرف ملا ہے اس کی پہچان اسلام سے قبل اور اسلام کے بعد جو ذہنوں میں آتی ہے وہ حوالے مضبوط کرنے ضروری ہیں اس لئے کہ ہم آئندہ نسلوں کو بتا سکیں کہ ہم نے کس طرح اپنی شناخت کا سفر طے کیا ہے۔

ملتان کا چوک فوارہ اگرچہ اتنا قدیم نہیں لیکن اس کے ارد گرد جو آبادی موجود ہے وہ صدیوں کی تاریخ کی امین ہے۔ یہاں ایک ایسی ہستی کا مزار ہے جسے صدیوں کی فضیلت حاصل ہے اگرچہ ''اراض ملتان، ملتان ذیشان'' اور مرقع ملتان جیسی کتابوں میں اس کا ذکر نہیں ملتا لیکن اس کے باوجود ''مائی مہربان'' کا مزار قدیم طرزِ تعمیر کی علامت ہے ''مائی مہربان'' ایک بزرگ خاتون کا مزار ہے جہاں مردوں کا داخلہ قطعی بند ہے یہ بزرگ خاتون کون تھیں کہاں سے آئی کاش اس پر تحریری صورت میں کچھ مواد ملتا اگر کہیں ہے تو وہ مواد گمنامی کی صورت میں ہے۔ بہر حال ان کے عہد کو محمود غزنوی کے عہد سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس مزار کو آج کل جو خطرات لاحق ہیں کاش کوئی اس کا ازالہ کر سکتا۔ یہ پردہ دار خاتون

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ارد گرد کے مکانوں کی وجہ سے چار دیواری کی صورت میں محفوظ تھی مگر ارد گرد کے مکان یا تو بک گئے ہیں یا انہیں پلازہ اور پنوار بننے کا مرض لاحق ہو گیا ہے جس کی وجہ سے مائی مہربان کا مزار بالکل عریاں اور کھنڈرات کے درمیان رہ گیا ہے۔ ایسی نادر تعمیر اور خوبصورت مزار ہماری توجہ چاہتا ہے۔

اسی طرح ملتان کے ان گنت مٹتے نقوش ہیں جو ہماری توجہ اور حکومت کی مدد چاہتے ہیں مقامی انتظامیہ کو مجبور کر رہے ہیں۔ کہ ان کی زبوں حالی پر کوئی ڈرافٹ کوئی نوٹ صوبائی یا مرکزی حکومت کو ارسال کریں تاکہ نئے مالی سال کے بجٹ میں لئے گئے فنڈ سے کچھ ملتان کو بھی مل جائے اور اس کے یہ مٹتے نقوش بچ سکیں۔ جائے پیدائش احمد شاہ ابدالی کی بہتری اور بھلائی والی سوچ کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہماری انتظامیہ اور عوام میں ابھی جذبہ خیر موجود ہے۔ اس راکھ میں چنگاریاں موجود ہیں۔ ضرورت صرف کریدنے اور انہیں چمکانے کی ہے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

"But"- "However"- "Other Wise"

آپ بی اے کا کسی بھی یونیورسٹی کا رزلٹ اٹھا کر دیکھ لیں آپ کو انگریزی میں فیل ہونے والے طلباء و طالبات کی ایک لمبی قطار نظر آئے گی۔ طلباء و طالبات انگریزی میں کیوں فیل ہوتے ہیں ؟ حالانکہ ہم انہیں کے جی اور نرسری سے انگریزی شروع کراتے ہیں سارا سارا سال مغزماری کرتے ہیں گلی کوچوں میں پھیلی ہوئی اکیڈیمیوں میں اپنے بچوں کو پڑھاتے ہیں گھر پر بھی ٹیوٹر کا انتظام کرتے ہیں اور کسی ریٹائرڈ فاضل انگریزی کے پروفیسر سے بھی مسلسل رجوع کرتے ہیں۔ خلاصے ، گیس پیپرز اور "میڈی ایزی" جیسی کتابیں بھی پڑھتے ہیں ایک جیسی لکھی ہوئی اور ایک دوسرے کی کاوشوں سے ترتیب دی ہوئی گرائمر کی کتابیں بھی پڑھتے ہیں۔ امتحان کے سنٹر میں یہ واحد مضمون ہے جس میں "ناجائز ذرائع" اختیار کرنے کا شوق بھی چراتا ہے۔ کئی بچے پکڑے بھی جاتے ہیں کیس بھی بنتے ہیں ایک آدھ سال کے لئے امتحان نہ دینے کی سزا بھی ملتی ہے اتنے جتن کرنے کے باوجود بھی انگریزی نہیں آتی اور انگریزی میں مہارت پیدا نہیں ہوتی۔ ری چیکنگ اور ری مارکنگ (Remarking) میں بھی کچھ نہیں بنتا اور اگر کچھ فرق پڑ بھی جائے تو محض دو تین نمبروں کا ہوتا ہے۔ یقین نہیں آتا کہ انگریزی اتنی مشکل زبان کیوں ہے ؟ جس طرح برصغیر میں انگریزوں نے ڈیڑھ سو سال حکومت کی اسی طرح آج کی دنیا میں انگریزی بین الاقوامی زبان بن گئی ہے جس طرح فرانسیسی زبان کو معاہدوں کی زبان کہتے ہیں اسی طرح انگریزی کو ڈپلومیسی کی زبان کہا جاتا ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ ڈپلومیسی، سفارت کاری اور شوگر کوٹیڈ ہوتا ہے پڑھتے ہوئے خوشی ہوتی ہے اور جب پڑھ چکتے ہیں تو دکھ ہوتا ہے کہ ایسی منافقت کیا لفظوں میں بھی ہو سکتی ہے ؟ مکتوب یا ڈرافٹ اس طرح شروع ہوتا ہے۔

محترم جناب.....

آپ یقیناً یہ سن کر خوش ہوں گے کہ ہمارے ماہرین نے آپ کے کاغذات کو بڑے غور سے دیکھا ہے اور آپ ہمارے معیار پر پورا اترتے ہیں۔(BUT) لیکن محدود وسائل کی وجہ سے سر دست آپ کو بلانا مشکل ہے۔ آپ ہماری (Waiting List) میں موجود ہیں۔ امید

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ہے کہ آپ کا تعاون ہمارے ساتھ جاری رہے گا۔ اور آپ آئندہ بھی خط و کتابت کرتے رہیں گے۔

آپ کا مخلص

تھامس بی ڈبلیو

اس خوبصورتی کا اظہار کسی اور زبان میں ممکن نہیں۔ ڈپلومیسی اور پُر لطف سفارت کاری بلکہ کاروباری مراسلات کی اور کیا مثالیں ہوں گی۔

اسی طرح انگریزی زبان کی ڈپلومیسی کی وسعت، خوبصورتی سے کباحتوں کو آشکار کرنے کی صلاحیت ان دو لفظوں میں بھی موجود ہے جن میں (However) تاہم کا لفظ موجود ہے جس میں کسی شخص کے بہت کچھ کہنے کے باوجود کہا جائے کہ ابھی گنجائش باقی ہے یا چند نکات بیان ہونے سے رہ گئے ہیں تو سننے والا اور کہنے والا اس ڈپلومیسی پر سر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔

اسی طرح (Other wise) کا لفظ دوسری ڈپلومیسی کی وکالت کرتا ہے پہلے جی بھر کر کسی شخص کی برائیاں بیان کریں جی بھر کر خاک اڑائیں یا خاکہ پیش کریں اور آخر میں کہہ کر مطمئن ہو جائیں کہ "وہ اپنے آپ کو معزز خیال کرتا ہے" اب سننے والا کیا مجموعی تاثر لے گا وہ شخص اچھا ہے یا برا ساری بُرائیوں کے بعد ایک سچائی سے کیا شخصیت دھل جائے گی۔ نیک، شریف، ایماندار کہنے کے بعد کہ "وہ کبھی کبھی پیاز بھی کھاتا ہے" تو اس (Other wise) کی سمجھ زیادہ گہری ہو جاتی ہے انگریزی رعب ڈالنے والی زبان ہے جب کبھی آپ کو اسلام آباد جانے کا موقعہ ملے اور کسی کانفرس، ورکشاپ یا میٹنگ میں آپ مدعو کئے جائیں تو آپ کو خوبصورت انگریزی سننے اور بولنے کا موقع ملے گا آپ کے لہجہ معلومات اور انگریزی کے چند گنے چنے الفاظ جو آپ کسی بھی محفل میں جب چاہیں بول سکتے ہیں اس سے سننے والے کو ہمیشہ تازہ تاثر ملے گا اور اگر آپ نے غلطی سے اردو کو ذریعہ اظہار بنا لیا تو پھر لکھے موسیٰ پڑھے خدا یعنی آپ اپنی اردو سے خود محفوظ ہوں گے حاضرین و ناظرین پر اس کا اثر زیرو ہو گا بلکہ آپ جس نے کلام کرنا چاہیں گے وہ آپ سے بیزار ہو گا اور آپ حیران ہوں گے کہ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے اور آپ کو پہلی دفعہ محسوس ہو گا کہ انگریزی واقعی بین الاقوامی زبان ہے اور آپ کو اپنی تعلیم پر اور ٹاٹ پر بیٹھ کر پڑھنے پر سخت کوفت ہو گی کہ آپ نے عمر عزیز کے چالیس سال ضائع کر دیئے۔ ہمارے اساتذہ کرام نے ہمیں تختیاں دھونے اور انہیں خشک کرنے کے

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

طریقے بتائے اور وہ انگریزی سکھائی کہ جب ہم انگریزوں سے بولتے ہیں تو وہ خوش ہو کر ہمیں داد دیتے ہیں۔

(You are very innocent)

ہمیں اپنے معصوم ہونے پر ناز ہونے لگتا ہے اور انگریز بہادر ہمارے لہجہ اور الفاظ کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ بھول جاتا ہے کہ اس کی اردو بولنے کی کوشش بھی ہمیں مسکرانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ جس انگریزی پر وہ نازاں ہے وہ ہمیں معلوم ہو گئی ہے وہ صرف تین لفظوں کی مکاری اور اداکاری سے عبارت ہے بلکہ زخموں پر مرہم لگانے کے لئے ان لفظوں سے زیادہ معزوں لفظ نہیں۔

"But' However' Otherwise"

جسے یہ لفظ زبانی یاد ہو گئے وہ انگریزی کا ماہر ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

”سوری“

لفظ کہاں پیدا ہوتے ہیں اور ان کی تاثیر کب پیدا ہوتی ہے آج کی دنیا لفظوں کے درمیان اٹک گئی ہے ایک منٹ میں اس کرہ ارض میں پانچ ارب لفظ لکھے اور بولے اور پڑھے جا رہے ہیں۔ لفظوں کا ہر طرف ہجوم ہے ذرائع ابلاغ نے ہماری مختصر کائنات کو اس طرح گھیر لیا ہے جیسے کوئی طاقتور فوج کسی کمزور گاؤں کا محاصرہ کر لیتی ہے صبح سے رات گئے تک اخبارات، ریڈیو، ڈش، فلم، وی سی آر، سیٹ لائٹ، الیکٹرانک میل کی حکومت ہے کسی فلم کا عنوان تھا کہ ”دن کو راج فرنگی کا اور رات کو راج ملنگی کا“ لگتا ہے کوئی ایسی فلم انسان کے جہان صغیر میں چل رہی ہے۔ اسے فرنگی سے نہیں ابلاغ سے خطرہ ہے اس کے دل و دماغ پر کسی طاقتور حکمران کا راج نہیں بلکہ لفظوں کا عذاب ہے۔

اس مشکل لفظوں میں ایک معصوم لفظ ”سوری“ ہے یعنی ”معاف کیجئے“ اس لفظ نہ جانے کیا طلسماتی تاثیر ہے کہ بسیار خرابیوں کے باوجود جونہی یہ لفظ سوری زبان سے ادا ہوا اور ہونٹوں نے اسے ابلاغ کے حوالہ کیا تندو تیز جملے۔ جارحانہ انداز ٹھنڈے پڑ گئے۔ غصلی آنکھوں میں شفقت چہرے کی سختیاں حلیمی کے اثر سے مسکراہٹوں میں بدل جاتی ہے۔ ”سوری“ نہایت پیارا لفظ ہے بڑے سے بڑے جرم میں اور بڑے سے بڑے نقصان پر سکون فراہم کرتا ہے۔ زخموں پر مرہم کا کام کرتا ہے بولنے والے کی عزت بڑھاتا ہے سننے والے کو حسن آداب بخشتا ہے درگزر کی فضا پیدا کرتا ہے۔ دھکا دے کر اور کیچڑ میں لت پت کرنے کے باوجود لفظ ”سوری“ دوسرے کو مسکرانے پر مجبور کر دیتا ہے جی چاہتا ہے کہ اس لفظ کو ہر چوک پر ہر سڑک پر ہر دکان پر آویزاں کر دیا جائے کہ آؤ ہم ایک دوسرے کو معاف کر دیں بخش دیں گر خطا کرے کوئی.....

کہتے ہیں کہ کسی جیل میں ایک بہت بڑا مجرم قید تھا اسے ہر قسم کی سزاؤں سے نوازہ گیا مگر اس نے اقبال جرم نہ کیا جیل کا پورا عملہ عاجز آگیا ایک دن کمانڈنگ آفیسر جیل کے معائنہ کے لئے آیا اس نے سارے قیدیوں کے احوال سنے اور دیکھے اور اس مجرم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اسے کون کون سی سزا جا چکی ہے۔ سپریٹنڈنٹ جیل نے ساری سزائیں سنا دیں اور کہا کہ اب تو کوئی سزا باقی نہیں جو اسے دی جائے۔ کمانڈنگ آفیسر نے کہا صرف ایک

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

سزا باقی رہ گئی ہے کہ اسے ''سوری'' کہہ کر فارغ کر دیا جائے۔

چنانچہ اسے بلایا گیا اور اسے کہا گیا کہ تمہیں ہم نے ناجائز جیل میں ڈالا ہم اس پر ''سوری'' کرتے ہیں وہ قیدی دھاڑیں مار مار کر رونے لگا کہ حضور یہ آپ نے مجھے کیا سزا سنا دی میں تو اس لفظ سے نا آشنا تھا یہ بڑی سزا ہے اور ہمیں اس سزا کی لاج رکھوں گا اور آئندہ لفظ سوری کہنے کا موقع نہیں دوں گا۔

لفظ ''سوری'' "SORRY" پانچ الفاظ پر مشتمل ہے اور "Five gates of knowledge" کا درجہ رکھتے ہیں پانچ انگلیاں بھی اسی سے عبارت ہے اگر ایک انگلی کسی کے لئے آپ اٹھائیں گے تو باقی تین انگلیاں سراپا ''سوری'' بن جائیں گی اور انگوٹھا خاموش تماشائی کا کردار ادا کرے گا۔

اگر ہم ایک دوسرے کو ہر وقت سوری کہتے رہیں اس سے دو نتیجے نکل سکتے ہیں ایک تو یہ غلطیوں کا ارتکاب ختم ہو جائے گا دوسرا یہ کہ پورا معاشرہ ''سوری'' سے بھر جائے گا کہ پھر یہ دیکھنا ممکن نہ ہو گا کہ غلطی کہاں ہے اور سوری کہاں ہے اور غصے سننے والا گالی بھی دے سکتا ہے کہ غلطی کے بعد سوری کرتا ہے شرم نہیں آتی۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ہم چلتے پھرتے خواب کیوں دیکھتے ہیں؟

کیا ایسا ممکن نہیں کہ ہم گھر سے باہر قدم رکھیں اور ایک نوٹوں سے بھرا ہوا بٹوہ ہمارا منتظر ہو۔ اسے اٹھانے کے لئے کوئی رکاوٹ موجود نہ ہو۔ دور دور تک کوئی آدمی دکھائی نہ دے۔ یا ایسا بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ ہماری اچانک لاٹری نکل آئے اور گھر میں بیٹھے بٹھائے ہم لاکھوں کے مالک بن جائیں۔ کوئی امیر کبیر قریبی عزیز جس کی جائداد کا کوئی ولی وارث نہ ہو اچانک انتقال کر جائے اور ہم اس کے حقیقی وارث ٹھہرائے جائیں تو پھر زندگی کا کیا لہر بہر ہو گی اسی نوعیت کے کئی ملتے جلتے خواب ہم اکثر دیکھتے ہیں۔ ان خوابوں کی کیا تعبیر ہو گی اور ان سے زندگی کی کیا تصویر بنے گی اس کا اندازہ کون لگائے گا؟ بہر حال خواب دیکھنا ہر انسان کا بنیادی حق ہے اور اس پر کسی بھی حکومت کو پابندی یا ٹیکس لگانے کا نہ آج تک نہ کوئی خیال آیا ہے اور نہ آئندہ ایسے خیال کے آنے کا امکان ہے۔ خواب کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ بعض ایسے خواب ہیں جن کی تعبیر جلد مل جاتی ہے ان خوابوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ صبح صادق کے وقت ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ سچے خواب ہوتے ہیں ان خوابوں میں معصوم خواہشات کی تکمیل نظر آتی ہے ان خوابوں میں گم شیدہ بٹوے نہیں زندگی کے جلوے ملتے ہیں۔ اچھے کام کرنے اور اچھائی کی راہ چلنے کا اشارہ ملتا ہے۔ یہ خواب اللہ کی برگزیدہ انسانوں پر گزرتے ہیں۔ جن کے دماغ روشن اور باطن صاف ہوتے ہیں۔ وہ کسی ادھورے مشن کی تکمیل کا اشارہ پاک خلق خدا کے لئے بھلائی کا سامان پیدا کرتے ہیں۔ کوئی پل، کوئی مسجد، کوئی کنواں (صرف پانی حاصل کرنے کے لئے) تعمیر کراتے ہیں تاکہ خلق خدا کو سکون ملے۔ ایسے خواب پیغمبروں، نیک بندوں اور بزرگوں نے دیکھے جیسا کہ ایک خواب ہم نے برصغیر میں علیحدہ وطن پاکستان کے لئے دیکھا کہ ہمارے مرشد علامہ اقبالؒ نے ۱۹۳۰ء میں آلہ آباد کے مقام پر ایک خواب دیکھا جس کی تعبیر نے ہمیں پاکستان دیا۔ اس کے بعد ہم نے خواب دیکھنے چھوڑ دیئے جس کی وجہ سے ہمیں وسعت نہ مل سکی اور ہم اپنے فلسفہ کو آگے نہ بڑھا سکے۔ ایک منزل ملنے تک ہمارے خواب کچھ اور تھے اور اب ہمارے خواب نیک شکل اختیار کر گئے ہیں۔ پہلے ہمیں ملت کا مفاد عزیز تھا اور آج ہمیں اپنا مفاد عزیز ہے اور اس مفاد کو حاصل کرنے کے لئے ہم نے محنت اور کاوش کا راستہ چھوڑ کر صرف خوابوں کے سہارے ڈھونڈ لئے ہیں اور یہ خواب ہمیں

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

آگے بڑھنے کی بجائے در در خوار کر رہے ہیں۔ خود انحصاری سے محروم کر رہے ہیں۔ خود کفالت کی منزل سے محروم ہو کر بڑی طاقتوں سے اپنی ترقی کی تعبیر پوچھتے ہیں۔وہ کشتی ہی کیا جو کسی کے سہارے چلے اور وہ بھی کنارے کنارے ہواؤں کی مرضی۔ یہ کشتی کی منزل کبھی اس کنارے کبھی اس کنارے ایسے خواب ہم کیوں دیکھتے ہیں ؟ جب جسم و جان میں ہمت نہ رہے جب خون جگر سے کمانے کی بجائے محض سہانے خوابوں کے سہارے ڈھونڈ لیں اور دن کو خواب دیکھیں حالانکہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو رات کو بھی خواب نہیں دیکھتے بلکہ ساری رات تاروں میں ہونے والی سرگوشیاں سنتے ہیں۔ کائنات کے راز جاننے کی کوشش کرتے ہیں اور بڑے دعویٰ سے کہتے ہیں کہ آؤ ہم تمہیں بتائیں کہ رات بھر کیا ہوا۔

ہم سے سنیئے تو ستاروں کی کہانی سنیئے
خواب کی بات کرے وہ جسے نیند آئی ہو

لیکن ایسے لوگ بھی دیکھے جو ہمیشہ اپنی آنکھوں میں خوابوں کو پالتے ہیں۔ آنے والے لمحوں کو اپنی آنکھوں میں سجاتے ہیں اور ایک ایسے جہان کی باتیں کرتے ہیں جس کا لمحہ موجود میں امکان نہیں ہوتا۔ کچھ خواب ترقی کے اس پہیئے کو آگے کی منزل بتاتے ہیں جس کا وجود ظاہراً موجود نہیں ہوتا۔ یہ خواب فلسفیوں اور دانشوروں کے ہوتے ہیں لیکن عام لوگوں کے خواب غریبانا انداز کے ہوتے ہیں۔ جس میں چھوٹی چھوٹی پوشیدہ خواہشوں کا اظہار ہوتا ہے۔ مثلاً ہمارے گھر میں اچانک رنگین ٹی وی آجائے، وی سی آر کوئی مفت دے جائے، کوئی ایسا مہربان مل جائے جو کہے ایک تعمیر شدہ عالی شان کوٹھی میں آپ کو مفت دینا چاہتا ہوں یا حکومت مہربان ہو جائے اور کسی بڑے خالی عہدہ پر تعینات کر دے یا کسی خالی ہونے والے عہدے پر نامزدگی کا اعلان کر دے۔ ایسے خوابوں کے بارے بڑے بڑے ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ جب ہاضمہ درست نہ ہو معدے میں گرانی ہو یا بسیار خوری کی ہو تو ایسے خواب قطار اندر قطار اترتے ہیں۔ زندگی ایک مقتدر روحانی شخصیت ایسے ہی خوابوں کے لئے مشہور ہے۔ اکثریت کا خیال ہے کہ وہ بسیار خوری کرتے ہیں۔ جی بھر کر کئی ڈشیں کھا جاتے ہیں اور ڈکار بھی مشکل لیتے ہیں تو ایسے خواب ان پر پیش گوئی کی صورت میں اترتے ہیں۔ شاذ و نادر ہی ان کی کوئی تعبیر نکلتی ہو لیکن یہ ضرور ہے کہ وہ ان کی وجہ سے بہت مشہور ہیں۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

اکثر ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ ہر صحت مند آدمی کو خواب دیکھنے چاہئیں اگر خواب آنے بند ہو جائیں تو شخصیت کا متوازن ہونا ممکن نہیں ہوتا بلکہ ہر آدمی کو اپنی اوقات کے مطابق خواب دیکھنے پر کوئی پابندی نہیں۔ اچھے اور پاکیزہ خوابوں سے طبیعت پر بوجھ نہیں پڑتا البتہ بھاری بھر کم خواب ڈراؤنے خواب بن جاتے ہیں۔ ساری رات بے چینی میں کٹتی ہے اور دن اداس اداس رہتا ہے۔ ترقی والے خواب سب سے اچھے ہوتے ہیں کہ جب میں صبح اٹھوں تو اخبار میں گورنر بننے کی خبر چھپی ہو یا کسی درس گاہ کے ناظم اعلیٰ کا اعلان ہو چکا ہو، یا مشیر وزیر بننے کی مصدقہ اور معتبر ذرائع کے حوالہ سے پڑھنے کو خبر ملے۔

ہماری قومی سیاست میں ایسے وزیر موجود ہیں جنہوں نے ہمیشہ اعلیٰ منصب محض خوابوں کو دیکھنے اور نجومیوں سے ان کی تعبیر سننے میں زندگی کے دن گزرے ہیں اور آج بھی کئی ہمارے دوست قلعہ کہنہ ملتان کی سڑکوں پر بیٹھے ہوئے طوطے والوں سے خوابوں کی تعبیر پوچھتے ہیں اور جب انہیں یہ پتہ چلتا ہے کہ موجودہ نوکری بھی خطرے میں ہے کیونکہ عمر عزیز ۵۸ سال سے تجاوز کر رہی ہے اور آئندہ شاید گولڈن شیک ہینڈ کی سعادت ملنے والی ہے تو وہ اس تعبیر پر خوش ہونے کی بجائے بیچارے فال والے، طوطے والے اور نجوم کے ماہر کو در بدر کرنے کی سوچتے ہیں کیونکہ آج کل ان کے روزگار پر کئی اخبار والوں کی نظر ہے کہ یہ سادہ لوگ عوام کو بے وقوف بناتے ہیں اور لفظوں کے ہیر پھیر سے ان کی جیبیں کاٹتے ہیں۔

آج کے دور میں خواب دیکھنا کتنا مشکل ہے۔ پہلے چلتے پھرتے بڑے خواب دیکھنے کو ملتے تھے لیکن جب سے مہنگائی اور ٹریفک کی بے وفائی نے سر اٹھایا ہے اور سڑکیں تیز رفتار گاڑیوں کی زد میں آگئی ہیں اب بموں اور لاٹری اور مرحوم عزیزوں کی جائداد، ترقی اور بڑے عہدے نظر نہیں آتے بلکہ حادثے ہی حادثے نظر آتے ہیں۔ مخدوم رشید کا حالیہ ویگنوں کا حادثہ کتنی جانیں لے گیا ہے اور ان کی کھلی آنکھیں کتنے خواب چھوڑ گئی ہیں۔ جو زندہ رہنے کی تعبیر مانگتے ہیں۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ملتان کی سہ پہر دو پہر سے زیادہ گرم ہوتی ہے

شمس اور شمسی توانائی

سہ پہر دو پہر سے زیادہ گرم ہوتی ہے یہ محکمہ موسمیات والوں کا خیال ہے۔ اس سے پہلے علم جغرافیہ کے ماہرین ایسی باتیں کرتے تھے اب علم جغرافیہ آہستہ آہستہ معدوم ہو گیا ہے اور اس کے طالبِ علم یا تو موسمیات کے شعبے میں چلے گئے یا زیادہ باشعور ہوئے تو شعبہ جیالوجی (ارضیات) میں داخلہ لے لیا، یا مرکز کی کسی درس گاہ کے قریب ہونے کی وجہ سے Sciences of Earth کے طالبِ علم کہلانے پر فخر کرنے لگے۔ بہر حال یہ حقیقت ہے کہ شعبہ کوئی بھی ہو سہ پہر دو پہر سے زیادہ گرم ہوتی ہے اور خوش نصیب وہ لوگ ہیں جو اس لذت سے محظوظ ہوتے ہیں اور اس قدر محظوظ ہوتے ہیں کہ انہیں یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ سہ پہر گرم ہے یا صبح۔ رات گرم ہے یا دن، جاہ و جلال کی علامت ہے۔ جتنی سہ پہر ملتان کی گرم ہے اس پر تحقیق کے انبار لگ جاتے۔ کوئی اس کی صبح کو موضوع بناتا کوئی دوپہر پر تحقیق کرتا اور کوئی شام کو اتنی تحقیق فراہم کرتا کہ مغربی دنیا کے لوگ ترستے کہ چلو ملتان چلو جہاں گرمی چوبیس گھنٹے رہتی ہے جس کی صبح جس کی دوپہر، جس کی سہ پہر اور شام اور پھر رات ایک جیسی ہے ملتان اس اعتبار سے خوش نصیب ہے کہ یہاں ہمیشہ ایک ہی موسم رہتا ہے یعنی گرمی کا۔ اگر سردی آبھی جائے تو پھر بھی گرمی اپنا وجود منا لیتی ہے موسمِ بہار بھی اپنے اندر گرمی جیسی تلخی ضرور رکھتا ہے گویا ملتان گرمی کے معاملے میں خود کفیل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر اچانک بادل آجائیں اور دو تین دن مسلسل بارش ہو جائے تو ملتان کی مسجدوں کی اذانیں، دعائیں شروع ہو جاتی ہیں کہ اے خدا ہمیں سردی سے بچا اور ہمیں گرمی عطا کر یہ گرمی موسم کی تو ہے ہی، یہاں گرمی گفتار بھی شامل ہے۔ یہاں کے شاعر، ادیب، صحافی اتنے زوردار ہیں کہ ان کے کلام سے اور ان کے بیان سے کوئی متاثر ہوئے بغیر رہ نہیں سکتا۔ ان کے افکار میں حضرت شاہ شمسؒ، حضرت شاہ یوسف گردیزؒ، حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ، حضرت شاہ رکنِ عالمؒ کے حسن و کمال اور جاہ و جلال کا عکس بھی دکھائی دیتا ہے۔ ان بزرگوں کے مقابر پر صبح، دوپہر، شام گرمی کا احساس نہیں ہوتا کیونکہ ان کی تعلیمات ہی گرمی کردار کا سامان فراہم

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

کرتی ہیں اور یہ گرمی موسم کی گرمی سے برتر ہوتی ہے۔

ملتان پورے جنوبی پنجاب کو وہ خطہ ہے جس نے گرمی کی قوت سے وہ کمالات دکھائے ہیں جن کی وجہ سے وطن عزیز ترقی کی راہوں پر گامزن ہے۔ گندم، کاٹن، چاول، مکئی، جوار، گنا، آم، کھجور، انار، کنو انہی گرمیوں کا وہ تحفہ ہے جو پورے ملک میں اور باہر کی دنیا میں ملتان کی پہچان بھی ہیں اور زرمبادلہ کے حصول کا ذریعہ بھی جس طرح ملتان کے مضافات سے آنے والے پھل، اناج ٹرانسپوٹ کی مناسب سہولت نہ ہونے کی وجہ سے منڈیوں تک پوری تعداد اور مقدار میں نہیں پہنچ پاتے اور ملک کثیر سرمایہ سے محروم ہو جاتا ہے اسی طرح ملتان شمسی توانائی سے روزبارو ز محروم ہوتا جارہا ہے۔ سورج کی اتنی گرمی کسی مناسب پر جیکٹ میں شامل نہیں ہوتی وگرنہ اس سے ناجانے کتنے کارخانے دفاتر، ادارے اور تعمیراتی منصوبے مکمل ہو جاتے ہیں۔ مگر پورے جنوبی پنجاب میں ایک بھی شمسی توانائی "سولر انرجی" کا پروجیکٹ موجود نہیں۔ اچھے وقتوں میں موج گڑھ چولستان میں سولر انرجی کا مرکز قائم کیا گیا تھا مگر نا مناسب دیکھ بھال کی وجہ سے وہ موج گڑھ کی تاریخی آثار کی طرح بذاتِ خود تاریخی مرکز بن گیا ہے سولر انرجی فراہم کرنے کی بجائے سولر انرجی سے محفوظ ہونے والا ادارہ بن گیا ہے۔

ملتان کے لوگوں کو یہ گرمی اتنی عزیز ہے کہ مجال ہے کہ وہ اس کو دور کرنے کی ذرا سی بھی کوشش کر لیں۔ کوئی درخت کوئی فوارہ اگرچہ کچھ فوارے موجود ہیں مثلاً (چوک فوارہ لبدالی روڈ پر) مگر چلتے نہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ ٹھنڈک کا سماں پیدا ہو جائے ہم گرمی کو ہر طرح عزیز رکھتے ہیں لیکن دنیا حیران ہے کہ ملتان میں اتنی گرمی ہے اور پھر بھی لوگ خوش ہیں۔ بہت سے لوگ اسلام آباد اور دیگر سرد خطوں سے آتے ہیں اور ملتان والوں کو داد دیتے ہیں کہ گرمی کو برداشت کرنے کا یہ اہتمام قابلِ ذکر ہے۔

جب کسی خطے کی گرمی کسی کام میں یا پروجیکٹ میں استعمال نہ ہو اور پوری کی پوری ضائع ہو جائے اور اس پر کسی کو افسوس بھی نہ ہو تو ایسے موقعوں پر ایسے محاورے استعمال ہوتے ہیں کہ

سہ پہر دوپہر سے زیادہ گرم ہوتی ہے

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

لفظ تاثیر سے کب محروم ہوتے ہیں

جب کسی درخت کی ٹہنیوں پر شہد سے خالی چھتہ نظر آئے وہ اس قدر سوکھ گیا ہو کہ اس میں سے موم کی خاصیت بھی ختم ہو جائے تو سمجھ لیجئے کہ لفظ بھی اس طرح تاثیر سے محروم ہو جاتے ہیں جس طرح نمک میں سے نمکینی ختم ہو جائے احسانوں کا بدلہ ناقدری، مہربانی کا صلہ بے مروتی عمر بھر جس دستر خواں کے لقمے کھنائے میں لطف اٹھایا ہو اسی دستر خواں پر طرح طرح کی باتیں کرنے والا جب آپ کو ملے تو یقین کر لینا کہ لفظ تاثیر سے محروم ہو گئے ہیں اور لفظوں کی حرمت کو زوال دینے والا شخص آپ کے سامنے ہیں۔ ایسا کیوں ہوا ہے کچھ لوگ اسے مادہ پرستی کی دوڑ کہتے ہیں جب یہ اندھی دوڑ شروع ہو جائے تو اخلاق، شرافت اور انسانیت کے اجزاء منتشر ہو جاتے ہیں انسان اپنی ذات کے خول میں ایسا بند ہو جاتا ہے کہ اسے وہ سب لوگ اجنبی لگتے ہیں جنہوں نے اس کے ساتھ برسہابرس کام کیا ہو۔ اور اس شخص کو جو اس شہر میں اجنبی تھا جسے لکھنا پڑھنا نہ آتا ہو اسے لکھنا پڑھنا سکھایا گیا ہو پھر وہی شخص اس قلم سے اسی روشنائی سے اور اسی فکر اور ورق سے اپنے محسن کو لیرہ لیرہ کرنے کی ٹھان لے۔ یعنی اسی طرح جس طرح کوئی استاد اپنے شاگرد کو تمام ہنر سکھادے اور وہ شاگرد استاد کے سامنے کمر ٹھونک کر کھڑا ہو جائے۔ یا اسی طرح جس طرح کوئی مالک مکان کسی کو اپنی دکان یا مکان کرایہ پر دے اور وہ کرایہ دار لوگوں کو یہ کہتا پھرے کہ میں کرایہ دار نہیں مالک ہوں۔ مالک مکان یا دکان میں ہمت ہے تو مجھے اٹھا کر دکھادے اور واقعی مالک مکان بے بس ہو جاتا ہے جب کرایہ دار Stay Order لے آتا ہے اور پھر عدالتوں کے پھیرے دعویٰ اور جواب دعویٰ کی تحلیلیں تنقیبات اور نہ جانے کیا کیا مراحل پیش آتے ہیں اور آدمی زچ ہو جاتا ہے اور پچھتاتا ہے کہ میں نے مکان یا دکان دینے کی غلطی کیوں کی؟ لیکن اس وقت پانی سر سے گزر چکا ہوتا ہے۔

اسی طرح ایک حساس شاعر اپنے شاگرد کو شاعری کے رموز، آداب و وزن سے آگاہ کرتا ہے وہی شاگرد چند دنوں کے بعد اپنے استاد کے خلاف ہجو لئے محفلوں میں گھوم رہا ہوتا ہے استاد شاعر پر کیا گزرتی ہے کاش اس ناہموار کو کوئی بتائے کہ تم نے کتنے حساس دلوں کی آرزوں کو توڑا ہے کتنی امنگوں کا خون کیا ہے اور اسی تنے کے خلاف بغاوت کی ہے جس کی

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

طاقت سے شاخوں کا وجود قائم ہے شاخ کیسے تنے کے خلاف بغاوت کر سکتی ہے اگر وہ نہیں کر سکتی تو پھر شاگرد کس طرح اپنے استاد کے خلاف محاذ بنا سکتا ہے اس طرح ادارے کے پرانے ملازم کو اپنے مالک کے خلاف کچھ لکھتے ہوئے اور کچھ کہتے ہوئے احساس ہونا چاہئے کہ اس مالک کے خلاف لکھتے ہوئے اسے یہ کیوں بھول گیا کہ وہ کل تک اسی کے رحم و کرم پر تھا۔ اسی کے خوان نعمت سے لقمے اٹھا اٹھا کر کھاتا رہا ہے رشتوں کو اس قدر کمزور اور بے بس نہیں ہونا چاہئے مگر کیا کیا جائے۔ کوئی چیز بھی تو خالص نہیں رہی۔ ہر چیز میں ملاوٹ اور ہر چیز نمبر دو بلکہ نمبر تین ہو کر رہ گئی ہے اس لئے ایسے جھٹکے برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ کچھ ایسے مہربان آج بھی معاشرے میں موجود ہیں جو میزبان کا پورا گھر رات کو صاف کر دیتے ہیں کچھ مہربان ایسے بھی ہیں جو چادر زہرہؓ اور دلق اویسؓ چرا لیتے ہیں۔ ہماری اشیاء تو کسی شمار و قطار میں نہیں آتیں۔ ایسا لوگ کیوں کرتے ہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں انسان معاشرے میں غائب ہو جائے اور اس کی جگہ ابن الوقتی رہ گئی ہو۔ خود غرضی، وفات پرستی کا راج رہ جائے اور عدل کے وہ معیار کہ "لوگو جب لوگوں میں فیصلہ کرنے لگے تو انصاف سے فیصلہ کرو۔" اللہ تمہیں بہت خوب نصیحت کرتا ہے اور بے شک خدا سنتا اور دیکھتا ہے وہ ہمارے کیسے گم ہو گیا۔ کسی فرد کی یا کسی ادارے کی معمولی سی چیز گم ہو جائے تو انکوائریاں لے بیٹھتی ہیں۔ کاروائی ہوتی ہے اور ایک پورے معاشرے کا جذبہ احسان مندی گم ہو جائے تو کسی کو کانوں کان خبر ہی نہ ہو۔ اور ہماری آنکھوں میں کسی انسانی بستی کی بجائے ایک ایسے جنگل کی طرف چلی جائے جہاں درندے رہتے ہوں اور وہ کسی ایسے لفظ سے آشنا نہ ہوں جو انسان کی توقیر بڑھاتے ہیں۔

ہمارے ذہن پر چھائے ہیں حرص کے سائے
جو ہم محسوس کرتے ہیں وہی تحریر کرتے ہیں
بنے پھرتے ہیں کچھ ایسے بھی شاعر اس زمانے میں
ثنا غالب کی کرتے ہیں نہ ذکر میر کرتے ہیں

بڑی حیران کن بات ہے کہ جو زندگی پھر کسی ایک کو چائے کا کپ بھی پیش نہ کر سکے لیکن جب بات کرتے ہیں تو بڑے بڑے واقعہ کو اور بڑے سے بڑے اجتماع کو اس طرح ارادیتے ہیں جیسے یہ ان کی بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ لیکن قدرت انہیں ایسے کام کرنے کی توفیق نہیں دیتی وہ

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

محض زبانی تنقید کر سکتے ہیں خاک اڑا سکتے ہیں لیکن کوئی بھی خاک اُڑانے والے سوچ لے کہ لفظ اس کے پاس امانت ہیں کہ کہیں ایسا نہ ؟ یہ یہی لفظ اس کے سفید کپڑوں پر ایسے گریں کہ کوئی پاؤڈر اس خرابی کو دور نہ کر سکے۔ اتنی منافرتیں نہ پھیلائیں کہ لوگ آپس میں دست و گریباں ہو جائیں اتنی مکروہ تحریریں نہ لکھیں کہ لوگ ان کی آخری عمر پر تھوک دیں کہ تم نے عمر بھر کیا کمایا ہے اور کیا کھایا ہے۔ زندگی وابستگی سے عبارت ہے۔ کچھ لوگ اپنے دوستوں عزیزوں سے ایسے تعلق نبھاتے ہیں کہ پہچان کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کون کس کا بھائی تھا اور کون کس پر جاں نثار کرتا تھا۔ لیکن آج کے عہد کی نوبت یہ ہے کہ بیس بیس سال ایک ادارے میں گزرنے کے بعد لوگ اس طرح جدا ہوتے ہیں کہ ساری تحریریں جو انہوں نے اپنے مالک کے حق میں لکھی ہوتی ہیں باقی عمر ان تحریروں کی تردید میں گزار دیتے ہیں ایسے ہی جیسے مرحوم مولانا کوثر نیازی نے اپنی کتاب ''دیدہ ور'' اپنے آقا کے فضائل میں لکھی اور بعد میں اس کتاب کے ایک ایک حصے کی تردید کرنے میں زندگی گزار دی۔ آج ہماری صحافتی تاریخ بھی ایسے ہی صحافیوں سے بھری پڑی ہے جو آج ایک اخبار سے نکل کر دوسرے اخبار میں اور دوسرے سے تیسرے اخبار میں اپنے مضمون اپنے فیچر اپنے کالم کے ساتھ پہنچ جاتے ہیں اور پھر ساری تحریریں اپنی سابقہ تحریروں کی تردید میں گزار دیتے ہیں اور اس طرح وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اعلیٰ صحافت کو فروغ دے رہے ہیں حالانکہ ایک زمانہ ان کی ایسی حرکتوں پر ہنس رہا ہوتا ہے اور مرنے کے بعد تاریخ صحافت ان کے ذکر سے محروم ہوتی ہے اس لئے نہیں کہ وہ صحافی نہ تھے اس لئے نہیں کہ انہوں نے کسی اخبار میں کام نہیں کیا تھا بلکہ اس لئے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لفظ اپنی تاثیر کھو گئے ہیں جن کے پاس الفاظ تو ہیں مگر معنی نہیں۔ وہ ایسے ہیں جیسے کسی درخت کی ٹہنی پر شہد کا خالی چھتہ رہ گیا ہو اور شہد غائب ہو۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

نشتر کالج ایک اور عبدالرب نشتر کا منتظر ہے

ملتان کی تہذیبی پہچان کے دو نشان ہیں۔ ایک تو یہ ہے جو صدیوں سے مشہور ہے کہ ارض ملتان قدسی صفات ہستیوں کی جلوہ گاہ ہے روحانیت اور تجلیات کا یہ عالم ہے کہ فرشتے یہاں سربسجود ہیں۔ ''ملتان ما'' نسبتوں اپنائیتوں کا اظہار ہے۔

ملتان ما بہ جنت اولی برابر است
آہستہ پابنہہ کہ ملک سجدہ می کنند

دوسری پہچان وہی ہے جسے چہار چیز از تحفہ ملتان کہتے ہیں یعنی ملتان اپنی انفرادیت رکھتا ہے۔ اپنی تہذیب کے جداخدو خال کا شہر ہے۔ یہاں کے افراد انسان دوستی، شرافت اور وضعداری کے امین ہیں۔ پرانی وضعداریوں کو اس طرح نبھاتے ہیں جیسے ہیرے جواہر کو سنبھال سنبھال کر رکھتا ہو۔ لیکن کوئی ضائع نہ ہو جائے انہی چہار تحفوں کا ذکر اس تواتر سے آیا ہے کہ ملتان کے پلے پڑ گئے ہیں کہنے والے نے ممکن ہے عقیدت سے کہا ہو۔ سننے والے اسے ملتان کی شکایت سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ہم اسے اپنا تعارف خیال کرتے ہیں۔ ہمیں گرد سے اگاؤ ہے اس میں روحانیت کا سرمہ شامل ہے۔ ہمیں گرمی سے پیار ہے کہ ہمارے بقاء کی علامت ہے۔ ہمیں گداؤں سے محبت ہے کہ یہ گدائے اولیائے عظام ہیں۔ ہمیں قبرستان سے اگاؤ ہے کہ یہ آخرت کی نشانی ہیں۔ یہ چاروں تحفے ملتان کو رموزِ زندگی سے آشنا کرتے ہیں۔ حلیمی اور بردباری سکھاتے ہیں۔ Dust Heat Beggars Grave Yards۔ گرد، گرما، گداو گورستان ملتان کی نا صرف پہچان ہیں۔ بلکہ شاہراہ حیات کی کڑیاں ہیں۔ زندگی سے آشنا ہونے کی شرطیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج جو گرد سڑکوں پر اٹھتی ہے اسے کوئی سنبھالنے کو تیار نہیں۔ اس لئے کہ یہ روحانی سرمایہ جتنا بکھرے گا اتنا انسانی فلاح کا باعث بنے گا۔ کارپوریشن کا عملہ اس سرمایہ کی اڑان کو دیکھتا ہے اور خوش ہوتا ہے۔

گرما، الحمدللہ ۵۰۴۹ درجہ حرارت کو ملتان صدیوں سے قائم رکھنے میں کامیاب رہا ہے۔ معمولی معمولی لوگوں کا ذکر اکثر بک آف گینز میں ریکارڈ ہو جاتا ہے۔ ملتان جو صدیوں سے درجہ حرارت کی بلندیوں پر رہا ہے اس کا یہ ذکر ہونا چاہئے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

گدا، یہ بھی نمایاں صفت ہے لوگ آزادی کی بات کرتے ہیں کہ ہمیں تحریر و تقریر کی آزادی چاہئے وہ ملتان کے گداؤں سے یہ حاصل کریں۔ انہیں ایسی آزادی حاصل ہے کہ جس کا کپڑا دامن جس طرح کھینچ سکتے ہیں کھینچ لیتے ہیں اور جو چیز چاہیں حاصل کر لیتے ہیں۔

گورستان، البتہ گورستان کا معاملہ انحطاط پذیر ہے۔ بہت سے قبرستانوں پر کئی سڑکیں بن گئی ہیں جن میں حسن پروانہ روڈ چونگی نمبر ۸ قبرستانوں کو کاٹ کر سڑکیں تعمیر ہوئی ہیں اسی جذبہ کو دیکھ کر بعض لوگوں نے بھی قبرستان پر دکانیں پلازے اور گھر بنائے ہیں۔ پہلے لوگ قبرستانوں سے ڈرتے تھے اب جدید ضرورتوں نے زندوں اور مردوں کو اکٹھے ایک گھر ایک مکان میں رہنے پر مجبور کر دیا ہے۔

ملتان کی دوسری بڑی پہچان درج ذیل شعر ہے۔

گر شوی بیمار ہرگز کس نمی پرسد ترا
شہر ما پرساں کہ میگوئند ملتان یا قتم

اگر آپ کبھی بیمار پڑ جائیں تو اہلِ ملتان سے یہ توقع نہ رکھیں کہ وہ آپ کو پوچھنے آئیں گے۔ مقصود یہ تھا کہ ملتان کے لوگ شاید کم بیمار ہوتے ہیں۔ اس لئے مزاج پرسی کا معاملہ پیش نہیں آتا۔ ایک دوسرے کی مزاج پرسی اور تیمار داری سے آشنا کرنے کے لئے درد دل رکھنے والے پنجاب کے گورنر سردار عبدالرب نشتر نے (کروٹ کروٹ انہیں قبر میں راحت ملے) اکتوبر ۱۹۵۱ء کو نشتر میڈیکل کالج کا آغاز کیا۔ اسے پنجاب کا تیسرا کالج اور پاکستان کا چھٹا کالج کہلانے کا شرف ملا بعد میں اسے ایشیاء کا بہترین میڈیکل کالج قرار دیا گیا۔ اس کی ساری عمارت میں آپ گھوم پھر لیں آپ کو بارش کا ایک قطرہ نہیں ملے گا۔ کہیں دھوپ نہیں لگے گی۔ ساری عمارت دوسری عمارت سے متصل ہے۔ اس مربوط اور مضبوط طریقے سے تعمیر ہوئی ہے کہ اس کے ستون اس کے دروازے، اس کی عمارتیں ان معماروں کی ہنر مندی کی مرہونِ منت ہیں ان کے سوز دل اور جذبۂ ایمانی سے عبارت ہیں۔ نشتر میڈیکل کالج ملتان سے ڈاکٹروں، طالبِ علموں نے پوری دنیا میں ایک نام اور ایک مقام بنایا ہے اس کے بانی ڈاکٹر محمد جمال بھٹہ جو اپنی ذات میں تحریک، ایک مشن، ایک قوت متحرکہ تھے ایسے جذبوں کے لوگ، ایسے رفعتوں کے علمبردار اور ایسے مقاصد سے آگاہ لوگ اب خال خال رہ گئے ہیں۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ڈاکٹر محمد جمال بھٹہ نظریہ پاکستان اور مقاصد ''نوائے وقت'' سے آگاہ انسان تھے۔ انہوں نے ان سرچشموں سے فیض پایا اور اسی فیض کو نشتر میڈیکل کالج ملتان کے سنگ و خشک کے ایسے جذبوں سے ڈالا کہ آج نشتر میڈیکل کالج رفعتوں اور عظمتوں کی علامت ہے۔ جو ملتان سے بلوچستان سکھر، اور ڈیرہ اسماعیل خان تک اپنی طبّی خدمات سرانجام دے رہا ہے۔ مجبور، بے بس انسانیت کی شفایابی میں اس ادارے کا کردار بے مثال ہے۔ اگرچہ ادارے کے ارد گرد کچھ اور ذیلی ادارے موجود میں آگئے ہیں جو نشتر میڈیکل کالج اور ہسپتال کے لئے اور اس کے نام کے لئے کسی وقت بھی مسئلہ بن سکتے ہیں۔ اس کے بارے میں سوچنا موجودہ پرنسپل صاحبہ کی ذمہ داری ہے یا میڈیکل سپرنٹنڈنٹ صاحب کی کہ ادارے کے تشخص اور وقار کے راستے میں اگر کہیں کوئی کانٹے ہیں تو انہیں دور کیا جائے اور اس روح کو زندہ رکھا جائے جو اس ادارے کے مرکزی وجود کا حصہ ہے۔

اکثر خیال ذہن میں آتا ہے کہ ایک پنجاب کے گورنر، شاعر، ادیب اور تحریکِ پاکستان کے نامور سپوت جناب عبدالرب نشتر مرحوم نے ۱۹۵۱ء میں ایک ہسپتال اور میڈیکل کالج کا اضافہ ملتان میں کیا اور جو توقع قائم کی وہ اس ادارے سے پوری ہوئی اس کے بعد کتنے گورنر ایڈمنسٹریٹر زون ''اے'' آئے لیکن نشتر میڈیکل کالج کے بارے میں کسی نے نہ سوچا اور کچھ کیا کہ اس عظیم الشان ادارے کو کتنے نئے جدید پلانٹ چاہئیں۔ کتنے سازو سامان کی ضرورت ہے اور کتنے اچھے ڈاکٹر اس کے لئے ضروری ہے کتنی ادویات سٹور میں موجود ہونی چاہئیں۔ اس کے وارڈوں میں صفائی اور بہتری کے کیا اقدامات ضروری ہے۔ اس عرصہ میں لاہور کے اندر کئی نئے ہسپتال کھل گئے۔ علامہ اقبال میڈیکل کالج کا ہسپتال، سروسز ہسپتال، جنرل ہسپتال، میاں محمد منشی ہسپتال، گلاب دیوی اور سر گنگارام ہسپتال تو پہلے سے موجود تھے اور میو ہسپتال کا نام تو پورے برصغیر میں مشہور ہے۔ جس طرح لاہور کی آبادی بڑھی اسی طرح ملتان اور اس کے مضافات کی آبادی بڑھی ہے۔ ملتان ۱۹۵۱ء کے Status قائم ہے اور دیگر شہر ۱۹۹۷ء کے دور میں داخل ہو گئے ہیں۔ ملتان کے مریضوں کی تعداد جس تیزی سے بڑھی ہے اس تیزی سے علاج معالجہ کی سہولتیں نہیں بڑھیں۔ آج بھی آدھے مریض نشتر میڈیکل کے ہسپتال کے لان میں چٹایوں پر لیٹے ہوئے ہیں اور آدھے خوش نصیب ہسپتال کے اندر ہوتے ہیں۔ حالت دونوں کی ایک جیسی ہوتی ہے۔ ایک کو کھلی ہوا ملتی ہے اور

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

دوسروں کو پنکھے کی ہوا۔ جس میں حبس اور مخصوص "بو" شامل ہوتی ہے۔ ملتان خوش نصیب خطہ ہے جسے دو وزارتیں نصیب ہوئی ہیں اور دونوں کا تعلق صحت سے ہے۔ دونوں وزیر نوجوان، باصلاحیت اور کچھ کر دکھانے والے ہیں۔ اس لئے حافظ محمد اقبال خاکوانی اور مخدوم محمد جاوید ہاشمی کے لئے پہلا ایجنڈا یہی ہے کہ وہ نشتر میڈیکل کالج اور ہسپتال کو فوری توجہ دیں۔ پنجاب کے گورنر جناب شاہد حامد وزیر اعلیٰ پنجاب، میاں شہباز شریف وزیر اعظم پاکستان، میاں محمد نواز شریف جہاں دیگر شعبوں میں تعمیر و ترقی اور اصلاحات کو ترجیحی بنیادوں پر نبٹا رہے ہیں وہاں نشتر میڈیکل کالج ملتان جس کی ۴۶ سالہ خدمات اور کردار اس بات کا متقاضی ہے کہ اسے ملک بھر میں میڈیکل یونیورسٹی کا درجہ دیا جائے۔

۱۹۵۱ء سے لے کر ۱۹۹۷ء تک کے اس عرصہ میں اس کالج کو کوئی اچھی خبر کوئی اچھا تحفہ نہیں ملا۔ چھوٹی چھوٹی خوش خبریاں ملی ہیں۔ لیکن وہ بھی ابھی ابھی تعمیر کی مرحلہ میں ہیں۔ یہ کالج اس بطل جلیل کے اس مشن کی تکمیل چاہتا ہے جو آج سے ۴۶ سال قبل سردار عبدالرب نشتر نے شروع کیا تھا۔ یہ کالج ایک ایسے عبدالرب نشتر کا منتظر ہے جو اسے واقعی ایشاء کا عظیم کالج اور ہسپتال بنا دے۔ عبدالرب نشتر مسلم لیگ کے عظیم رہنما تھے اور آج مسلم لیگ کی حکومت ہے یقیناً سربراہ مسلم لیگ جو وزیر اعظم پاکستان بھی ہیں اس ادارے کو مسلم لیگ کی امنگوں اور آرزوں کا مرکز بنا دے گا۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

پھول توڑنا منع ہے

اچھا تو نہیں لگتا کہ اپنی برائیاں خود بیان کی جائیں خود کو بھی رنجیدہ کیا جائے اور دوسروں کو بھی افسردہ کیا جائے اور من حیث القوم ایک ایسی تصویر سامنے لائی جائے جو ہماری پاکستانیت کے لئے المیہ بن جائے جس طرح کہتے ہیں کہ ہم نے کچھ دے دلا کر اپنے آپ کو کرپشن میں دوسرے نمبر پر کرایا ہے حالانکہ ہم نمبرون تھے کچھ ایسی ہی صورت ہمیں زندگی کے دیگر امور میں درپیش ہے ہم اٹھتے بیٹھتے میرٹ میرٹ کی بات کرتے ہیں لیکن ترقیوں اور پرکشش جگہوں پر تعیناتی کے لئے کہاں کہاں سے سفارشیں اور کہاں کہاں سے زبردست سیاسی دباؤ نہیں ڈلواتے تفصیل میں جانے سے کالم کی طوالت ہو جائے گی وگرنہ ایک طویل فہرست معہ عہدوں کے پیش کی جا سکتی ہے کہ کون کہاں کس کی وجہ سے ہے ایسے افسر بھی موجود ہیں جو پنجاب سے ٹرانسفر نہیں ہوتے اور ایسے بھی افسر موجود ہیں جو مرکز سے صوبوں میں نہیں آتے یہ سب اثر ورسوخ کی باتیں ہیں تعلق داریاں ہیں یارشتے داریاں ہیں اسی طرح ہمارے دیگر شعبوں میں عوام کے کام نہیں نکلتے۔ اس کے لئے بار بار کے چکر پھر سفارش اور پھر وہی بات جس کا حوالہ ہم نے نمبرون ہونے کی صورت میں دیا ہے کہنے کو تو ہم امریکہ اور دیگر بڑی طاقتوں کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں ان کے سخت اقتصادی شکنجے کی بات کرتے ہیں کہ انہوں نے دنیا بھر کے مسائل ہماری جھولی میں ڈال دیئے ہیں لیکن کچھ مسائل ہم نے خود بھی پیدا کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی مثلاً پچھلے دنوں ایک خبر شائع ہوئی کہ اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور میں ابھی تک وائس چانسلر کا تقرر نہیں ہوا اور یونیورسٹی ایک ماہ سے بغیر وائس چانسلر کے چل رہی ہے بھلا بتائیں کہ اس میں امریکہ یا کسی بڑی طاقت کی کیا سازش ہو سکتی ہے اسکا کیا دباؤ ہو سکتا ہے کیا یہ نہیں کہ ہم بروقت فیصلہ کرنے کے عادی نہیں معاملات کو معرض التواء میں ڈالنے میں مہارت رکھتے ہیں کسی سائل کا کام بروقت اس لئے نہیں کرتے کہ اسے ہمارے اختیارات کا احساس کب ہو گا ایک ایک مرحلہ پر ایک ایک لمحہ پر ایسی رکاوٹیں کھڑی کرتے ہیں کہ سائل کی چیخیں نکل جاتی ہیں اور وہ کبھی اس متعلقہ اہلکار کو دیکھتا ہے اور کبھی آسمان کی طرف دیکھتا ہے کہ اے خدا تیرے یہ بندے کب شرف آدمیت سے آشنا ہوں گے۔ کب ہمارے دفتروں میں احساس، خوف خدا اور صرف خدا سے جزا و سزا کا

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

شعور حاصل کریں گے۔ کتنے بے بس، پریشان، اداس لوگ دفتروں کے باہر دھکے کھا رہے ہوتے ہیں ان کے معمولی کام نہیں ہوتے ایک واپڈا کا بل درست نہیں ہوتا اوپر سے بل ادا نہ کرنے کی صورت میں بجلی کٹ جاتی ہے حالانکہ بل ادا ہوتا ہے۔

جو تیری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

دفتری نظام میں کبھی فائل نہیں ہوتی۔ کبھی فائل کا پیٹ نہیں بھرا جاتا کبھی صاحب کے دستخط ہونے باقی ہیں اور کبھی فائل متعلقہ اہلکار کے پاس ہے جو دو ہفتے کی چھٹی پر ہے جب آئے گا تو فائل کو ہاتھ لگائے گا یعنی فائل کوئی مقدس کتاب بن جاتی ہے کہ جس کی زیارت کے لئے ہر وقت نذرانہ مطلوب ہے ورنہ فائل کے صفحات کم بھی ہو سکتے ہیں صفحے مسخ بھی ہو سکتے ہیں مسائل خوف و ہراس کی صورت میں فائل اور فائل سے متعلقہ عملہ کے درمیان ایک سوالیہ نشان بن جاتا ہے۔

ہمارے مضامین ہمارے تجزیے ایک فلاحی معاشرہ کی تشکیل کی آرزوں تک محدود ہوتے ہیں عملہ کیا ہوتا ہے کاش اس کی اصلاح آہنی ہاتھ سے ہو ویسے تو آج تک یہ بھی نہیں معلوم ہو سکا کہ آہنی ہاتھ کیا ہوتا ہے اس کا استعمال اخباروں کی خبروں میں بہت نمایاں ہوتا ہے کہ مجرموں سے قانون شکنوں سے آہنی ہاتھ سے نبٹا جائے گا اور ایسے محسوس ہوتا ہے کہ اب کوئی مجرم باقی نہیں رہے گا۔ پھر یہ آہنی ہاتھ کمزور ہو جاتا ہے اور مجرم عین سڑک پر پوری طاقت اور حماقت سے موجود ہوتا ہے ہم نظام کی بہتری سیاسی استحکام' لیڈروں اور حکومت پر بڑی تنقید کرتے ہیں افسران پر بھی اپنا غصہ نکالتے ہیں لیکن بات سوچنے کی یہ ہے کہ ہم نے اپنے فرائض کب سرانجام دیئے ہیں؟ صرف ہمیں گلہ کرنا آتا ہے دوسروں پر غصہ نکالنا آتا ہے ہر فرد اور ہر ادارے پر گز بھر کی زبان سے چیخنا آتا ہے ہم نے معاشرہ میں کیا کردار ادا کیا ہے۔ صرف کوڑا کرکٹ کو دیکھ لیں ہم اپنا کوڑا کرکٹ اٹھا کر ہمسائے کی چوکھٹ کے پاس پھینک دیتے ہیں مردہ بلی اور چوہے دوسرے کے گھر کی طرف سرکا دیتے ہیں اور اکثر یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ کسی کالے بکرے کی سری عین سڑک کے درمیان رکھ دیتے ہیں جو اس سڑک سے گزرے گا دنیا بھر کی بلائیں اسے چمٹ جائیں گی۔ کیا کیا ٹونے اور کیا کیا حربے ہم دوسروں کو اذیت دینے کے لئے تلاش نہیں کرتے اور پھر باتیں عالمی بنک' افراط زر اور عالمی نظاموں کی کساد بازاری پر کرتے ہیں۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

بڑی طاقتوں اور عالمی نظام نے مضمرات کی باتیں کرنے والے بتائیں کہ یہ کس آرڈر میں لکھا ہے کہ آپ سرخ بتی کی صورت میں ٹریفک کراس کر جائیں تیز رفتاری سے دوسرے کو دھکا دے جائیں سڑک پر چلتے ہوئے ارد گرد سے لاپرواہ چلیں اور اگر کچھ ہو جائے تو گاڑی والے کا جینا حرام کر دیں کہ اندھے ہو گاڑی چلانا نہیں آتا کس طرح سڑک پر نکل آئے ہو۔ کوئی یہ نہیں پوچھتا کہ برادر آپ کا کوئی قصور ہے یا نہیں۔

کہنے کو تو ہم نے ٹریفک کے اشارے لگا رکھے ہیں لیکن عمل کون کرتا ہے ہسپتال' سکول کے قریب ہارن بجانا منع ہے اور وہیں بے ہنگم ہارن بج رہا ہوتا ہے اونچی آواز میں ٹیپ چلانا منع ہے مجال ہے کہ آپ کسی کو روک کر دیکھیں وہ کس طرح آپ کے گلے کا ہار بنتا ہے۔ یہاں پارکنگ منع ہے اور پھر اس کی خلاف ورزی بھی دیکھیں۔ کسی باغ' کسی پارک میں چلے جائیں جگہ جگہ لکھا ہوتا ہے کہ پھول توڑنا منع ہے اور اسی بورڈ کے نیچے بڑے دھڑلے سے آپ کو گلدستے بنتے نظر آئیں گے نئے وزیر کی تقرری ہوتی ہے اس خوشی میں یہ گل دستہ انہیں جلوس میں پیش کرنا ہے اگر ایسا ہی کرنا ہے تو پھر پھول توڑنا منع کیوں ہے ؟

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ملتان کی گل گشت کالونی

ویسے تو ملتان کا ہر گوشہ' ہر کونہ علم و ہنر کا آئینہ دار ہے لیکن جو شرف گل گشت کالونی کو حاصل ہے وہ شہر کے کسی اور حصے کو نصیب نہیں۔ خواندگی کے اعتبار سے یہ حصہ سو فیصد نہ سہی لیکن اسی فیصد سے کم نہیں ہو گا۔ اس کالونی کے وسط میں ایمرسن کالج ملتان کی ترقی یافتہ ارتقائی شکل گورنمنٹ کالج بوسن روڈ موجود ہے اسی حصے میں گورنمنٹ سائنس کالج ہے اس کے ساتھ کمپری ہینسو ہائی سکول واقع ہے ان کے درمیان گورنمنٹ کالج برائے ایجوکیشن ان سے ہوسٹل' ڈائریکٹر کالجز کے دفاتر موجود ہیں کالونی کے اندر کمپر ہینسو گرلز ہائی سکول بھی اپنے عزوو قار کے ساتھ تعلیمی خدمات دے رہا ہے۔ پھر انہیں اداروں کے درمیان بورڈ آف انٹر میڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن موجود ہے اس کے علاوہ ان گنت تعلیمی ادارے فلاحی رفاہی مرکز کام کر رہے ہیں۔ اسی کالونی کے آغاز میں جدید تعلیم جن میں ایم بی اے' کمپیوٹر کی تعلیم کا بندوبست بھی موجود ہے اسی کالونی میں نامور شاعر' ادیب' اخبار نویس اور ماہر تعلیم موجود ہیں جس کے علم و ادب کی کاوشوں کو لوگ احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس کالونی میں اردو اکیڈمی کا ادارہ موجود ہے خواتین کا ادبی فورم ''حریم فن'' بھی موجود ہے اس قدر علمی' ادبی' تہذیبی کاوشوں کا اگر کوئی مستند گھر ہے تو وہ گل گشت کالونی ہے۔ سر سید احمد خاں کی تعلیمی' ادبی اور تہذیبی سرگرمیوں کو زندہ رکھنے کی ایک تحریک ایک علی گڑھ سکول اور کالج بھی اسی کالونی میں موجود ہے۔ ان تمام حوالوں سے گل گشت کالونی منفرد اور ممتاز نظر آتی ہے۔ سکولوں' کالجوں اور اداروں کی وجہ سے کتابوں' سٹیشنری کی دکانوں کی بھی یہاں ایک مضبوط مارکیٹ ہے۔ ہر قسم کی یہاں کتابیں مل جاتی ہیں بلکہ ان کے خلاصے اور گیس پیپرز بھی ہر وقت دستیاب ہیں۔ طالب علموں اور پروفیسروں کی علمی کاوشوں کا اظہار بھی اسی خطے سے ہوتا ہے۔ یہ کالونی صرف پڑھنے لکھنے والوں کی ہی نہیں اہل شہر اہل فن اور بینک کے ماہرین کی بھی ہے۔

گل گشت کالونی کب وجود میں آئی اس ضمن میں کوئی مستند تاریخ نہیں بلکہ قیام پاکستان کے بعد ۱۹۵۰ سے لے کر ۱۹۶۵ کے عرصے میں اس کالونی کی وسعت ہوئی اور اب بڑھ کر ایک طرف سے زکریا ٹاؤن کی شکل اختیار کر گئی ہے اور دوسری طرف نشیمن کالونی' شالیمار

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

کالونی اور لالہ زار کالونی اور ایکسٹینشن کالونی اس کے توسیع اور وسیع تر حصے ہیں۔ گل گشت کے معنی پھولوں کی سیر ہے کسی شاعر نے کیا خوب کہا تھا

گل گشت دگر غنچہ نہ گردو
قربان لب یار کہے غنچہ کہے گل

جب غنچہ پھول بن جائے تو پھر غنچہ نہیں بن سکتا۔ لیکن میرے محبوب کے لب ایسے ہیں کہ اگر مسکرائیں تو غنچہ 'اگر جی بھر کر ہنسیں تو پھول' مگر گل گشت جو کبھی پھولوں' پھلوں اور درختوں کا مرکز تھا اب پھول زیادہ نظر نہیں آتے۔ ایک گول باغ تھا جس میں پھول ہی پھول ہوتے۔ پوری کالونی ان کے گرد سیر کرتی مگر یہ گول باغ گول گپے 'بوتلیں' دکانیں اور شربتوں کے پیمانوں کے لئے وقف ہو گیا ہے۔ مرد یہاں سیر نہیں کرتے 'خواتین کا ایک پارک ہے لیکن بہت بہت چھوٹا ہے۔ پوری آبادی کی خواتین اور بچے یہاں جی بھر کر سیر نہیں کر سکتے۔ کالونی کی سڑکیں اگر کہیں سے سلامت ہیں اور کوئی محقق اگر اسکا کوئی ٹکڑا صحیح سلامت تلاش کر لے تو اسے اعلیٰ سے اعلیٰ ایوارڈ دیا جا سکتا ہے سڑکیں جگہ جگہ سے ٹوٹ پھوٹ گئی ہیں گٹر کھلے ہیں حادثے ہو سکتے ہیں لیکن یہ تو اہل کالونی کی دعاؤں کا اثر ہے اور یہاں کی مسجدوں کی نداؤں کا اعجاز ہے کہ حادثے ٹل جاتے ہیں اور خیر کے دروازے کھل جاتے ہیں۔

جلال مسجد 'بلال مسجد' حیدریہ مسجد اور دیگر مسجدیں اس کالونی کے تقدس اور وقار کی علامت ہیں یہاں ہر وقت ذکر و دعا رہتی ہے۔ گل گشت کالونی جدید تر ہونے کے باوجود قدیم بھی ہے کیونکہ اس کی سڑکیں اور پرانی کوٹھیاں اس کے قدامت کی علامت ہیں۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

Most Welcome

مادی تحفے اور باہمی رابطے محبتوں کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ رشتوں کو مضبوط بناتے ہیں۔ افہام و تفہیم کے دروازے کھولتے ہیں۔ فرد سے لیکر ادارے اور اداروں سے لیکر لمبے فاصلے ان کی وجہ سے سمٹ جاتے ہیں اور ایک Global Access کا ئناتی رسائی کے مرحلے طے ہو جاتے ہیں۔ بعض انسان گفتگو میں اپنے معاملات میں بڑی اچھی شخصیت کے حامل ہوتے ہیں۔ انسان زندگی میں ان سے ایک بار ملتا ہے لیکن بڑے عرصے تک اس کی باتیں اور اس کی یادیں محفوظ رکھتا ہے۔ ان کی اچھائیاں دوستوں میں بیان کرتا ہے۔ اپنی یادیں مرتب کرتا ہے اس شخصیت کے خدوخال اجاگر کرتا ہے اپنے تعلق کے ذرائع بیان کرتا ہے۔ اپنی پہلی ملاقات کے ثمرات سناتا ہے غرضیکہ ایک ملاقات کئی ملاقاتوں کا سبب بنتی ہے کتابوں کا موضوع بنتی ہے اور ایسا سرمایہ بنتی ہے کہ آنے والی نسلیں اپنی تحریر اور تقریر میں انہیں بطور حوالہ پیش کرتی ہیں۔ انہی خوب صورت لمحوں کو محفوظ کرنے اور نکھارنے میں انگریزی کا ایک لفظ Most Welcome بھی ہے۔ بظاہر دو لفظوں پر مشتمل ہے لیکن کہنے والے خلوص اور سننے والے کے جذبات کا ترجمان بن جاتا ہے۔ کہنے والا بڑے اعتماد سے یقین دہانی کراتا ہے کہ میں آپ کا مخلص ہوں آپ کا بہی خواہ ہوں آپ مجھ پر اعتماد کر سکتے ہیں میں آپ کی توقعات پر پورا اتروں گا آپ کے مفادات کا تحفظ کروں گا آپ کے ادارے اور کاروبار کی Goodwill کا خیال رکھوں گا۔

Most welcome ایک خوب صورت 'نفاست' تہذیب اور مٹھاس کے اظہار کا نام ہے۔ آنے والے کو خوش آمدید "جی آیاں نو" کہنے کا لفظ ہے۔ ادھر آپ کے منہ سے کوئی تجویز سامنے آئی ادھر ایکدم اسکی رسائی اس کی منظوری لفظ Most welcome میں ادا ہو گئی۔ سننے والا بھی خوش اور کہنے والے پر بھی رجائیت کا جذبہ غالب رہتا ہے۔

انگریزی اس اعتبار سے خوش نصیب زبان ہے جس نے لفظوں کی شکل میں اچھے تحفے دیئے ہیں جن میں لفظ "موڈ" جس کا استعمال کچھ یوں ہوتا ہے کہ "آج موڈ نہیں کل آنا" جیسے گانے جسے سن کر والدین کے چہرے سرخ ہو جاتے ہیں اور بعض نشریاتی ادارے اپنے گانے اس انداز سے نوجوانوں کو دکھاتے ہیں جیسے وہ جھوم رہے ہیں اور خوشی سے پاگل ہو رہے ہیں

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

اور تہذیب کے سنجیدہ عناصر اس المیہ اور اس سوچ پر حیران ہوتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ ایسے گانے کو کون پاس کرتا ہے اور کون ان کی دھنیں بناتا ہے اور کون ان کی منظوری دیتا ہے ایسے لگتا ہے کہ ہم نے انگریزی کو اپنی زندگی پر مسلط کر لیا ہے اور اس کے لفظوں کو بغیر سوچے سمجھے اس طرح استعمال کر رہے ہیں جیسے ان کا کوئی متبادل موجود نہیں یا ان سے بہتر کوئی مفہوم نہیں۔ ہماری اپنی زبانیں امیر ہیں ان میں لفظوں کی کوئی قلت نہیں۔ اردو کا دامن وسیع ہے اس پر انگریزی کا بوجھ نہ ڈالا جائے ورنہ وہی بین الاقوامی حربے وہی مفاد پرستانہ سوچ ہماری زندگی کے گرد جالے کی طرح چھا جائے گی اور ہماری معصوم سوچ انہی کے گرد رہ جائے گی جو دنیا بھر میں مغربی اقوام نے سفارتی حلقوں میں پیدا کر دی ہے۔

Most welcome بظاہر خوش آئند، خوشگوار، اچھے اور مخلصانہ جذبات کے اظہار کا عزم ہے لیکن اس کی تہہ میں وہی سوچ کار فرما ہے کہ فی الحال میری جان چھوڑیں بعد میں دیکھا جائے گا۔ لوگ اپنے وقت، کاروبار کو بچانے کے لئے اس لفظ کا سہارا لیتے ہیں۔ اچھے جذبوں کا اظہار کرتے ہیں لیکن دوسرے لمحوں میں صرف لفظوں کی حد تک عمل کرتے ہیں بعض گفتار کے غازی اور کردار سے عاری جذبات کا اس سے زیادہ اظہار ممکن نہیں۔ Most welcome مثبت اور منفی جذبوں کے خوب صورت کے تاثر کا نام ہے اس سے اندازہ لگانا کہ کہنے والا وقعی مخلص ہے بہت مشکل ہے یہ خلوص اور غیر خلوص کے دونوں معنی میں استعمال ہوتا ہے بظاہر خوشگوار تاثر اور پوشیدہ معنی میں وقتی طور پر ٹالنے کا مجرب نسخہ ہے۔ کیا ایسا ممکن نہیں کہ ہم ایسے لفظوں سے جان چھڑائیں جو ہماری شخصیت کو دو حصوں میں بانٹتے ہیں اور ہمارے خلوص کو شک کی دلدل میں پھنساتے ہیں۔

Most welcome مصنوعی مسکراہٹ ہے اندر کے کرب کا اظہار نہیں۔ زخم کے اوپر بندھی پٹی ہے بڑھتے ہوئے زخم کا علاج نہیں۔ ایک اچھا معالج مسیحائی میں جو معیار کا قائل نہیں ہوتا یا علاج ہوتا ہے یا مریض کو فارغ کر دیا جاتا ہے۔ Most welcome کے مصنوعی سہارے پر زندہ نہیں رہا جا سکتا۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

”جلنے والے کا منہ کالا“

بعض عوامی جملے عالمگیر سچائیوں کو اپنے اندر چھپائے ہوتے ہیں اور انسانی نفسیات کی ایسی نمائندگی کرتے ہیں کہ انسان حیران ہوتا ہے کہ ایسا واضح اور بلیغ اشارہ اس جملہ کے علاوہ اور ممکن ہی نہ تھا ساری کی ساری کیفیت دل و دماغ میں بیٹھ جاتی ہے۔ انہی عوامی جملوں میں ایک عام فہم جملہ اکثر سننے کو اور اکثر ٹرکوں بسوں کے پیچھے پڑھنے کو ملتا ہے کہ ”جلنے والے کا منہ کالا“ پہلے ایسے جملے پڑھ کر حیرت ہوتی تھی کہ لوگ اس قدر سادہ زبان میں دوسرے کے لئے ایسی بد دعائیں کیوں دیتے ہیں اور اس قدر تلخ کیوں ہو جاتے ہیں۔ تحریر کا ایک ایک لفظ دوسرے انسان کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے ایک ایک جملہ سے دوسرے انسان کی صحت مزاج کا اندازہ ہوتا ہے جہاں جملے میں تلخی آئی اندازہ لگانے والے بخوبی اندازہ لگا لیتے ہیں کہ مزاج دشمناں ٹھیک نہیں یا معدہ خراب ہے کھٹے ڈکار آرہے ہیں یا متلی کا امکان ہے یا نظام اخراج درست نہیں ایسی حالتوں میں جملے تلخ ہو جاتے ہیں بد گمانیاں بڑھ جاتی ہیں بیمار ذہنیت پیدا ہو جاتی ہے ہر شخص میں برائی ہر بات میں برائی اور ہر نظام میں خرابی نظر آنے لگی ہے ایسے انسان کے لئے ماہرین علم ابدان تجویز کرتے ہیں کہ وہ منہ میں الائچی خورد مصری اور سونف استعمال کرے اور پیٹ کو ایک آدھ دن بیسار خوری سے بچائے انشاء اللہ اس کے بعد ہر چیز صاف ستھری نظر آئے گی ہر شخص پاکیزہ اطوار کا پیکر دکھائی دے گا اور خود ایسی تحریریں اور ایسی باتیں کہنے والا اپنے اندر ضمیر کا مجرم دکھائی دے گا جو فرد سے لیکر افراد تک نظام سے لیکر کائنات تک ادارے سے لیکر ریاست تک کھوجی کی طرح برائیاں ڈھونڈتا ہے بہادر شاہ ظفر نے کچھ ایسے ہی لوگوں کے بارے کہا تھا کہ جب ان کی اپنی برائیوں پر نگاہ جاتی ہے تو دوسرے ان سے کہیں بہتر نظر آتے ہیں المیہ یہ ہے کہ کچھ عرصہ سے ہمارے معاشرہ میں معدہ کا مرض بڑھ گیا ہے خوراک صحیح اور بروقت نہیں ملتی حرص اور حسد کی مقدار اس میں اس قدر زیادہ ہے کہ ہر شخص کو مجبوراً اپنے دروازے اپنے دفتر اپنی گاڑی پر لکھوانا پڑتا ہے کہ جلنے والے کا منہ کالا حالانکہ ایسی تحریریں کسی مہذب معاشرے کے باشعور تعلیم یافتہ افراد کی نمائندگی نہیں کرتیں لیکن کیا کریں معاشرے میں حسد کی وبا اس تیزی سے پھیلی ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان پر جب تک کیچڑ نہ پھینک لے اسے چین نہیں آتا اور ایسی سوچ

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

معاشرے میں پروان چڑھی ہے کہ ایسے موقعوں پر ہمدردی کی بجائے باتوں میں لطف اٹھایا جاتا ہے ایسے واقعات کو سننے والا کہنے والے کو ٹوکتا نہیں کہ میاں کیوں کسی کی بلاوجہ برائی کرتے ہو کیوں اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھاتے ہو غیبت کرنا اور سننا دونوں فعل قبیحہ ہیں مگر ایمان کی یہ کمزور علامت بھی مزید کمزور ہو گئی ہے اس لئے کہنے والا جی بھر کر اپنی نفرتوں کا اظہار کرتا ہے اور سننے والا اپنا فرض سمجھتا ہے کہ جو سنے اسے بغیر کسی تصدیق کے اور بغیر کسی سچائی کے اسے آگے پھیلائے اس طرح کی ''مشقتیں'' پورے ماحول کو ''غیبتوں کا گھر'' بنا دیتی ہیں اور انسان بدگمانیوں کی دنیا میں ایسا الجھ جاتا ہے کہ اسے ہر شخص دولت کا پجاری مال اکٹھے کرنے کا ماہر حالانکہ وہ شخص نان جویں پر گزارہ کر رہا ہوتا ہے پیٹ پر پتھر باندھ کر زندگی کی صحت مندانہ اقدار کو فروغ دے رہا ہوتا ہے صالح اقدار پر ان تاریک قوتوں کے حملے کسی شب خون سے کم نہیں ہوتے انسان اس قدر پستی میں جا سکتا ہے دیکھنے والا ورطہ حیرت میں رہ جاتا ہے معاشرہ اس اقدار سے جب تہی دست ہو جاتا ہے تو پھر قطرے سے گہر بننے ذرہ سے آفتاب بننے محنت و مشقت سے مقام بنانے والا باعث عزت نہیں باعث زلت بن جاتا ہے جیسے لفظ ریڈی میڈ Self made ہو جاتے ہیں حالانکہ ماضی قریب میں محنت اہلیت صلاحیت سے مقام حاصل کرنے والے کو لوگ عزت سے دیکھنے آتے تھے اس کے منہائی پھول لاتے اسے تحفے تحائف دیتے اور اس کے ساتھ تصویر بنواتے کہ یہ وہ شخص ہے جس نے سی ایس ایس میں ٹاپ کیا ہے مقابلے کے امتحان میں اول آیا ہے یہ وہ شخص ہے جس نے اسٹیشن کے کھمبوں کے نیچے بیٹھ کر علم حاصل کیا اور آج اتنے کلیدی منصب پر فائز ہو گیا ہے یہ وہ شخص ہے جس نے مسجد کی چٹایوں پر بیٹھ کر ایم اے کیا اور باہر کی دنیا سے اعزازات حاصل کئے مگر اب ایسا نہیں ایسے شخص پر پہلا تبصرہ یہ ہوتا ہے اس شخص نے کچھ دے دلا کر یہ مقام حاصل کیا ہے جی بھر کر خوشامد کی ہے جب اسے یہ مقام ملا ہے عمر بھر جلنے محنت کرنے اور بھوکے پیاسے رہ کر ریاضت کرنے والا کون تھا اگر یہ سب کچھ اتنا آسان ہے تو پھر آپ ایسے مقام حاصل کیوں نہیں کر لیتے کون سی رکاوٹ ہے کون سے راستے مسدود ہیں۔ تمہارا ہاتھ کس نے پکڑ رکھا ہے لیکن حسد نے تمہارے ہاتھ منجمد کر دیئے ہیں تمہاری صلاحیتوں نے تمہیں غیبت کی ایسی دلدل میں پھنسا دیا ہے کہ اول آنے والا محنت کرنے والا تمہیں نظر نہیں آتا تمہارا تو جی چاہتا ہے کہ تم اسکے منہ کا نوالہ چھین لو لیکن مکافات عمل بھی

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

کسی عمل کو کہتے ہیں جسے قدرت عزت دے اسے کوئی مائی کا لال چھین نہیں سکتا ورنہ دنیا بھر کے کمزور مظلوم یتیم بچے مرنے سے پہلے مر جاتے۔ انہیں بچانے والا ان کی حفاظت کرنے والا آسمان پر نہیں شہ رگ کے قریب ہے اور وہ اپنی قدرت پر قادر رہے کسی کے ہاتھ خالی زبان لمبی اور کسی کو خاموشی مگر علم کی دولت سے نوازتا ہے لیکن یہ سب کچھ صحیح درست ہے لیکن احتیاط یہ ہے کہ آپ اپنے مکان گاڑی پر یہ تحریر ضرور لکھوائیں کہ جلنے والے کا منہ کالا اسی میں عافیت ہے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ڈیرہ غازی خان میڈیکل کالج کا منتظر ہے

پچھلے دنوں لاہور میں یو جی سی کی سطح پر جانوروں کے تحفظ اور ان کو بیماریوں سے بچانے کے حوالہ سے مؤثر نصاب کی ضرورتوں پر اعلیٰ سطح کی میٹنگ ہوئی جس میں ہمیں بھی شرکت کا شرف حاصل ہوا۔ پاکستان ایگری کلچر ریسرچ کونسل (PARC) اسلام آباد کے ایک ماہر نے بتایا کہ ہم نے ہر شعبے میں تحقیقات کو فروغ دیا ہے۔ اور اعلیٰ سطح کی ریسرچ ڈائریکٹریاں مرتب کی ہیں۔ میں ان سے پوچھا کہ کبھی آپ کی کونسل نے ورٹ منرو' وہوا' تونسہ اور دیگر پہاڑی علاقوں اور سلسلہ کوہ سلیمان میں پرورش پانے والے جانوروں کے بارے میں سوچا اور کبھی ان بھیڑ' بکریوں کا علاج دریافت کیا۔ جن کی جلد کو اندر سے کیڑے چمٹ جاتے ہیں اور ان کی صحت اور نسل کو متاثر کرتے ہیں اس پر انہوں نے جواب دیتے ہوئے کہا "یقیناً" آپ کبھی اسلام آباد آکر ہماری تحقیقات کو ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ میں ان سے ادب سے کہا کہ میں خود آؤں یا تونسہ کی بھیڑ بکریوں کو بھی ساتھ لاؤں تاکہ وہ جدید تحقیقات کے مجلے' رسالے اور کتابیں خود دیکھ سکیں جن میں ان کا علاج موجود ہے۔ کیا ایسا ممکن نہیں کہ یہ تحقیقات "USERS" تک پہنچ سکیں اور ان کو عام فہم زبان میں سمجھایا جا سکے کہ وہ اپنے جانوروں کا کس طرح علاج کرائیں۔ ان کی نسل کو بچائیں بلکہ اس حد تک بڑھائیں کہ وہ ملک کی معیشت اور زر مبادلہ کے حصول میں مددگار ہیں۔

چند روز ہوئے ڈیرہ غازی خان کے مشہور قصبے مانہ حمدانی کے ایک دانشور جناب رب نواز خاں سے ملاقات ہوئی تو میں نے انہیں اس میٹنگ کے حوالے سے بتایا کہ ڈیرہ غازی خان کے جانوروں جس میں داجل کا بیل' کوہ سلیمان کی بھیڑ بکریاں شامل ہیں بڑی تحقیق ہو رہی ہے تو انہوں نے قدرے مسکراتے ہوئے کہا کہ ان بھیڑ بکریوں کو چھوڑیں اور ان انسانوں کے بارے بات کریں جو ان پہاڑوں میں بستے ہیں علاج معالجے کے لئے ترستے ہیں ایک مریض کو پہاڑ سے ڈیرہ اور پھر جب نشتر ہسپتال ملتان لاتے ہیں غریبوں کی ساری بکریاں بک جاتی ہیں عمر بھر کی پونجی مہنگے داموں اور ڈاکٹروں کی بھاری فیسوں پر صرف ہو جاتی ہیں مریض بچ گیا تو کچھ سہارا مل جاتا ہے اور اگر خدانخواستہ مریض دنیا سے چل بسا تو پہاڑوں کی غاروں میں رہنے والے ہمیشہ کے لئے غاروں کے اندھیروں میں غرق ہو جاتے ہیں۔ کیا آپ

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

نے کبھی ان کے چہروں کو نہیں دیکھا بھوک 'افلاس 'ان گنت کی بیماریوں کی وجہ سے زرد پڑ جاتے ہیں۔ مفلسی حس لطافت کو برباد کر دیتی ہے۔ انہیں روٹی نہ ملنے کا غم اور بیمار ہونے کی صورت میں علاج سے محروم ہونے کا صدمہ کوئی بڑا کام کرنے نہیں دیتا۔ کوئی ادب 'کوئی تحقیق کوئی شعر و سخن کا عظیم سرمایہ سامنے کیوں نہیں آتا اس لئے کہ ان کے پاس وسائل نہیں۔ یہ نہیں کہ انہیں درد 'کرب 'احساس کی شدت کے اظہار کی صلاحیت نہیں وہ پہاڑیوں میں اعلیٰ ادب تخلیق کرتے ہیں لیکن وہ صرف پہاڑوں اور ان کے مضافاتی علاقوں کی فضاؤں میں دم توڑ دیتا ہے ان کی داد فریاد کی بازگشت صرف رود کہیوں اور پہاڑوں کی چوٹیوں تک ہے۔ مقتدرہ قومی زبان اور اکادمی ادبیات اسلام آباد کو ان کے بارے اور ان کو ان کے بارے کوئی علم نہیں۔

ڈیرہ غازی خان کی نئی نسل جس حد تک تعلیم اور خاص طور پر میڈیکل اور انجینئرنگ کے شعبے میں بڑھ رہی ہے بورڈ کے نتائج اور تعلیمی سہولتوں کی وجہ سے ڈیرہ غازی خان اپنا حق رکھتا ہے کہ اسے ایک میڈیکل کالج ملے اسے ایک اچھا معیاری اور جدید سہولتوں سے آراستہ ہسپتال ملے جو ڈیرہ غازی خان سے لیکر ڈیرہ اسماعیل خان تک کے مریضوں کے لئے کافی ہو۔ ایک طرف کشمور 'کندھ کوٹ اور فورٹ منرو 'بارکھاں تک کی ضرورتوں کو پورا کرے اور دوسری طرف لیہ 'بھکر 'دریا خان 'میانوالی کے مریضوں کو مسیحائی فراہم کرے۔ اگر فیصل آباد میں میڈیکل کالج بن سکتا ہے بہاولپور ڈویژن میں میڈیکل کالج قائم کیا جا سکتا ہے تو ڈیرہ غازی خان جو وسیع و عریض خطے پر مشتمل ہے جس کی آبادی تقریباً دس لاکھ ہے جس کے مضافاتی حلقے ایک عرصے سے ہسپتال اور میڈیکل کالج کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ اصولاً انہیں ایک ٹیکنیکل یونیورسٹی ملنی چاہیئے ائرپورٹ یقیناً بڑے لوگوں کی ضرورت تھی مگر غریب صحت چاہتے ہیں جو ایک ہسپتال پوری کر سکتا ہے طالب علم اپنے مستقبل کے لئے میڈیکل کالج چاہتے ہیں تاکہ وہ دیگر خطہ کے نوجوانوں کی طرح وطن عزیز کی مؤثر خدمت کر سکیں نشتر میڈیکل کالج ملتان بڑھتی ہوئی آبادی اور طلبہ و طالبات کے مسلسل اضافہ کو نہیں سنبھال سکتا۔ عوامی اور سماجی حلقے اب بڑی دردمندی سے محسوس کر رہے ہیں کہ مخدوم رشید یا قادر پور راں میں نشتر ہسپتال جیسا ایک ہسپتال چاہتے جو وہاڑی 'بورے والہ 'عارف والہ 'پاکپتن کے مریضوں کو طبی سہولتیں فراہم کر سکے اسی طرح خانیوال 'کبیر والہ 'عبدالحکیم 'مخدوم پور

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

پہوڑاں 'تلمبہ' میاں چنوں' شور کوٹ' چیچاوطنی تک کے افراد کی ضرورتوں کو پورا کر سکے۔ اب ہماری صوبائی اور مرکزی صحت وزارتوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان خطوط پر نئے پروجیکٹ' نئی تجاویز کو علمی شکل دیں اور اس کے لئے وزارت خزانہ سے مخصوص بجٹ حاصل کریں تاکہ یہ علاقے جو تمدنی اور طبّی سہولتوں سے گزشتہ پچاس سالوں سے محروم ہیں اس گولڈن جوبلی سال میں اپنی خدمات کا صلہ پائیں۔ ڈیرہ غازی خان کا حق فائق ہے کہ اس لئے کہ اس خطے کی محرومیاں اور حرماں نصیبیوں کی داستاں طویل ہے اس خطے کے بارے کبھی سنجیدگی سے نہیں سوچا گیا۔ اس کی حرماں نصیبی کا تو یہ عالم بھی بڑا کرب انگیز ہے کہ پورے شہر میں ایک جیسا پانی نہیں ملتا۔ کمیٹی کے ایک طرف مشرقی حصہ میں پانی کی خصوصیات ایک ہیں اور دوسری طرف جنوب میں پانی مختلف ہے۔

کچھ بااثر حلقے جن میں حکام بھی ہو سکتے ہیں وہ نونسہ بیراج اور ایسے پانی منگواتے ہیں اور غریب ڈیرہ کا جیسا بھی پانی ہے پیتے ہیں خوش نہ بھی رہیں مگر گلہ کسی سے نہیں کرتے۔ کس کس کو زخم دکھائیں' ڈرتے ہیں کہ کوئی عطائی معالج زخم کو بگاڑ ہی نہ دے پھر کہاں سے سرمایہ لائیں گے کہ وہ زخم کا علاج اٹامک انرجی جیسے ادارے کی شعاعوں سے کر سکیں گے۔ اس لئے وہ زخم دکھانے میں گھبراتے ہیں کیونکہ اہل سیاست ان سے زخموں کی بنیاد پر ووٹ لیتے ہیں علاج نہیں دیتے۔ ڈاکٹر ان سے فیس لیتے ہیں علاج وہ نہیں کرتے جس سے آرام آ جائے۔ اب ڈیرے والوں کی نظر صرف اور صرف اپنے ہسپتال (سول ہسپتال نہیں) جہاں سے کچھ نہیں ملتا اور میڈیکل کالج کے قیام پر ہے اگرچہ ڈیرے والوں کی آواز لاہور اور اسلام آباد میں سنی جا سکتی ہے دونوں جگہوں پر بھرپور نمائندگی' مؤثر قیادت اور مؤثر طاقت موجود ہے اب ڈیرے کو کچھ نہ ملا تو کب ملے گا؟ آپ بھی سوچیں اور ہم بھی سوچتے ہیں کہ ان بڑے لوگوں میں کوئی ایسا ہے جو انہیں میڈیکل اور ہسپتال دلا دے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

گولڈن شیک ہینڈ

''گولڈن شیک ہینڈ''کتنا دلنشیں' پیارا اور خوبصورت جملہ ہے بظاہر تین لفظوں پر مشتمل ہے لیکن بلا کی کشش رکھتا ہے' گولڈ سونا ہے اور گولڈن سنہری' شیک ہینڈ ہاتھ ملانے کو کہتے ہیں ان تین لفظوں میں اتنی چاشنی ہے کہ جی چاہتا ہے کہ ایسے سنہری ہاتھ بار بار ملائے جائیں اور کئی بار ملائے جائیں' خالی خولی ہاتھ ملانے کا کیا فائدہ' کیوں نہ گولڈن شیک ہینڈ کیا جائے ادھر ہاتھ ملایا ادھر معقول واجبات کی تھیلی تھمادی گئی' اس کے باوجود پنشن اور دیگر مراعات جوں کی توں رہیں گی' گولڈن شیک ہینڈ بزنس اینڈ ایڈمنسٹریشن کی اصطلاح ہے جس میں مالک کو اختیار حاصل ہوتا ہے کہ "Hire and Fire" کا حق استعمال کرے جسے چاہے بلالے اور جسے چاہے کھڑے کھڑے فارغ کردے ایک بینک کی انتظامیہ کا طریقہ مجھے بے حد پسند ہے کہ جب کسی سے ناراض ہو جائے ایک بار دفتر بلاتے ہیں اور نہایت شفیق انداز سے کہتے ہیں کہ ''جاتے ہوئے کیشیئر سے ملتے جائیں''کیشیئر بھی ایسا مستعد کہ تمام واجبات اور تمام کٹوتیاں مکمل کر کے لفافہ تیار رکھتا ہے تاکہ جانے والے کا دل نہ دکھے اور وقت بھی ضائع نہ ہو۔

گولڈن شیک ہینڈ مالک اور ملازم کے درمیان رضا کارانہ معاہدہ ہے خود ریٹائرمنٹ طلب کرنا اس لئے بہتر ہے کہ اس میں عزت و آبرو قائم رہتی ہے روز روز کی جھاڑ پٹی سے جان چھوٹ جاتی ہے رجسٹر حاضری پر دیر سے آنا اور ہر ایک لمحہ کا حساب دینا ہر فائل اور ہر ڈرافٹ پر صاحب کی طوطا کی طرح چونچ بدلنے والی قلم سے Nast Remarks پڑھنا کتنا اذیت ناک ہے اس سے بہتر نہیں کہ آدمی خود سے تیار ہو کر صاحب کو کہے کہ حضور اب میرا اور آپ کا گزارہ ممکن نہیں میرے لئے مشکل ہو گیا ہے کہ میں یہی کہتا رہوں کہ "Boss is always right" ''صاحب ہمیشہ درست ہیں''کیونکہ نوکری میں ایسا کرنا اور کہنا پڑتا ہے نوکری کی دوسری شکل چاکری کی ہے یعنی صاحب کے در کی چاکری کرنا اس کے ایک ایک کام میں جی بھر کر حصہ لینا اور اسکے گھر کے ہر فرد کو ادباً تعظیماً جھک جھک کر سلام کرنا کہ کہیں گھر کا کوئی یونٹ ''صاحب'' کے کان نہ بھر دے بلکہ صاحب کے عزیزوں دوستوں اور ''منہ چڑھے'' ''حضرتوں''کا بھی خیال خاص رکھنا دراصل نوکری کو پکا کرنے کا ایک ادنیٰ ہنر ہے ایک ادنیٰ ملازم گھر' دفتر اور دفتر کے باہر پھیلے ہوئے ان گنت سوالات میں زندگی گزارتا

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ہے اور اس پیٹ کی خاطر کیسے کیسے صدموں کو برداشت کرتا ہے' کہیں اسمبلی سوالات' کہیں محکمانہ کاروائی' کہیں بے نام گمنام مراسلے' کہیں ادھر سے شکایت کہیں اُدھر سے شکایت کہیں عملے کے مسائل' کہیں غیروں کے شکوے اور ان سب کے درمیان اگر کوئی الجھی ہوئی شخصیت ہے تو وہ "ملازم" کی ہے جسے زندگی میں پہلی بار موقع دیا جارہا ہے کہ "اے غمگیں انسان" اپنے غم بھول جا۔ سیدھا صاحب کے کمرے میں جا سنہری مصافحہ کر اور گھر چل' تیرے دکھوں کا یہی مداوا ہے جتنی نوکری کرلی غنیمت ہے اب محلے میں کوئی اچھی سے دکان کھول اور ٹھاٹھ سے اخبار پڑھ اور غم جاناں اور غم جہاں سے آزاد ہو جا۔

کہتے ہیں کہ گذشتہ پندرہ سولہ برسوں میں برطانیہ اور یورپ کے دیگر خطوں میں جب صنعتی بحران آیا اور صنعتی یونٹ Close down ہونے لگے تو یورپ والوں نے پہلی بار Golden shake hand کی اصطلاح ایجاد کی کہ کچھ دے دلا کر ان پرائیویٹ ملازمین کو فارغ کیا جائے تاکہ مزید صنعتی بحران سے بچا جائے اب پاکستان میں پہلی بار حکومتی سطح پر ایسا فارمولا زیر غور ہے وفاقی حکومت نے ایک ایسے پیکیج کا اعلان کیا ہے تاکہ اپنے اخراجات کم کرسکے موجودہ ملازمین میں کمی کرسکے اور نئی بھرتی پر پابندی لگا سکے اگرچہ عمر کا بھی ایک مسئلہ تھا کہ اسے ۵۵ سال تک کیا جائے یا ۵۸ سال تک رکھا جائے مگر سردست اس کی تردید منصوبہ بندی کمیشن کے چیئرمین ڈاکٹر حفیظ پاشا نے کردی ہے کہ کسی ملازم کو ۶۰ سال سے پہلے ریٹائر نہیں کیا جائے گا۔ یہ خبر حوصلہ افزاء ہے لیکن نئی بھرتی پر پابندی کا کوئی قانونی جواز نہیں نئی نسل کہاں جائے' اگر اتنی تعلیم اتنی محنت کے بعد انہیں روزگار نہیں ملے گا تو پھر وہ کون سے کام معاشرے میں کریں گے نوجوان نسل کو بے کار بٹھا کر ملک اور معاشرہ میں تبدیلی لانا ممکن نہیں' اس ضمن میں وزیر خزانہ اور منصوبہ بندی کمیشن کے چیئرمین کو ٹھنڈے دل کی بجائے گرم جذبات سے سوچنا چاہیئے کہ ہم نوجوان نسل کو کیا بنانا چاہتے ہیں اور انہیں معاشرہ میں کیا کردار سونپ رہے ہیں۔ وسائل کم ہیں تو انہیں بڑھایا جا سکتا ہے اس کے لئے کئی متبادل سکیمیں موجود ہیں۔ گولڈن شیک ہینڈ ضروری سہی مگر یہ بھی دیکھنا پڑے گا کہ جن لوگوں نے اپنی جوانیاں ان صنعتوں' اداروں اور بینکوں میں کھپا دی ہیں اور عمر کی اب اس دہلیز پر ہیں جہاں فلاحی معاشرہ کو ان کا خیال رکھنا چاہیئے ہم انہیں انسانی اقدار سے منافی سکیم جبری سبکدوشی' جبری ریٹائرمنٹ سے عدم تحفظ کی دنیا میں دھکیل رہے ہیں وہ اس عمر میں

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

کہاں جائیں گے ؟

جن کی سروس زیادہ ہے اور باقی ریٹائر ہونے والا پریڈ کم ہے انہیں نقصان در نقصان ہے البتہ جن کی عمر ابھی سروس کے لئے کافی ہے انہیں ۶۰ تنخواہیں مل جائیں گی اور دیگر تمام مفادات اور مراعات بھی ملیں گی تو ان کے لئے ان سکیم سے فائدہ ہے مگر حکومت ان تمام مراعات اور مفادات کا مشترکہ فارمولا پیش کرے تاکہ ملازمین سوچ سکیں انہیں اب کیا کرنا ہے رضاکارانہ ریٹائرمنٹ لینی ہے یا نوکری کو جاری رکھنا ہے بعض بینکوں نے اپنے عملہ کو تنخواہ کے بنیادی سکیل میں بارہ ہزار سے اٹھارہ ہزار روپے تک دیئے ہیں جبکہ کچھ بینک کے سکیل مختلف ہیں اس لئے وہ یکساں سکیل کے آرزومند ہیں اگر انہیں اس فارمولے میں ایڈجسٹ کر لیا جائے تو وہ بھی گولڈن شیک ہینڈ کے لئے تیار بیٹھے ہیں' ہمارے ایک دیرینہ ساتھی خورشید احمد خاں نے بتایا کہ یہ سکیم ہر اعتبار سے مفید ہے بشرطیکہ اسے مزید عملی شکل اور مربوط بنیاد پر جاری کیا جائے تاکہ کسی کو گلہ شکوہ کا موقع نہ ملے اور اس طرح نئے لوگ' نئے تجربے اور مہارت کے ساتھ عملی میدان میں آئیں گے جو ملک کے لئے انتہائی مفید ہے گولڈن شیک ہینڈ نہ صرف حکومت کو اپنے اخراجات پر قابو پانے اور معیشت کو سنبھالا دینے کا عزم ہے بلکہ ملازمین کو بھی اپنے بچوں کے معاملات سنوارنے ان کی شادیاں ان کے گھر بنانے اور اپنے قرضے اتارنے کا سنہری موقع ہے تاکہ آسودگی خوشحالی سے باقی ماندہ زندگی کو گذارہ جائے۔ کوئی فلاحی سکیم نکال کر' کوئی کاروبار کر کے' کوئی ادارہ بنا کر ملک کے یہ تجربہ کار لوگ معاشرے میں انقلاب لا سکتے ہیں۔ بشرطیکہ ان کو جائز مراعات ملیں۔ ان کے مفادات کا مکمل تحفظ ہو۔ موجودہ مہنگائی کو مدنظر رکھا جائے ان کی ان خدمات کو جو انہوں نے خون پسینہ بہا کر گلشن کو نکھارنے اور ان کے تحفظ میں صرف کی ہیں۔

اگر یہ سب کچھ ہے تو آیئے صاحب کے دفتر چلیں اور اسے بتائیں کہ صاحب جی۔ اپنا ہاتھ بڑھایئے۔ بندہ Gold shake hand کے لئے حاضر ہے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ملتان کی وحدت کالونی

ون یونٹ نظام کے بارے تعریف کرنے والے کہتے ہیں کہ پاکستان بننے کے بعد تاریخ کا یہ اہم یادگار واقعہ تھا جب ۲۸ مارچ ۱۹۸۸ء کو ون یونٹ نظام کو آخری شکل دی گئی اور مغربی پاکستان میں نواب مشتاق احمد گورمانی کو مغربی پاکستان گورنر بنایا گیا اس نظام کے مخالف اس کے نقائص کی ایک طویل فہرست لئے پھرتے ہیں کہ ہمیں اپنے بنیادی حقوق سے محروم دیا تیسرا طبقہ وہ ہے جو اس کے خاتمے کے خلاف ہے کہ اس طرح ہم نے وحدت کو نقصان پہنچایا اور جنرل یحیٰ خاں کو کوئی حق نہیں تھا کہ وہ آئین اور قانون کے طے شدہ مسئلہ کو چھیڑے اور اس کے خاتمے کا اعلان کرے۔ بہر حال یہ ماضی کے اندیشے حکمرانوں کی سوچ کے انداز اور تاریخ کے خوش آئند اور المیوں کی ایک پریشان کن داستان ہے اور سقوط ڈھاکہ کی صورت میں جو المیہ ہمیں ملا اس کا سبق ہم نے کتنی سنجیدگی سے لیا اور ان کے اثرات اور مضمرات پر کتنی گہری نظر سے سوچا یہ سارے موضوعات تحقیق طلب اور غور فکر کے حامل ہیں جو مزید تحقیق کی راہیں دکھا سکتے ہیں سر دست ہمیں ون یونٹ نظام میں طے کئے جائے والے ان امور میں سے صرف ایک امر پر گفتگو کرنی ہے اور وہ ہے وحدت کالونی یعنی ون یونٹ کے تحت ٹرانسفر یا تبدیل ہونے والے ملازمین کی سرکاری رہائش گاہیں جن کی وجہ سے امور مملکت بہ حسن و خوبی سرانجام دے سکیں وحدت کالونیوں میں جنہیں شہرت ملی وہ ملتان کی وحدت کالونی اور لاہور کی وحدت کالونی شامل ہیں لاہور کو اس کئے اہمیت ملی کہ وہ صوبہ کا مرکز تھا اور یہ وحدت کالونی آج بھی وہاں موجود ہے جس کی وجہ شہرت دو سٹاپ ہیں ایک نقشہ سٹاپ جہاں آج کل نقشہ موجود نہیں ایک آخری سٹاپ جس کی ساری پہچان غائب ہے۔ مال روڈ اگر لاہور کا دل ہے تو وحدت کالونی لاہور کا دماغ ہے اور ملتان کے درمیان مواصلات کا وہ ذریعہ ہے جس سے ایک طرف مال روڈ ہے اور دوسری طرف ملتان روڈ ہے ملتان کی وحدت کالونی کیونکہ بغیر نقشہ کے بنی ہے اس لئے اس کا کوئی سر، پیر نہیں، ایک طرف اس کے شمس آباد ہے اور دوسری وستی باوا صفرا ہے چوک رشیدہ آباد کی سڑک جو دولت گیٹ کو جاتی ہے اسے اس خوبی سے منقطع کرتی ہے کہ مغربی اور مشرقی پاکستان کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے ایک طرف بڑے افسر اور بڑے گھر اور دوسری طرف چھوٹے افسر اور

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ان کے چھوٹے گھر سوائے چند نئے گھروں کے جن میں ہمارے اپنے عزیز رہتے ہیں لیکن انہیں بھی گلہ ہے کہ ان کے گھر بلڈنگ ڈیپارٹمنٹ نے صحیح تعمیر نہیں کیے کبھی چھت ٹپکتی ہے اور کبھی گھر کے سامنے پانی موجود رہتا ہے ویسے ملتان کی وحدت کالونی ایک وضعدار، نفیس الطبع افراد پر مشتمل ہے تمدنی سہولتوں کی ممکن ہے کبھی بات ہوتی ہو مگر اس میں سیاسی اندازِ فکر ہرگز نہیں جبکہ لاہور کی وحدت کالونی کا ہر گھر سیاست کا گڑھ ہے جب کبھی انتخاب کا وقت آتا ہے ہر گھر سے آواز اٹھتی ہے کہ وحدت کالونی کے گھر ہمیں الاٹ کر دو کیونکہ سوڈیوال کے گھر رہنے والوں کو مل چکے ہیں اور ہر گھر میں رہنے والوں میں وحدت کالونی لاہور کے گھروں کو اس طرح تبدیل کیا ہے کہ ہر گھر تقریباً دکان کی شکل اختیار کر گیا ہے تجاوزات میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی جس کے جی میں جس قدر آیا ہے اس نے اردگرد کے سارے پلاٹ اپنے گھر میں لپیٹ لئے ہیں اور ایسی ایسی تعمیرات کرائی ہیں کہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے کہ لوگ سرکاری گھر کی حفاظت کس طرح اپنا گھر سمجھ کر کرتے ہیں اگر ایسا جذبہ عام ہو جائے تو سارے سرکاری گھر اپنے گھر نظر آئیں۔

لیکن وحدت کالونی ملتان اس اعتبار سے اس جذبہ سے محروم ہے کہیں کوئی تجاوزات نہیں کہیں کوئی دکان نہیں اور نہ ہی کہیں کوئی اضافہ ہوا ہے جیسے مٹی کی دیواریں کبھی تعمیر ہوئی تھیں آج بھی الحمدللہ اسی شکل میں موجود ہیں تاکہ کوئی ریسرچ سکالر ون یونٹ کے نظام پر کام کرنا چاہے تو اسے وہی آثار اور وہی انداز آج بھی مل سکیں، پچھلی بارشوں میں ہمارے ایک دوست ایڈیشنل سیشن جج کے گھر کی دیواریں گر گئیں پہلی دفعہ اندازہ ہوا ہے کہ سرکاری ملازمین کے اثاثے کیا ہوتے ہیں چند ٹوٹی ہوئی کرسیاں جو زیرِ آب آئیں اور چند چارپائیاں جو کبھی میوزیم میں موجود ہوتیں تو شاید قیمتی محسوس ہوتیں۔

وحدت کالونی ملتان کی شان و شوکت اگر دیکھنی ہے تو کبھی بارشوں کے بعد ادھر دورہ کریں ساری سڑکیں جذبوں سے سرشار نظر آئیں گی اور یہاں کا پانی مرید سادہ کی طرح قدم بوسی کے لئے تیار ہوتا ہے خاص طور پر "ہچلر لاج" کے سامنے والا حصہ اس قدر پانی سے بھرا ہوتا ہے کہ مکیں خوش ہوتے ہیں کہ مہمانوں سے جان چھوٹی اور مہمان اس لئے وہاں نہیں جاتے کہ آم کی پیٹی کے وزن سے پاؤں کے پھسلنے کا احتمال رہتا ہے، اس لئے وحدت کالونی کی پیٹیاں ہمارے جیسے نیاز مندوں کے حصہ میں آتی ہیں اگرچہ ہم یہ دعا تو نہیں کرتے کہ

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

وحدت کالونی میں ہر وقت پانی رہے یا یہاں ہر وقت بارشیں ہوتی رہیں مگر اس بات کی خواہش ضرور کرتے ہیں کہ یہاں کے مکینوں کو اپنے اثر ورسوخ کا استعمال بہر حال کرنا چاہئے ان کے دیواریں اگر بارش سے گرتی ہیں تو Law and Order کے حوالہ سے حکام کا اس قدر کمزور ہونا ثابت ہوتا ہے اور اس سے عوام کو پریشانی ہوتی ہے کہ اگر ہمارے حکام اپنا دفاع نہیں کر سکتے تو ہمارا کیا تحفظ کریں گے۔

جہاں تک وحدت کالونی کی سڑکوں کی مرمت کا تعلق ہے ایک دفعہ بلڈنگ ڈیپارٹمنٹ نے بنا دیا تھا اب بار بار بنانے سے سرمایہ اور وقت ضائع ہوتا ہے اور ویسے بھی حکومت حکام کو سادہ زندگی گزارنے کی تلقین کرتی ہے وحدت کالونی کے مکیں جس قدر سادہ، کچے اور ٹوٹی سڑکوں پر آتے جاتے ہیں ان کی اس مثال کو دوسرے علاقوں تک پہنچانا ضروری ہے اس لئے کہ بعض لوگوں کا خیال ہے حکام کی زندگی بڑی پُر آسائش ہوتی ہے انہیں ملتان کی وحدت کالونی کی مثال سامنے رکھنی چاہئے سنا ہے ملتان میونسپل کارپوریشن کی ایڈمنسٹریٹر صاحب کی رہائش گاہ بھی اسی کالونی میں ہے، ہمسائے ہونے کے ناطے شاید انہیں کالونی کے مکیں نہ بتاتے ہوں مگر انہوں نے ہم سے یہ بات ضرور کہی ہے کہ ہمیں بھی ان کاشتکاروں کی طرح خصوصی الاؤنس دیا جائے جو جانور پالنے کی وجہ سے لیتے ہیں ہم بھی گذشتہ کئی سالوں سے جس محنت سے مچھر پال رہے ہیں خصوصی اعزازیہ کے مستحق ہیں۔

ملتان کی وحدت کالونی ہمارے تاریخ ہے ہمارا سرمایہ ہے اور قابل فخر افراد کے رہنے کی وجہ سے ایک قومی یادگار ہے، اگر ہم پاکستان کی دیگر یادگاروں کا اتنا خیال کرتے ہیں ان پر سرمایہ صرف کرتے ہیں رہنے والوں کے کوائف اکٹھے کرتے ہیں تو وحدت کالونی ملتان اس توجہ سے کیوں محروم ہے ؟ اس کالونی میں کیسے کیسے دماغ اور کیسے کیسے اوصاف کے افراد موجود ہیں، ان کا اعتراف ہماری قومی ذمہ داری ہے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

صحت مند یا خوبصورت ملتان

ملتان اس اعتبار سے خوش نصیب ہے کہ اس شہر کی انتظامیہ نے کبھی ملتان کو لندن اور پیرس جیسا شہر بنانے کا دعویٰ نہیں کیا اور نہ ہی اسے خوبصورت بنانے کے بلند وبانگ منصوبے بنائے ہیں۔

جن شہروں کے بارے میں کبھی سیاستدان لندن، پیرس بنانے کے نعرے لگایا کرتے تھے۔ کیا وہ لندن، پیرس بن گئے ہیں؟ اگر وہ نہیں بنے تو ملتان کو بننے کی کیا ضرورت ہے۔ اس کی جتنی اینٹیں پرانی ہوں گی، جگہ جگہ سے ٹوٹے گی۔ دیواروں کے پلستر خراب ہوں گے۔ سڑکوں، گڑھوں اور کھڈوں کی شکل اختیار کریں گی تو ملتان کی قدامت اور تاریخی حیثیت اور اجاگر ہو گی۔ سیاح جوق در جوق آئیں گے۔

ماہرین آثار قدیمہ ملتان کے بارے میں جو دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ ساڑھے پانچ ہزار سال سے پرانا شہر ہے اگر اس کی ہر چیز نئی بن جائے تو پرانے دعوے اور بیانات کہاں جائیں گے۔

ملتان کو جوں کا توں رکھنے کی ضرورت ہے اس سلسلہ میں کارپوریشن کو ایوارڈ ملنا چاہئے کہ اس نے ملتان کی تاریخی اہمیت کو زندہ رکھا ہے اور کہیں اضافی اینٹ نہیں لگنے دی۔

کسی باغ کی روش کو درست نہیں ہونے دیا۔ پانی جہاں ہے اور جس حالت میں ہے اسے تبدیل نہیں کیا کہ کہیں تاریخ کا ریکارڈ غلط نہ ہو جائے۔

دمدمہ جیسے ٹوٹ رہا ہے اسے مزید ٹوٹنے کا صحت مند ماحول دیا جا رہا ہے۔ قلعہ کو مزید کہنہ کہا جا رہا ہے۔

میونسپل کارپوریشن ملتان سیکریسی پر بڑا ایمان رکھتی ہے ہر سال کروڑوں روپے کا بجٹ تیار ہوتا ہے اس کے منصوبے تشکیل پاتے ہیں ترقیاتی سکیمیں بنتی ہیں۔

مجال! ہے کہ کسی کو علم ہو جائے۔ اس قدر رازداری پر بھی کارپوریشن مبارک باد کی مستحق ہے۔

کارپوریشن کے دفتر کے سامنے آج کل ایک ٹیلی ویژن مینو فیکچرنگ کمپنی کا گاڑی رکھی ہوئی ہے اس چھوٹی سی گاڑی پر ہر طرح کے تجربات ہو چکے ہیں کبھی یہاں فوارہ لگتا ہے، کبھی گھاس اگائی جاتی ہے، کبھی ٹریفک کا کنٹرول ممکن بنایا جاتا ہے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ایک چھوٹی سی جگہ پر اتنے تجربات کارپوریشن کا لیبارٹری ورک عمدہ درجہ پر نظر آتا ہے اور علم سائنس میں اس کی دلچسپی نمایاں ہے کیونکہ کسی بھی تجربہ کے بعد نتیجہ کوئی بھی نہیں نکلتا۔

ملتان کی انتظامیہ کی تعریف نہ کرنا غیر مہذب رویہ کا اظہار ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ کارپوریشن اور مقامی انتظامیہ اپنے تمام تجربات کر چکی ہے اور یہ شہر ان تمام کوششوں کے باوجود خوبصورت نہیں بن سکا لیکن صحت مند بنانے کا تجربہ تو کیا جا سکتا ہے۔

پورے شہر میں ایک سپورٹس گراؤنڈ ہے جو مسلم ہائی سکول کے سامنے ہے پورا شہر اسی ایک گراؤنڈ میں اپنی صحت کو بحال رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

کیا ملتان کی پوری آبادی کے لئے یہ ڈویژنل سپورٹس گراؤنڈ کافی ہے؟ اس کا فیصلہ کون کرے گا۔ یہ پل موج دریا والی نہر پر دفاتر بنانے کی بجائے اس گراؤنڈ کی توسیع کر دی جاتی تو کتنا اچھا ہوتا۔

ابھی کچھ دفتر بننے باقی ہیں جن میں کارپوریشن کے لئے جگہ مختص کی گئی ہے یہاں اتنی جگہ پر ایسے دفاتر کا قیام ٹریفک کے نظام کو مشکل بناتا ہے اور کارپوریشن کی گاڑیاں کھڑی ہوتی ہیں یہ جگہ دفتر کے لئے ہرگز ہرگز موزوں نہیں۔

کیا ملتان میں جگہ کی قلعت ہو گئی ہے یا کارپوریشن کے خالی پلاٹ سارے بک گئے ہیں۔ اتنی تنگ جگہ کا انتخاب کیوں کیا گیا؟ ارد گرد کی آبادی پر اتنا دباؤ کیوں ہوا؟ اسی طرح شہریوں کو سانس لینا مشکل ہو جائے گا۔ اسی لئے اس خالی پلاٹ پر گراسی پلاٹ بنایا جائے تاکہ اس آبادی کے معصوم بچے کھیل سکیں۔

اس کے ساتھ ملحقہ آرٹس کونسل کو بھی جگہ مل سکے جہاں وہ اوپن تھیٹر کی صورت میں اپنی تقریبات سجا سکیں۔

پہلے بھی ہم عرض کر چکے ہیں کہ الحمرا کی طرز پر بننے والی یہ آرٹس کونسل کی عمارت اپنے صدر دروازہ سے محروم ہے۔ لوگ اس کے اندر کہاں سے جائیں گے۔

ملتان اس اعتبار سے بھی خوش نصیب ہے کہ اسے ماضی میں گئے ایوان ملتان، ایوان خسرو جیسے ثقافتی، ادبی فورم مہیہ کئے جو تعمیر نہ ہو سکے کوئی منصوبہ پروان نہ چڑھ سکا اس وجہ سے ملتان کی ادبی، سماجی، ثقافتی صحت کمزور سے کمزور ہو گئی۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

البتہ ہوٹلوں کا بزنس چل نکلا ہے لیکن سماجی حلقے بھاری بھر کم اخراجات سے کیسے تقریبات منعقد کریں۔اس لئے ملتان آرٹس کونسل کو شہریوں کی ادبی، سماجی صحت کا خیال رکھنا چاہئے اور اس منصوبہ میں تکمیل کا رنگ آنا چاہئے۔

شہروں کا نعرہ ہے کہ ملتان خوبصورت نہیں صحت مند ہونا چاہئے جس میں بچے کھیل سکیں۔ان کے نہانے 'سیو منگ' کا انتظام ہو ایسے انتظام نہیں چاہئے جو بادشاہی عید گاہ کے پاس ہے۔

گراسی پلاٹ کو کاٹ کر ایک مصنوعی جھیل بنائی گئی ہے جس میں پانی نہ ہو تو لیٹرین بن جاتی ہے اور پانی آجائے تو تعفن کا مرکز کہلاتی ہے اور اس میں بچے نہاتے اور بھاگتے جب نظر آتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ ان بچوں کے ساتھ کون سی پرانی دشمنی ہے کہ انہیں اس قدر غیر صحت مند ماحول میں رکھ کر تفریح مہیا کی جاوہی ہے۔

کیا ایسا ممکن نہیں کہ بچوں کے لئے کوئی معیاری سیو منگ پول تعمیر کیا جائے جہاں حفظانِ صحت کا معقوم انتظام ہو۔

ملتان میں سپورٹس سرگرمیوں کو فروغ دینے کی ضرورت ہے۔اس ضمن میں ملتان شہر کے اردگرد متروکہ وغیر متروکہ ہندو یا مسلم وقف اراضی میں سے کچھ رقبہ سپورٹس کی سرگرمیوں کے لئے وقف کیا جائے۔

سنا ہے کہ نیل کوٹ بوسن روڈ پر کچھ رقبہ متروکہ موجود ہے یہ کسی ایسوسی ایشن کو دینے کی بجائے سپورٹس گراؤنڈ کے لئے مختص کیا جائے کیونکہ ملتان کی صحت دیگر امور سے بہتر ہے۔

ملتان کو بڑے شہروں جیسی سہولتیں نہ دیں لیکن ان کے بچوں کو کھیلنے کے لئے گراؤنڈ، پارک ضرور مہیا کریں کیونکہ گلی کوچوں میں کرکٹ کھیلتے بچے اچھے نہیں لگتے۔آتے جاتے افراد کے لئے مشکل پیدا کرتے ہیں۔

ملتان خوبصورت نہ سہی صحت مند ہو جائے تو یہی کافی ہے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

کوٹلہ توّلے خاں

ملتان کا ایک ایسا محلّہ جو پورے ملتان پر چھایا ہوا ہے اور جس کی تاریخی قدامت اسے بر صغیر پاک و ہند میں ممتاز کرتی ہے بظاہر یہ کوٹلہ توّلے خاں ہے لیکن حقیقت میں اہلِ ہنر، اہلِ فن اور اہلِ سخن کا بے مثال خطہ ہے۔ زمانے کی ستم ظریفی سے کوٹلہ تغلق خاں سے بگڑ کر صرف کوٹلہ توّلے خاں رہ گیا ہے۔ جب یہ آباد ہوا تھا اس کا نام کوٹلہ تغلق خاں تھا جو وسیع و عریض علاقے میں پھیلا ہوا ہے کوٹلہ تغلق خاں کیسے آباد ہوا اور اس کا یہ نام کس نے دیا اور اسے یہ نام ارغِ ملتان کے مصنف کے مطابق غازی ملک غیاث الدین تغلق نے دیا جو شجاعت اور فراصت میں صاحبِ کمال تھا اسے عمارات کا بہت شوق تھا ملتان کے قلعہ میں اس نے وہ فقید المثال قبہ بنایا جو اب حضرت شاہ رکنِ عالمؒ کا مزار ہے اور قابلِ دید ہے۔ لاہوری دروازے کے باہر ایک محلّہ آباد کیا جو کوٹلہ تغلق کے نام سے مشہور ہوا مگر اب بگڑ کر کوٹلہ توّلے خاں کہلاتا ہے۔

تغلق خاندان کا زمانہ ۱۳۱۹ء کا ہے اور اس خاندان کا تعلق ملتان سے تھا اور ان کی زیادہ تر آبادی اسی خطے میں آباد تھی جسے کوٹلہ توّلے خاں کہتے ہیں یہ محلّہ بزرگانِ دین کا محلّہ ہے اس محلّہ کی بزرگ ہستیوں میں پیر محمد مراد سیرانیؒ، مولانا نظام الدین (محلّہ نظام آباد)، پیر مہر آغا، مولانا کریم بخش، جناب عزیز احمد خاں کے والد جو مولانا رومیؒ کے عاشق اور سرائیکی زبان کے شاعر اور جامع کوٹلہ توّلے خاں کے خطیب تھے جنہوں نے ایک زمانہ تک اس خطے کے لوگوں کو عشقِ رسولؐ کی لذتوں سے آشنا کیا کوٹلہ توّلے خاں اپنی تمام تر عداوتوں، فضیلتوں کے باوجود کوئی مقام حاصل نہ کر سکا۔ ملتان کا انتہائی پسماندہ خطہ ہے جو چونگی نمبر ۸ (پرانی) سے شروع ہوتا ہے اور لوہاری گیٹ تک پھیلا ہوا ہے اس سارے خطے میں اور اس سارے علاقے میں اَن گنت تاریخی مقامات ہیں جن میں "ساوی مسجد" (سبز مسجد) ایک تاریخی اہمیت کی حامل ہے یہ روغنی اینٹوں سے بنی ہوئی ہے اور منفرد طرزِ تعمیر اور بلندی کی وجہ سے بر صغیر میں مشہور ہے۔ اس مسجد کے در و دیوار پر جس خوبصورتی سے خطاطی کا کام کیا گیا ہے وہ اپنی نوعیت کا منفرد ہے۔ گزٹیئر ملتان میں لکھا ہے عمارت کے نیچے تہہ خانہ ہے جس میں صندوق زنجیروں سے لٹکے ہوئے ہیں۔ عمارت کے شمال میں نواب میر آغا اور نواب

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

اصغر علی کے مزارات ہیں جو اپنے وقت کے عمائدین شہر میں سے تھے جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ چوغطہ خاندان کے نواب تھے ان کے مزار سنگِ مرمر کے بنے ہوئے ہیں خوبصورتی کا اعلیٰ شاہکار ہیں اگرچہ یہ مسجد محکمہ آثار قدیمہ کی تحویل میں ہے جس طرح محکمہ آثار قدیمہ کا حال ہے یہی حال اس مسجد کا ہے جس کے آنے جانے کے لئے کوئی مناسب راستہ نہیں آپ پیدل جا سکتے ہیں اور ساوی مسجد کی زیارت کر سکتے ہیں یہاں جمعہ کی نماز بھی باقاعدگی سے ہوتی ہے اور مسجد ہر اعتبار سے آباد ہے لیکن اس کے آثار روز بروز منہدم ہوتے جا رہے ہیں کوئی اس کا سرکاری طور پر پرسان حال نہیں کبھی ذرائع ابلاغ نے اس تاریخی ورثہ کو وہ اہمیت نہیں دی جو دیگر مقامات کو حاصل ہے حالانکہ پتھروں پر خطاطی طرزِ تعمیر اپنی مثال آپ ہیں۔

کوٹلہ تولے خاں کی دوسری تاریخی فضیلت سلی خانہ ہے جہاں روزانہ سینکڑوں کی تعداد میں بکریاں ذبح ہوتی ہیں ان پر میونسپل کارپوریشن کی مہر لگتی ہے اور گوشت پورے شہر کو مہیا کیا جاتا ہے یہ سلی خانہ کوٹلہ تولے خاں کی پہچان ہے۔ اگر کسی شخص نے ابلاغ اور کلام کے نادر نمونے اکٹھے کرنے ہوں اور کوٹلہ تولے خاں کے لوگوں کے سخن کمال کا مظاہرہ دیکھنا ہو تو صبح سویرے سلی خانہ کا رخ کرے گالی گلوچ اور طنز اور مذاق جس رنگ میں یہاں دیکھنے اور سننے کو ملتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ رائیونڈ والوں کو درخواست کی جائے کہ آپ چند ہفتے یہاں بھی لگائیں یہ خطہ آپ کی تبلیغی کاوشوں کے لئے نہایت موزوں ہے۔ کوٹلہ تولے خاں کی گلیاں تنگ و تاریک ہیں اگر خدانخواستہ کسی کا انتقال ہو جائے تو گلی میں سے میت نکالنا مشکل ہو جاتا ہے لوگ میت کو چادر میں لپیٹ کر گلی میں سے گزرتے ہیں اور پھر کہیں جا کر جنازہ کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ کوٹلہ تغلق روڈ کبھی بہت آباد تھا یہاں رونقیں ہوتی تھیں یہاں فالودہ ''ڈولی روٹی'' دال مونگ، مرغ پلاؤ، سری پائے اور طرح طرح کے کھانے کے اہتمام ہوتے مگر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کسی کی نظر لگ گئی ہو اور یہ آباد خطہ بظاہر آباد ہے مگر اندر سے تازگی اور بشاشت سے محروم ہو گیا ہو۔ نوجوانوں میں وہ حوصلہ وہ ہمت اور وہ جوش و خروش دکھائی نہیں دیتا جو کبھی ماضی میں موجود تھا۔ نشہ کی وبا یہاں بھی پھیلی ہے کہیں ''جہاز'' یہاں بھی اڑتے نظر آتے ہیں۔ مگر ائیرپورٹ نہ ہونے کی وجہ سے ادھر اُدھر اڑ کر گر جاتے ہیں اور ایسے زخمی ہوتے ہیں کہ پھر علاج بیکار ہو جاتے ہیں۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

کوٹلہ تولے خاں وجیہ شکلوں اور بہادر انسانوں کا خطہ رہا ہے۔ بزرگوں کا رعب اور دبدبہ قابلِ رشک ہوا کرتا تھا مگر آج بزرگ معذور نظر آتے تھے اور نوجوان لاپرواہ دکھائی دیتے ہیں کوئی کسی کو منع نہیں کرتا کہیں زور زور سے ڈبک چل رہے ہوتے ہیں کہیں کھلے عام مذاق ہو رہا ہوتا ہے بہر حال یہ ان کی اپنی چاہتوں اور خواہشوں کا اظہار ہے اور ہمیں ان کی خوشی چاہیے۔ ہم تنقید سے ان کا دل نہیں دکھاتے اتنی ضرور خواہش کرتے ہیں کہ کوٹلہ تولے خاں اپنی روایات سے انحطاط کی طرف گامزن ہے یہ کبھی پہلوانوں کا محلہ تھا شاہہ زوروں کا نگر تھا اور اب گپ بازوں کی دنیارہ گیا ہے اس کی سڑکیں گندے پانی سے ہر وقت بھری رہتی ہیں۔ اس محلہ کو کیا یہ شرف کافی نہیں کہ اس کی اپنے نمائندے بڑے بااثر ہیں کئی کونسلر کئی سماجی اور فلاحی تنظیمیں یہاں موجود ہیں پھر کوٹلہ تولے خاں تمدنی سہولتوں سے محروم کیوں ہے ؟

جناب حافظ محمد اقبال خاکوانی وزیرِ صحت حکومتِ پنجاب کا تعلق اسی محلہ سے ہے ایک عرصہ تک ان کے سامنے والی سڑک ایسے گندے پانی کی وجہ سے مشہور تھی اب وہاں پختہ سڑک بن گئی ہے لیکن چوک سلی خانہ ان کی توجہ کا طالب ہے۔ پورے علاقہ کی سڑکیں، گلیاں، نالیاں نوحہ کناں ہیں کہ ان کی صفائی کا عملہ غائب ہے۔ گھنٹہ گھر جانے والی سڑک جہاں کاروباری حلقے موجود ہیں وہی گندے پانی کے جوہر آنے جانے والوں کو ایسی نشانیاں دیتے ہیں کہ ٹی وی پر چلنے والے پاؤڈر کے اشتہار سارے بیکار لگتے ہیں جو بڑے سے بڑا داغ اتارنے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ ایک بار کوٹلہ تولے خاں میں ایسا مظاہرہ کر کے دکھائیں انہیں اندازہ ہو جائے گا کہ بعض داغ پاؤڈروں کے اتارے کے بس کے نہیں ان کا علاج کارپوریشن کے پاس ہے اور صاف ظاہر ہے کہ کارپوریشن ایک دفتر ہے فیکٹری نہیں کہ وہ داغ دھونے کی بھی ذمہ داری لے اس لئے کوٹلہ تولے خاں سے لے کر ٹبی شیر خاں تک ایک اصلاحی تحریک کی ضرورت ہے۔ یہ تحریک کون چلائے گا اس کا فیصلہ تغلق روڈ کے باسیوں کے کرنا ہے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

والدین، بچے اور تفریح گاہیں

ہم اپنے بچوں میں تخلیقی صلاحتیں اجاگر کرنا چاہتے ہیں انہیں مستقبل کو تعمیر کرنے کی صلاحیت دیکھنا چاہتے ہیں اس لئے ہماری آرزو ہے کہ ہمارے بچے جب مستقبل کی قیادت سنبھالیں تو ان میں فکر و تدبر تلاش و جستجو کے اوصاف موجود ہوں۔ اتنی گہرائی ہو کہ حقائق کی منفی اور مثبت اقدار کا ادراک کر سکیں۔ اتنی صلاحیت ضرور ہو کہ حالات میں ضروری تبدیلیاں کر سکیں اور در پیش مسائل کی نشاندہی بھی کر سکیں۔ اور اگر یہ تبدیلیاں کسی آزمائش سے ہو کر گزرتی ہوں تو ان میں اتنا حوصلہ ہو کہ وہ اس راہ کی دشواریوں کو خندہ پیشانی سے جھیل سکیں۔ آزمائشیں ہار جائیں اور یہ بچے موتیوں کی طرح نکھر جائیں۔

یہ ہماری آرزوئیں، امنگیں اور خواہشات ہیں کہ ہماری نئی نسل خود اعتمادی کے ساتھ آگے بڑھے اور وطن عزیز کے افق پر بادلوں کے ان سیاہ ٹکڑوں کو الگ کر دے جو روشنی کو ہر طرف یکساں طور پر پھیلنے سے روک رہے ہیں۔ وہ کالے بادل جو لہلہاتے کھیت اجاڑ دیتے ہیں وہ کالے بادل جو بے انصافی اور حرماں نصیبی کی چادر بن جاتے ہیں جو چاند اور سورج کا چہرہ چھپا دیتے ہیں۔

حقائق سامنے نہیں آتے ان حالات میں ہماری امیدیں نوجوان نسل کی طرف جاتی ہیں اور جبکہ ہم گولڈن جوبلی تقریبات منا رہے ہیں اور مقاصد کا تعین کر رہے ہیں اور ہم بجا طور پر تسلیم کرتے ہیں کہ پاکستان گزری نسلوں کی قربانیوں کا ثمر ہے۔ موجودہ نسل کی امیدوں کا محور ہے اور آنے والی نسلوں کی امانت ہے۔

ہم نے نئی نسل کی امانت کو ان تک پہنچانے میں کیا کردار ادا کیا ہے اور خاص طور پر نئی نسل کو ہم کیا دے رہے ہیں جن کے بارے میں ہم کہتے ہیں قوم کی نگاہیں ان پر ہیں اور ان نسلوں کی نگاہیں ہماری طرف ہیں کہ ہم نے انہیں کیا دیا ہے۔ تفریح تک ہم انہیں فراہم نہیں کر سکے۔ کسی پارک میں انہیں آزادی سے جانے کو کوئی موقع نہیں ملتا۔ ہر پارک، ہر میدان، ہر جھیل اور ہر تفریح پر ٹیکس ہے۔ سائیکل ٹیکس سے لے کر چلنے پھرنے کا ٹیکس، یہاں تک کہ اگر چند بچے کسی کھانے پینے کی چیز کی فرمائش کر بیٹھیں تو بیچارے والدین اپنی جیب کو دیکھتے ہیں اور پھر اپنے معصوم بچوں کی فرمائش کا جائزہ لیتے ہیں بچوں کی فرمائش تنگ دامنی

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

کے ہاتھوں خاموشی کی فضا پیدا کر دیتی ہے اور دوسرے لمحے ویسے ہی بچے گول گپے اور آئس کریم کھا رہے ہوتے ہیں ایک طرف سفید پوش والدین اور دوسری طرف تفریح گاہیں ہیں۔ آپس میں ایک سنگین مذاق بن جاتی ہیں۔ اگر کسی والد کے چار بچے ہوں تو وہ کسی طرح کسی پارک میں نصب جھولے، ٹرین، اونٹ، بوٹ (Boat) میوزیکل چیئر اور دیگر تفریحوں کے کس طرح اپنے بچوں کے لئے حاصل کر سکتا ہے۔ ہر تفریح اتنی مہنگی ہے کہ ۸، ۱۰ روپے سے کم نہیں اس طرح تین چار سو روپے آسانی سے خرچ ہو جاتے ہیں۔ کیا ہر والد اپنے بچوں کے لئے ہر ہفتے ہر مہینے ایسے تفریح کا متحمل ہو سکتا ہے۔ پھر ایسی تفریح گاہیں طبقاتی نظام کی پیداوار ہیں۔ عام بچوں کے لئے شرح ٹکٹ دس روپے اور خاص دیگر شعبوں سے تعلق رکھنے والے بچوں کے لئے ٹکٹ نصف ہے۔ کیا بچوں میں فرق آجاتا ہے یا والدین کا مرتبہ گر جاتا ہے ایسے امتیازات کیوں ہیں؟

اگر آپ (K.F.C.) کے سطح کے کھانوں کے لئے بچوں کو لے جائیں تو آپ کو ایک مشروب ۱۶ روپے فی بوتل ملے گا اور عام سادہ پانی وہاں موجود ہی نہیں آپ مجبوراً پانچ بچوں کو اسی روپے خرچ کر کے صرف مشروب پلا سکتے ہیں باقی کھانا آپ ٹرے میں لگتا دیکھ سکتے ہیں اور اگر آپ کے بچے ضد کریں تو آپ گھر کی دے سکتے ہیں بہانے بہانے سے جھاڑ سکتے ہیں اشیاء کھلا نہیں سکتے۔ اسی طرح 2001 کی تفریح پر جہاں آپ کو پانچ، چھ روپے کے سکے خریدنے پڑتے ہیں اور ایک ایک گیم پر آپ کے پچاس سے سو روپے تک کے اخراجات آتے ہیں آپ کس طرح چار یا پانچ بچوں کو ان ملکوں والی گیم سے محفوظ کر سکتے ہیں۔

اسی طرح (Children Park) یا دیگر بچوں کی تفریح گاہیں کہنے کو بچوں کی تفریح گاہیں ہیں حقیقت میں والدین کی آزمائش گاہیں ہیں، کہ کوئی والد یا والدہ اپنی جیب کی پرواہ کئے بغیر اپنے بچوں کی تفریح پر کیا خرچ کر سکتا ہے۔ محدود بجٹ، محدود وسائل سے بڑی تفریح کا سوچنا، بچوں کے سستے پارک مہیا کرنا والدین کے بس میں نہیں رہا۔ حکومت کو بچوں کی تفریح گاہوں پر ٹیکس ختم کرنا چاہئے، جھولے اور کھلونے بغیر ڈیوٹی کے اور ارزاں قیمتوں پر فراہم کرنے چاہئیں والدین اپنے بچوں کو جدید سے جدید تر معلومات فراہم کرنے کے لئے جو آرزو رکھتے ہیں اس کی تکمیل میں حکومت اپنے تعاون کو فروغ دے کیونکہ یہ بچے قوم کی امانت ہیں اور ہمیں جان لینا چاہئے کہ اس امانت کی دیکھ بھال صرف تعلیمی ادارے نہیں کرتے بلکہ ان

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

کی صحیح دیکھ بھال، بلکہ تعمیر اور کردار سازی کی پہلی درسگاہ ان کے گھر ان کے والدین ہوتے ہیں۔ ہم سارا زور درسگاہ کی معاشرتی اور اخلاقی قدروں کے زوال پر دیتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ جس درسگاہ کو مضبوط ہونا چاہیئے تھا وہ ہم نے تفریح گاہوں کی محرومی یا عدم دستیابی کے ہاتھوں کمزور کر دی ہے اور پھر توقع کرتے ہیں کہ ہمارے بچے عقابی روح لے کر نئے جہانِ معنی کی تخلیق کریں۔ تعلیمی درسگاہوں کی طرح والدین بھی درسگاہیں ہیں ان کو بھی سرکاری گرانٹ ملنی چاہیئے تاکہ وہ اپنے بچوں کو سستی، اور سہل تفریح فراہم کر سکیں اور بچوں کو یہ موقع دیا جائے کہ وہ مستقبل کے قائداعظم بن سکیں اس لئے والدین، بچے اور تفریح گاہیں تعمیرِ وطن کی علامت ہونی چاہئیں اگر ایسا ہو تو گولڈن جوبلی تقریبات منانا ہمارا حق ہے وگرنہ بغیر کام کے معاوضہ مانگنا یا اچھی زندگی کا تصور کرنا حق نہیں خیرات ہے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ادھورے خواب

تاریخ کیا ہے ؟ ماضی کے تجربات واقعات جو کبھی در خشندہ روایات میں ملتے ہیں اور کبھی ایسی بد نما صورت میں وہ وقت کا تازیانہ اور عبرت کا افسانہ بن جاتے ہیں تاریخ صرف ماہ وسال کی سر گذشت کا نام نہیں بلکہ علم ریاضی کے فارمولوں کی سچائی کا اظہار بھی ہے اس کے نتائج کم وبیش سائنسی علوم کی طرح ٹھوس اور نا قابلِ تبدیل ہوتے ہیں مثلاً جہاں بے انصافی ہو وسائل پر جابر قوتوں کا غلبہ ہو۔ عدم مساوات ہو وہاں انقلاب آتا ہے جہاں عدل وانصاف ہو مساوات اور رواداری ہو۔ اخوت اور ایک دوسرے کا درد بانٹنے کا سلیقہ ہو امن وامان ہو۔ لوگ بے خوف خطر زندگی گزارتے ہوں ان کی جائز ضرورتوں کے حصول میں کوئی رکاوٹ نہ ہو تو اس معاشرہ کو مثالی معاشرہ کہتے ہیں اور خطہ اراضی کو جنت کا ٹکڑا قرار دیتے ہیں۔

ایک ایسے ہی معاشرہ کا خواب ہمارے اکابرین نے بر صغیر میں دیکھا اور اس سر زمین کو اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی تجربہ گاہ بنانے کا آرزو کی اس آرزو کی تکمیل میں اگرچہ لرزہ خیز مصائب اور انگنت قربانیوں کی تاریخ رقم کرنی پڑی اور مال و جان کے نذرانے پیش کرنے پڑے لیکن آرزو میں صداقت تھی مقصد ارفع تھا کامیاب ہوئے پاکستان معرض وجود میں آگیا اور ہمارے دیرینہ خواب کی تعبیر پوری ہوئی۔ ہم سب خوش تھے کہ ہمیں ایک ایسی سر زمین نصیب ہوئی ہے جہاں ہم اپنے اساسی نظریات کو بتدریج عملی صورت دے سکتے ہیں ایک مربوط اور مضبوط پاکستان بنا سکتے ہیں۔ ہمیں قائد قائدین کی صورت میں حضرت قائداعظم محمد علی جناح جیسی شخصیت ملی جو دیدہ ور کی صلاحیتوں سے مالا مال تھے اور پاکیزہ کردار اور سوز جگر رکھنے والے مسلمان تھے اور ایک پاکیزہ معاشرہ کی اٹھان کے لئے عزم و نظم کی تمام تر قوت کے مالک تھے مگر قدرت نے انہیں مزید اس چمن کو نکھارنے سنوارنے کا موقع نہ دیا اور پھر ہمیں یکے بعد دیگرے ایسے صدموں سے دوچار کیا کہ ہم بھول گئے کہ ہم نے پاکستان کیوں اور کیسے بنایا تھا اور کس مقصد کو سامنے رکھ کر ایک علیحدہ وطن کی آرزو کی تھی۔ حضرت قائداعظم محمد علی جناح نے پاکستان بننے کے چار دن بعد اپنے پیغام میں کہا تھا۔

"اب ہم پر عظیم ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ان سے عہدہ بر آ ہونے کے لئے ہمارا عزم بھی اتنا ہی محکم اور کوشش اتنی ہی شدید ہونی چاہئے پاکستان کی منزل مراد کے حصول میں ہم

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

نے جو جدو جہد کی اور جو قربانیاں دیں تعمیرِ قوم میں بھی ہمیں ان کا اعادہ کرنا ہے"۔

۱۴ اگست ہماری تاریخ کا وہ یادگار دن ہے جب ہم نے اپنی کشتی کو اپنی آنکھوں کے سامنے کامرانی سے ہمکنار ہوتے دیکھا۔ ایک ملت کی صورت میں ایک قوم کی صورت میں ایک اسلامی اخوت کی مضبوط شکل میں جیلان سے جولان تک متحد ہونے میں کراچی سے چٹا گانگ تک ہمارا نصب العین ایک تھا۔ ہم سب خوش تھے کہ ہم نے اپنے سے پانچ گنا بڑی طاقت ہندوؤں کو شکست دی ہے رام اور رحیم کے فرق کو واضح کیا ہے؟ Two Nations Theory کی بجائے Two Nations Reality کی بنیاد پر پاکستان قائم کیا ہے۔ پاکستان ایک حقیقت ایک سچائی اور ایسی قوت ہے جسے تائید خداوندی حاصل ہے۔ ہم تھیوری نہیں ہم ٹھوس شکل میں نظریہ ہیں وہ نظریہ جس کی اساس اسلام ہے۔ وہ ریاست جس کی مثال مدینہ کی مثالی ریاست ہے جس میں تین برِ اعظموں تک پھیلے ہوئے مسلمان امن و چین سے زندگی گزارتے ہیں اور ایک خاتون بھی زیوروں اور تمام تر بناؤ سنگھار کے باوجود بے خوف خطر سفر کر سکتی ہے اور اسے خدائے بزرگ و برتر کے سوا کسی اور کا خوف نہیں۔ اسلامی سلطنت میں حقوق العباد کا نظام جاری ہے۔ زکوۃ دینے والے موجود ہیں مگر لینے والے معذرت کے ساتھ کہتے ہیں کہ اب ہم خود صاحبِ نصاب بن گئے ہیں۔ زر گردش میں رہتا ہے اسی لئے زکوۃ کا سبب بنتے ہیں اور آمدنی پر کوئی ٹیکس نہیں۔ ۱۴ اگست ہمیں یاد دلاتا ہے کہ ہم نے بحیثیت امت، بحیثیت قوم اپنے جداگانہ تشخص کے عملی اظہار کے لئے اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ایک آزاد خود مختار مملکت حاصل کر کے ثابت کیا کہ مسلمان کو غلامی پسند نہیں مسلمان اگر کسی عزم کا اظہار کرتا ہے تو اسے عملی شکل دینے کا سلیقہ بھی رکھتا ہے۔ آج ہم پچاس سال کی تکمیل کر رہے ہیں ہندوؤں کی اس سوچ کو شکست دے رہے ہیں جو یہ کہتے تھے کہ پاکستان بہ مشکل چھ ماہ قائم رہ سکے گا۔ چھ ماہ تو کیا پچاس سال ہم نے عزت و وقار سے گزار لئے ہیں اور پھر آئندہ پچاس سالوں کی تکمیل کے لئے عزم سفر ہو رہے ہیں لیکن پچھلے پچاس سال ہمیں آئندہ کے پچاس سالوں کے لئے کچھ سوچ کے تحفے دے رہے ہیں ہم نے گذشتہ سالوں میں تلخ ترین تجربات کئے ہیں اور کئی ہمارے مسائل ہمارے ایجنڈے پر ادھورے موجود ہیں۔ سقوط ڈھاکہ ہماری ناکامی کا ثبوت ہے کہ ہم وحدت و فاقیت اور مرکز کو مضبوط نہیں بنا سکے۔ ہم نے شکوک و شبہات پر قابو نہیں پایا بد گمانیوں کا سدِ باب نہیں کیا وسائل کے

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

استعمال اور انتقال میں انصاف سے کام نہیں لیا۔ بڑے بھائی ہونے کے ناطے چھوٹے بھائی کو اس کا جائز حق نہیں دیا نتیجتاً چھوٹے بھائی نے ہم سے علیحدہ اختیار کر لی لیکن منانے کی ہم نے کوشش بھی نہ کی بلکہ مفاہمت کا جہاں امکان تھا ہم نے اسے سیاسی چالوں سے ناکام کیا۔

ہم نے اس خطے کی عوام سے وعدہ کیا تھا کہ ہم انہیں اسلام کی عملی شکل مہیا کریں گے مگر ہم نے اسے نعرہ تک محدود رکھا۔ نفاذ اسلام کے لئے عملی اقدامات تو درکنار زبانی جمع خرچ میں بھی بخل سے کام لیتے رہے اور آج نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہمارے مالیاتی نظام بنکوں اور سٹاک ایکس چینج کی ضرورتوں کے لئے اسلام کی عملی شکلیں ہم مہیا کرنے میں ناکام رہے ہیں کیا ہمارے ماہرین سود، سٹہ اور مضاربہ کا کوئی ٹھوس حل نہیں نکال سکے۔ ہم نے فروعی مسائل کو ترجیح دی اور اسلام کی مربوط شکلیں کمزور کر دیں۔ دوسری طرف ہمیں یکجہتی کے فقدان پر رونا آتا ہے لیکن ہم نے کبھی اس کے لئے کام ہی نہیں کیا۔ ہم منصوبے بناتے ہیں حکمت عملیاں وضع کرتے ہیں آہنی ہاتھ سے لا اینڈ آرڈر پر قابو پانے کی بات کرتے ہیں مگر مسائل ہیں کہ قابو میں نہیں آتے۔

ہر سفر کے لئے ایک زادِ راہ ہوتا ہے اور زادِ راہ ہم نے ساتھ نہیں لیا اگر وہ زادِ راہ ہم اپنے ساتھ لے لیں تو ہمیں سفر میں دقت نہیں ہوگی اور وہ صرف مختصر سا زادِ راہ ہے یعنی زندگی کے ہر سطح پر ہر جگہ ہر مقام پر انصاف کیا جائے۔ انصاف کا زادِ راہ ہمیں بھر عازم سفر ہونے میں کئی کامرانیوں سے ہمکنار کرے گا اور نامکمل ایجنڈے کو مکمل کرائے گا اور ہمارے خواب جو ابھی ادھورے ہیں شاید انہیں تعبیر ملے شاید انہیں تکمیل ملے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

چائلڈ لیبر

دنیا بھر کے ترقی پذیر ممالک کو جن مشکلات کا سامنہ ہے ان میں بے روزگاری، غربت، جہالت، افلاس، ماحول کی آلودگی، بڑھتی ہوئی آبادی، انسانی حقوق کی پامالی اور چائلڈ لیبر شامل ہیں۔ ہر سطح پر اور ہر مقام پر ان کے خلاف آواز اٹھائی جاتی ہے۔ NGO بھی اس کام میں متحرک ہیں۔ اقوام متحدہ کے معاشرتی ادارے بھی کام کر رہے ہیں۔ کئی سماجی تنظیمیں ان کے خاتمے کے لئے سرگرم عمل ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ مسائل بڑھتے جا رہے ہیں کم نہیں ہو رہے۔ پرائمری سکول کی سطح پر بچے اور بچیوں کا Drop Out زیادہ ہے آبادی میں بھی اضافہ اء ۳ فیصد بڑھ رہا ہے۔ غربت کا یہ حال ہے کہ آپ کسی سڑک پر، کسی پارک میں کسی ہوٹل کے باہر، ریل، روڈ میں گداگروں سے نہیں بچ سکتے۔ ابھی فی الحال فضائی سفر محفوظ ہے ورنہ ایک عام سے سٹور سے لے کر بڑے ہوٹل تک آپ کو زبان سے نہیں آپ کے دامن کے تھام کر بلکہ کھینچ کر توجہ دلانے والے گداگر موجود ہوتے ہیں اور کیسے کیسے ان کے روپ اور توجہ دلائی نوٹس ہوتے ہیں کہ آپ کی عافیت اسی میں نظر آتی ہے کہ کچھ دے کر ان سے جان چھڑائیں ورنہ وہ اس طرح تعاقب کرتے ہیں جیسے بنک والے قرض لینے والے کا۔

جہاں تک چائلڈ لیبر کا تعلق ہے بارہ سال سے کم عمر اور اٹھارہ سال تک کے بچے چائلڈ لیبر میں آتے ہیں پاکستان کے یہ بچے جو تقریباً ۵ کروڑ کے لگ بھگ ہیں محنت مزدوری کرتے ہیں۔ بوٹ پالش کرتے ہیں، ہوٹلوں میں کام کرتے ہیں۔ پلیٹ فارموں پر ملتانی سوہن حلوہ بیچتے ہیں قلیوں کی طرح سامان اٹھاتے ہیں ریل کے ڈبے میں چائے، دال، مونگ پھلی، ریوڑیاں بیچتے ہیں اینٹوں کے بھٹے پر اینٹیں بناتے، اٹھاتے ہیں۔ قالین بناتے ہیں۔ کھڈی پر کام کرتے ہیں۔ ملتان، لاہور، سیالکوٹ، فیصل آباد میں قائم چھوٹی صنعتوں میں پرزوں کی طرح مشینوں کے ساتھ جڑے ہوتے ہیں۔ سیالکوٹ میں سرجیکل آلات تیار کرتے ہیں۔ سپورٹس کی اشیاء بناتے ہیں۔ ذراعت، جنگلات، تعمیرات، فیکٹریوں، ٹرانسپورٹ، صنعتی یونٹ، بجلی، گیس سے وابستہ اداروں میں یہ چائلڈ لیبر موجود ہے۔

یہ بچے غم حالات کا شکار ہیں کسی کی اندھی ماں کی نظریں اس کی آمدنی پر لگی ہوتی ہیں

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

تاکہ چولہا روشن ہو سکے۔ کئی بچوں کے والدین فوت ہو چکے ہیں یا معذور ہیں۔ وہ اپنی بہن اور بھائی کے لئے کماتے ہیں۔ کوئی ان کا ولی وارث نہیں۔ کوئی ان کے سر پر ہاتھ رکھنے والا نہیں۔ بھوک، افلاس کی زندگی گزارتے ہیں۔ معمولی مکان میں رہتے ہیں۔ ایک کمرہ میں چھ چھ افراد اور ایک کمرہ بھی کیا محض ایک غار جہاں روشنی بھی مستعار ہوتی ہے اور تازہ ہوا کے راستے میں ایسی رکاوٹ ہوتی ہے جیسے کسی بارڈر پر خاردار تاریں کسی کو بارڈر کراس کرنے نہیں دیتیں۔

ان حالات میں یہ چاند ستارے جیسے روشن بچے تنہائی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ڈپریشن سوچ کی صحت مند راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔ خود اعتمادی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اخلاقی قدریں کمزور پڑ جاتی ہیں۔ خالی ذہن ہوتے ہیں جس نے جو تحریر لکھنی چاہی اسی تحریر کا یہ بچے اشتہار بن جاتے ہیں۔ نشہ، جوا، سگریٹ نوشی، سینما بینی اور انگریزی فلموں کی ایڈونچر کہانیاں انہیں اس مہم جوئی کی طرف لے جاتی ہیں۔ جہاں جرائم کا ایک وسیع سمندر انہیں ہڑپ کرنے کے لئے موجود ہوتا ہے۔

یہ بچے تخلیق کار ہوتے ہیں۔ نئی نئی گالیاں تخلیق کرتے ہیں۔ گلی کونوں پر اس طرح کھڑے ہوتے ہیں کہ مولا جٹ فلم کا کردار انہیں ملنا چاہئے تھا۔ جب سے بلو کے گھر والا گانا سنا ہے انہیں اس گانے کے علاوہ اور کوئی گانا اچھا نہیں لگتا۔ ۵ سال سے لے کر ۱۱ سال تک یہ بچے ڈراؤنے خواب دیکھتے ہیں۔ اور ۱۶ سال سے اوپر کی عمر میں پہنچ کر ڈیپریشن کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جوانی کی عمر بڑھاپے کو پہنچ جاتی ہے۔ چہرے زرد پڑ جاتے ہیں اور شکلیں اسی کوئی صابن بھی نہیں دھو سکتا۔

اس مسائل کی وجہ سے ان بچوں کا مجموعی کردار، رویہ کیا بنتا ہے۔ کاش کوئی معاشرہ اندازہ کرتا۔ حکومتی سطح پر بیت المال کے منصوبے میں انہیں سکول مہیا کئے گئے ہیں۔ دودھ بھی ملتا ہے اور دوپہر کا کھانا بھی۔ یقیناً ملتا ہو گا مگر ان بچوں کی صحت بنتی نظر نہیں آتی۔ وظائف کی کوئی صورت نہیں۔ بنگلہ دیش، نیپال، سری لنکلہ میں چائلڈ لیبر کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی مگر مطلوبہ نتائج حاصل نہ ہو سکے چائلڈ لیبر ہر ملک کا مسئلہ ہے مگر اس کا حل بھی ٹھوس اور مثبت ہونا چاہئے۔ یہی معصوم بچے ہمارے ملک کو کارپٹ انڈسٹری سے ۷۰۰ کروڑ روپے زرِ مبادلہ مہیا کرتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں ہنر موجود ہے۔ انہیں اچھے حالات

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

دیئے جائیں ان کی محنت کا صلہ معقول ہو تو یہ بچے شام کو کسی بھی سکول، اکیڈمی میں پڑھ سکتے ہیں۔ اپنے اچھے گھر بنا سکتے ہیں۔ حکومت اپنی محکمہ لیبر کی معارفت ان کے کوائف اکٹھے کر کے اب ان غریب بچوں کو پلاٹ الاٹ کرے کیونکہ صوبائی اور قومی اسمبلی کے اراکین کو کافی پلاٹ مل چکے ہیں۔ اب ان بچوں کا حق ہے کہ وہ اپنی بوڑھی ماں کو اور اپنے مزید چھوٹے بہن بھائیوں کو بارش اور دھوپ سے بچا سکیں۔ کیا بارش میں انہیں غریبوں کی چھت نے گرنا ہوتا ہے۔ جب چھت گرتی ہے تو علاقے کے نمائندے اظہار افسوس کے لئے آتے ہیں ان کی ہمدردی اخبار کی تصویروں میں شائع ہوتی ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ چھت گرنے سے پہلے تشریف لائیں اور ان بچوں کو بتائیں کہ آپ کی بستی میں سرجیکل، سپورٹس کارپٹ کے کارخانے لگ گئے ہیں۔ صبح کام کرو اور شام کو سکول میں آؤ۔ رات کا کھانا آپ کو سکول میں ملے گا۔ کاپیاں کتابیں آپ کی فلاحی مملکت مہیا کرے گی آپ کو پانچ مرحلے کے پلاٹ سرکار مفت دے گی۔ تعمیر کے لئے آپ کو ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن سے بغیر سود کے قرضہ ملے گا۔

ان مراعات کے بعد چائلڈ لیبر کا مستقبل سنور جائے گا مگر ایسی پالیسی کب۔ کہاں اور کون دے گا؟ ہمارے دوست ڈاکٹر صبور غیور نے بارہ سے زیادہ کتابیں چائلڈ لیبر پر لکھ دی ہیں۔ انہیں کون پڑھے گا اور ان کی سفارشات عمل کی سنگلاخ زمین پر کیسے اتریں گی۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ٹیوشن

ٹیوشن ایک عام فہم لفظ ہے مگر بلا کی طلسماتی کشش رکھتا ہے کمزور طالب علم کو یقین دلاتا ہے کہ پورے بورڈ میں اس کے اول آنے کے سو فیصد چانس ہیں۔ یہ لفظ نہیں امرت دھارا ہے۔ کئی اداروں سے وابستہ اساتذہ کرام کی زندگی کا سہارا ہے مگر اس لفظ کے ساتھ کبھی انصاف نہیں ہوا۔ یہ وہ لفظ ہے جسے کبھی بے حد چاہا جاتا ہے اور کبھی جی بھر کر نفرت کی جاتی ہے کچھ لوگ اسے معاشرے کا ناسور کہتے ہیں کچھ اسے تعلیمی انحطاط کی خشت اول سے تعبیر کرتے ہیں کچھ اسے معاشرے کی ناگزیر بُرائی کہتے ہیں ایک لفظ ہے اور کئی اس کے نام ہیں کبھی محبت کی علامت کبھی نفرت کی صورت اور کبھی مجبوری کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ اسی لفظ کی وجہ سے کئی سکول، کئی کالج دن کے وقت ویران، کلاس روم پریشان مگر جونہی شام کے پانچ چھ بجتے ہیں وہی کلاس روم وہی طلبا، وہی اساتذہ انتہائی مصروف نظر آتے ہیں کئی اکیڈمیاں روشن ہو جاتی ہے کئی بیٹھکیں آباد شاد ہو جاتے ہیں۔ شفٹ سسٹم شروع ہو جاتا ہے ایسے لگتا ہے جیسے گلی محلے میں چھوٹی چھوٹی صنعتیں لگ گئی ہوں اور ٹیوشن نے ایک کاروبار کی شکل اختیار کر لی ہو۔

ویسے تو کسی زمانے میں صحافت بھی ایک مشن شمار ہوتا تھا۔ مگر وقت کے ساتھ ساتھ اسے انڈسٹری کی صورت ملی اس طرح تعلیم بھی ایک مشن تھا جسے ماہرین تعلیم دل و جان سے نبھاتے تھے۔ چلتے پھرتے طلبا کو گائیڈ کرتے اور کبھی دست سوال نہ کرتے۔ کیونکہ یہ بات تعلیم کی روح کی خلاف تھی اس سے ان کے خیال کے مطابق اساتذہ کی خودی مجروح ہوتی تھی۔ اور طالبِ علم یہ محسوس کرتا تھا کہ وہ استاد کو کچھ دے رہا ہے اور استاد یہ محسوس کرتا کہ وہ شاگرد کا زیربار ہو رہا ہے لیکن جب سے یہ ٹیوشن کی صورت نکلی ہے دونوں کی سوچ ایک جیسی ہو گئی ہے دونوں ایک دوسرے کی صورت بن گئے ہیں اور نظریہ ضرورت کو ہم پہلے ہی تسلیم کر چکے ہیں اس لئے ٹیوشن ہمارے معاشرے میں تیزی سے رچ بس گئی ہے۔ اکثر یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ جو بچہ ٹیوشن پڑھنے سے انکار کرے یا اپنے والدین کی مجبوری بیان کرے اس کی مجبوری کو بہانہ سمجھا جاتا ہے اور ایسے طالبِ علم کو کلاس میں اور کلاس سے باہر اس طرح تنہا کر دیا جاتا ہے کہ گویا وہ اچھوت بن گیا ہے اس کی ترقی میں رکاوٹ پیدا کی جاتی

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ہے اس کے نتائج میں ڈنڈی ماری جاتی ہے امتحان میں ایسے طالبِ علم سے ایسے سوالات کئے جاتے ہیں کہ وہ پریشان ہو جاتا ہے اور سکول یا کالج میں اس کے لئے ایسے حالات پیدا کر دیئے جاتے ہیں کہ وہ ادارہ چھوڑنے کو ترجیح دیتا ہے۔ یا تعلیم سے دور چلا جاتا ہے۔ جبری ٹیوشن ایسے ہی ہے جیسے آج کل جبری ریٹائرمنٹ کا مسئلہ ہے۔ پرانے ملازمین کے ساتھ جس طرح بے انصافی ہو رہی ہے کچھ اس نوعیت کی بے انصافی غریب طالبِ علموں کے ساتھ ہوتی ہے ٹیوشن پڑھو ورنہ گھر جاؤ۔

یہ ٹیوشن سنٹر کم ہیں بلکہ پروئیویٹ کلینک بن گئے ہیں اگر یہی اساتذہ کلاسوں میں پڑھائیں اور اپنے ڈیوٹی آور مکمل کریں تو ٹیوشن کی نوعیت ہی نہ آئے۔ کلاس روم صرف اس لئے ہیں کہ طلبا کو ترغیب دیں کہ وہ گھر پر آئیں اور ٹیوشن پڑھیں اگر اساتذہ سے کلاس روم چھین لئے جائیں اور کلاس روم کی بنیاد نہ رہے تو پھر کون ان کے پاس ٹیوشن پڑھے گا۔ اگر کوئی ڈاکٹر ہسپتال سے فارغ ہو جائے تو شام کو اس کے کلینک میں مریض کم ہو جاتے ہیں اسی طرح تعلیمی ادارے ٹیوشن کا سبب بنتے ہیں۔ اگر تعلیمی ادارے صرف تنخواہ کے لئے ہیں تو پھر کلاس روم۔ کامن روم، سٹاف روم کے قائم رہنے کا کوئی جواز نہیں تعلیمی ادارے اگر ٹیوشن کی ترغیب سے محروم ہو جائیں تو یہی ادارے اعلیٰ انسان، اعلیٰ افسر اور اعلیٰ درجہ کے منتظم پیدا کر سکتے ہیں ٹیوشن سے اچھے نمبر تو آسکتے ہیں لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ ٹیوشن پڑھنے والا اس تربیت سے بھی آگاہ ہو جائے گا جو ایک ادارہ، ایک درسگاہ ایک دانش مہیا کرتا ہے آج طلبا تربیت سے محروم ہیں البتہ نمبروں سے مالا مال ہیں۔ ٹیوشن کرنے والوں سے اگر کوئی احتجاج کرے تو ان کا جواب نہایت مدلل ہوتا ہے کہ ٹیوشن کے مفہوم سے جو آگاہ نہیں وہی اعتراض کرتے ہیں۔ ٹیوشن کسے کہتے ہیں؟ ٹیوشن اس تعلیم یا ہدایت کو کہتے ہیں جو آپ کو قیمتاً ملے یا جس کی ادائیگی آپ کو کرنی پڑے۔ ٹیوشن سنٹر کوئی فلاحی یا رفاعی ادارہ نہیں اور نہ ہی تعلیمِ بالغاں کا کوئی مرکز ہے ان اداروں نے اپنے سٹاف اور عملہ کو تنخواہیں دینی ہوتی ہیں ویسے بھی ٹیوشن سنٹر والے کوئی اشتہار شائع نہیں کرتے کہ آپ ضرور آئیں۔ لوگ مجبور کرتے ہیں لوگوں کو اعتبار ہے کہ ان سنٹروں سے پڑھا ہوا شخص بڑا افسر بنتا ہے۔ انہیں سنٹروں کے پڑھے ہوئے ڈاکٹر، انجینئر، سی ایس پی کے عہدے پر فائز ہوتے ہیں۔ غنیمت ہے کہ اس گئے گزرے ماحول میں قیمتاً ایسی تعلیم مل جاتی ہے ورنہ تعلیم ہمارے ملک میں

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

کہاں ؟ ناخواندگی کی شرح صدیوں سے ایک ہے کوئی فرق نہیں۔ ٹیوشن سنٹر آباد ہیں اساتذہ اور طلبا مصروف ہیں پھر ان وسیع و عریض اداروں کمروں ، تدریسی بلاکوں ، لیبارٹریوں ، لائبریریوں کا کیا کہا جائے جن پر کروڑوں کی گرانٹ صرف ہوتی ہے قاضی آفاق حسین ایڈیشنل سیکرٹری تعلیم پنجاب نے ایک دفعہ بتایا تھا کہ ساڑھے چار لاکھ محکمہ تعلیم میں افراد موجود ہیں ان کی تنخواہیں ان کے واجبات کس شمار میں جائیں گے اگر قوم کے بچے ٹیوشن پڑھنے پر مجبور ہیں اگر ٹیوشن اتنی ضروری ہے تو ساری گرانٹ شام کی اکیڈمیوں اور ٹیوشن سنٹروں کو منتقل کر دی جائے تاکہ مزید اچھے افسر پیدا ہو سکیں۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

کوثر علم کے ساقی مگر بے بسی کے شاقی

علامہ علاؤالدین صدیقی مرحوم پنجاب یونیورسٹی لاہور کے وائس چانسلر تھے کچھ شہر پسندوں نے ان کے گھر میں گھس کر توڑ پھوڑ کی اور ان کے گھر کو نقصان پہنچایا تو جب ان سے صحافیوں نے پوچھا کہ اس معاملے کا ماجرا کیا ہے تو ان کا جواب نہایت موزوں تھا کہ معلم کی بے بسی کا منظر پیش منظر ہے۔ اس واقعہ کو گزرے تقریباً ۲۵ سال ہو گئے ہیں لیکن یہ واقعہ ذہن کے گوشوں میں اس طرح محفوظ ہے کہ کبھی اسے بھول نہیں سکے۔

گذشتہ دنوں اخبارات میں تواتر سے کچھ ایسے واقعات رونما ہوئے ہیں جنہوں نے ماضی کے زخم پھر تازہ کر دیئے ہیں۔ ایف سی کالج لاہور کا حالیہ واقعہ جس میں پولیس نے کالج کے ہوسٹلوں اور اساتذہ کے گھروں پر چھاپے ڈالے۔ ایک پروفیسر کے اہلِ خانہ سے بد تمیزی کی اور ایک استاد کے منہ پر تھپڑ جڑ دیا گیا۔ ایسی مثالیں اور جگہوں سے بھی ملی ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ استاد جو ادب گہہ محبت کا محافظ کوثر علم کا ساقی ہے جس کی عزت و حرمت کے لئے اسے معلمی جزو پیغمبری سے تعبیر کیا گیا ہے وہ اس قدر تذلیل اور تحقیر کا نشانہ کیوں بنا ہے۔ جن پولیس والوں نے یہ حرکت کی ہے کیا ان کا کوئی استاد نہیں انہوں نے کہیں سے تعلیم حاصل نہیں کی اگر ان کے استادوں نے انہیں یہ تعلیم دی ہے تو اس کا ذمہ دار کون ہے؟

ہمارے صحافی بھائی قاسم جعفری نے گذشتہ دنوں پولیس ٹریننگ سنٹر کا سروے تیار کیا جس میں کہا گیا کہ کھلی جگہ پر آسمان کے نیچے پولیس کی کلاسیں لگتی ہیں ان کے لئے کوئی کلاس روم نہیں اور انہیں کیا پڑھایا جاتا ہے اس کا ماہرین تعلیم کو علم نہیں۔ پولیس اکیڈمیاں کیا سلیبس تیار کرتی ہیں کہاں سے منظور کراتی ہیں انہیں کون منظور کرتا ہے اور کون ان کے نتائج کا جائزہ لیتا ہے یہ سب کچھ غیر معلوم ہے۔ شنید یہ ہے کہ پولیس کی تربیت میں کہیں نہ کہیں کمی ضرور ہے جو انہیں زیادہ مہذب بنانے اور شہریوں سے اور صاحبِ علم لوگوں سے بات کرنے کا طریقہ سلیقہ سکھائے۔

ایک زمانہ تھا کہ کسی بھی تعلیمی ادارے میں پولیس نہیں جاتی تھی کہ تعلیمی ادارے کا تقدس مجروح ہوتا تھا اگر کہیں زیادہ مجبوری ہوتی تو ادارے کے سربراہ سے اجازت لیتے اور مطلوبہ مقاصد کی تکمیل کے بعد سلیقے سے رخصت ہوتے۔ آج حالت یہ ہے کہ پولیس اپنے

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

بے پناہ اختیارات کی بناپر کسی سکول ، کالج کی بات الگ سہی ملک کی اعلیٰ درسگاہوں یعنی یونیورسٹیوں میں بغیر اجازت کے چھاپے مارتی ہے اور وائس چانسلر کو اس وقت اطلاع کرتی ہے جب شب خون مکمل ہو جاتا ہے۔ وائس چانسلر ایک بلند مرتبہ انسان ہوتا ہے جو عمر بھر جلنے اور علم و ادب اور تحقیق میں نام پیدا کرنے کے بعد بنتا ہے مگر وہ عام لوگوں اور پولیس والوں کے لئے کیوں وجہ امتیاز نہیں بنتا اس کی وجہ بھی ہماری اقدار کی بے حسی ہے کہ ہم نے کبھی وائس چانسلر کو وہ مقام اور وہ مرتبہ نہیں دیا جو اپنے علاقہ کے ایس ایچ او کو دیتے ہیں کیونکہ ایس ایچ او اپنے تھانہ میں بادشاہ ہوتا ہے اور وائس چانسلر اپنے کیمپس جو کم و بیش ہزار ڈیڑھ ہزار ایکڑ اراضی میں قائم کیمپس میں ایک معمولی استاد ہوتا ہے اور یہ اساتذہ ہماری تعلیم اور ہماری تہذیب کی بنیاد کڑی ہیں ان کی خدمات سے نئی نسل کا درخشندہ مستقبل وابستہ ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو انسان کو عظیم تر انسان بناتے ہیں۔ ان کی وحشی جبلتوں کی تہذیب کرتے ہیں۔ علم و ہنر میں یکتا کرتے ہیں اور ایک ایسے جہان معنی کی تخلیق کرتے ہیں جو طالبِ علم کو اپنے استاد کا وہ ورثہ دیتے ہیں جس کی مارکیٹ میں کوئی قیمت نہیں تربیت اور تہذیب کا کوئی مول نہیں۔

بین الاقوامی شہرت کے مالک ڈاکٹر عبدالقدیر نے ملتان کے دورے کے موقعہ پر کہا تھا کہ میں آج بھی فخر محسوس کرتا ہوں کہ میں نے اپنے استادوں کی جوتیاں سیدھی کیں۔ یہ انہی کا صدقہ ہے کہ میں آج اس مقام پر فائز ہوں۔ مگر ہمارے استاد آج پولیس سے تھپڑ کھاتے ہیں۔ ایف سی کالج اپنی درخشندہ روایات اور اپنے وسیع و عریض کیمپس کی وجہ سے منفرد رہا ہے۔ یہاں کے اساتذہ نے علم و ادب میں بڑا نام کمایا ہے۔ اگر یہاں کچھ سیاست کے جراثیم پیدا ہو گئے ہیں تو اس کا حل کالج کے پرنسپل صاحب نکال سکتے ہیں۔ پولیس کے چھاپے معیارِ تعلیم کو بڑھا نہیں سکتے البتہ رسوا اور ذلیل کر سکتے ہیں۔

تعلیمی اداروں کو سیاست سے پاک ہونا چاہئے لیکن یہ کام سیاست دانوں کا نہیں ایک معلم کا ہے کہ وہ اپنے طالبِ علم کے ذہن میں آنے والے واقعات کا صحیح نقشہ ترتیب دے تاکہ طالبِ علم اپنے مستقبل کا خود فیصلہ کر سکے۔ مگر یہ سب کچھ کوثر علم کے ساقی سے ملے گا اگر چشمہ خشک ہو جائے تو کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی تہذیب نہیں ابھرتی۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

نفاذ اردو دفتری زبان

ہر ضلع میں ایسی کمیٹیاں بھی ہیں جن کا تعلق تشتند ،گفتند ،بر خاستند سے آگے نہیں بڑھتا۔ چھ ماہ کے بعد ایک اجلاس ہوتا ہے چند ماہرین یکجا ہوتے ہیں خوبصورت ہال میں بیٹھ کر انتہائی خوبصورت باتیں کر کے موسم کے مطابق مشروبات پیتے ہیں۔ یہ مشروبات عموماً سادہ پانی اور بے ذائقہ چائے پر مشتمل ہوتا ہے اس سے محظوظ ہونے کے بعد رخصت ہو جاتے ہیں اور پھر اس کمیٹی کی روئیداد تیار ہوتی ہے جو زیادہ تر صدر نشیں کے دلنشیں پر مشتمل ہوتی ہے اور باقی ماہرین کی حاضری کا ریکارڈ ہوتا ہے۔ انہیں کمیٹیوں میں سے ایک کمیٹی نفاذ اردو دفتری زبان کی ہے۔ وزیرِ اعلیٰ پنجاب غلام حیدر روائیں مرحوم کے زمانے میں یہ کمیٹیاں بڑی فعال تھیں ملتان میں اگرچہ ہر دور میں نامور ادیب ،دانشور ،ڈپٹی کمشنر آتے رہے ہیں لیکن ان میں نفاذ اردو دفتری زبان کو جنہوں نے مقبولیت دی وہ سید شوکت علی شاہ تھے۔ ایک عالمی سیمینار ایک مشاعرہ اور نمائش کتب کا اہتمام کیا گیا اور اردو کی دفتری صلاحیت بڑھائی گئی اسی نوعیت کا اہتمام ضلع خانیوال نے مخدوم محمد سجاد حسین قریشی گورنر پنجاب کی صدارت میں کیا جس میں ماہرین کو بلانے میں مرتضیٰ برلاس ڈپٹی کمشنر ضلع خانیوال نے شاندار انتظامات کئے اس کے بعد یہ کمیٹیاں کسی ایسے کونے میں دفن ہوئیں اور ان پر فاتحہ پڑھنے کو جگہ بھی نہیں ملی۔

ملتان میں بھی ایسی کمیٹی موجود ہے اور امید ہے کہ جناب ڈپٹی کمشنر ملتان ظفر سلیم چوہدری اسے از سرِ نو زندہ کرنے کا دلچسپی فرمائیں گے۔ یہ ایک عملی اور فکری کام ہیں اور اردو سے ایک روحانی اور جذباتی وابستگی کا نام بھی ہے اور دفتروں میں اردو کو رائج کرنے اور اپنے کلچر سے آگاہ ہونے کی کوشش بھی ہے۔ ہمیں اس موقع پر فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ برصغیر میں مسلمانوں کے ایک ہزار برس کے اقتدار اور ثقافتی انجذاب کا ایک ثمر اور مظہر اردو زبان بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں عقیدہ مسلمانانِ برصغیر کے تشخص کی بنیاد بنا اور نظریہ اسلام اور نظریہ پاکستان کی اساس پر ہم نے جدو جہد آزادی کی وہاں اردو بھی مسلمانوں کی شناخت کا وصیلہ بنی ۔ چنانچہ ہندی اردو تنازعہ کو دو قومی نظریہ کے فروغ کے تناظر میں دیکھنا ضروری ہے اس لئے جب بانی پاکستان حضرت محمد قائداعظم محمد علی جناح نے اردو کو پاکستان

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

کی قومی زبان کہا تھا تو کسی کو تعجب نہیں ہوا تھا اردو ہماری پہچان اور شناخت اور قومی ترقی کا مظہر ہے جس کے بارے میں کوئی دوسری رائے نہیں ہو سکتی لیکن اسے دفتروں میں کیسے رائج کیا جائے اس کے بارے میں بڑی سنجیدگی اور فوری سوچ کی ضرورت ہے۔

ہمارے ملک کی بیشتر آبادی صرف اردو جانتی ہے اور اردو ہی میں دوسرے کی بات کو سمجھ لیتی ہے لیکن دفتروں میں ابھی تک انگریزی کے نفاذ میں انہیں انگریزی طبقہ کی منت کرنا پڑتی ہے کہ وہ ان کی بات کو بڑے افسر تک پہنچائیں دفتری زبان اردو ہو جانے کی صورت میں فائلوں کی رفتار تیز ہو جائے گی۔ انصاف سہل اور بروقت ہو سکے گا۔

ہمارے دفاتر ابھی تک پرانی طرز پر چل رہے ہیں وہی فرسودہ فعال وہی بیکار فائلیں، رجسٹر جن کا اندراج اپنی اہمیت کھو بیٹھے ہیں ایک سائل کو پُر کرنے پڑتے ہیں۔ ہم عملاً کہتے ہیں کہ اسلام میں ذات پات کی گنجائش نہیں لیکن جب فارم پُر کرتے ہیں تو نہ صرف ذات کا خانہ ہوتا ہے بلکہ ''سرنام'' تک اور Subcast کا اندراج کرنا پڑتا ہے اور ایسی کئی بیکار معلومات کا اضافہ کرنا پڑتا ہے جن کی آج کے دور میں ضرورت ہی نہیں۔ انگریزی ہمارے نظام میں ایسی رچ بس گئی ہے۔ ایک آم کی پیٹی لاہور، اسلام آباد بھیجنے کے لئے ریلوے کے محکمہ سے جو فارم ملتا ہے وہ بھی انگریزی میں چھپا ہوتا ہے اور بیچارہ ان پڑھ ملازم ریلوے اسٹیشن پر پڑھے لکھے آدمی کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے کہ کوئی اسے فارم پُر کر دے۔

دفتروں میں اردو کے نفاذ میں جو سب سے بڑی رکاوٹ پیش کی جاتی ہے کہ اردو ٹائپ رائٹر کم ہیں یا اردو ٹائپسٹ نہیں یا اردو کی اصطلاحات انگریزی کے مقابلہ میں مشکل ہیں مثلاً رجسٹرار کا اردو لفظ ''مستجل'' ہے ان مشکلات کا ازالہ کون سی مشکل بات ہے جس طرح انگریزی کے ٹائپ رائیٹر خریدے جاتے ہیں اسی طرح اردو کے خرید کر لئے جائیں جس طرح انگریزی ٹائپ سکھائی جاتی ہے اسی طرح اردو ٹائپ سیکھنے کا اہتمام کیا جائے۔ جہاں تک اردو کے مشکل الفاظ کا تعلق ہے یہ کیونکہ عموماً فارسی، عربی سے لئے جاتے ہیں اور عربی فارسی جاننے والے ہمارے ہاں کم ہیں اس لئے یہ لفظ اجنبی لگتے ہیں اگر انگریزی کی اصطلاحات کا ترجمہ اردو میں کیا جائے تو کسی کو بھی دقت نہیں ہو گی۔ ہمارے ہاں اردو کے بہت سے لفظ آسانی سے آج بھی دفتروں میں بولے اور سمجھے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر، ڈاک خانہ، پوسٹ آفس، ریلوے اسٹیشن، کچہری، جج، ایڈووکیٹ وغیرہ شامل ہیں۔ ہمیں اردو کو دفتروں

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

میں رائج کرنے کے لئے سادہ اور عام فہم زبان کی ضرورت ہے اردو کا ادبی لب و لہجہ ہمارے دفتروں میں نہیں چل سکتا۔ اس کے لئے اردو Functional Language کی ضرورت ہے جو روزمرہ کے معاملات کو بخوبی چلا سکے۔ دامن اردو وسیع ہے وہ الگ بات کہ ہم نے کئی عذر کے بت تراش لئے ہیں۔

اردو ہمارے تمام دفتری، سرکاری، تعلیمی اور صحافتی امور کو بخوبی سر انجام دے رہی ہے۔ کمپیوٹر، فیکس کی سہولتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ اردو اب کوئی ایسی زبان نہیں عصر حاضر کا ساتھ نہ دے سکے۔ فی الحال اردو کے نفاذ میں جو رکاوٹ ہے وہ ہماری اپنی سوچ کی ہے۔ ہماری سوچ ابھی انگریزی کی سمری، نوٹ اور ڈرافٹ میں الجھ گئی ہے۔ اس سے کب باہر آئیں گے جب ہر ضلع کی نفاذ اردو کمیٹی فعال ہو جائے گی۔

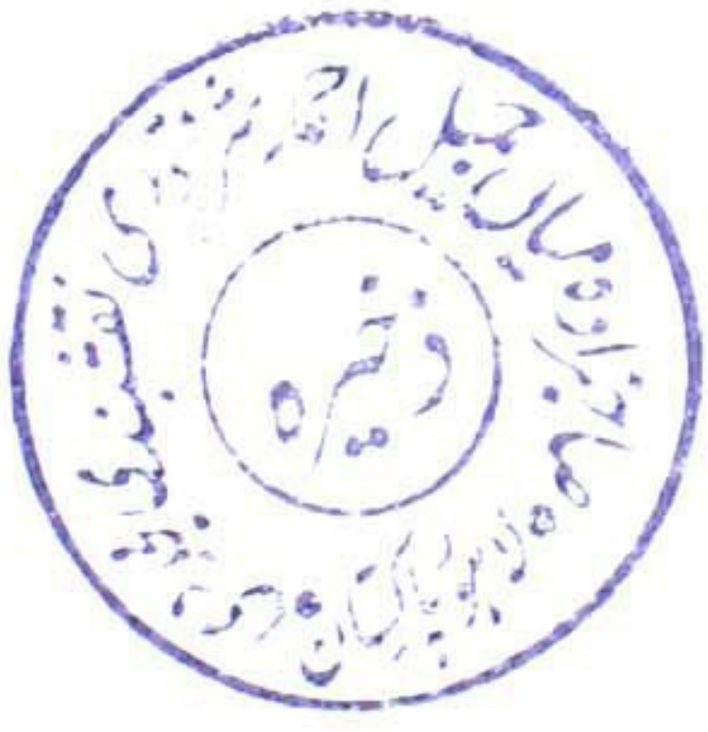

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

مسجد

مسجد اللہ کا گھر ہے۔ اسے بنت کعبہ بھی کہتے ہیں۔ مسلم تہذیب کا اگر کئی زندہ معجزہ اگر مغربی دنیا کو حیرت میں ڈال سکتا ہے اور اپنی عظمت کا سکہ منا سکتا ہے تو وہ مسجد ہے۔ جس کے دروازے پر ہم نے پولیس بٹھادی۔ ہماری تہذیب کا وہ کمال جس پر ہم فخر کرتے تھے اور یورپ حیرت کا اظہار کرتا تھا کہ سنگِ وحشت کی نادر تعمیرات میں اس قدر علم پوشیدہ ہے یہ مسجد کیا ہے ایک علم کا خزانہ ہے اس کے مینار عمودی زاویوں کی پہچان۔ اس کے ستون ٹرگنو میٹری اور جیو میٹری کی اشکال اس کے منبر و محراب فلکیات اور طبیعات کے علوم کے آئینہ دار ہیں۔ مصوری اور خطاطی، میناکاری اور کاشی گری اس کے حسن جمال کو نکھارتی ہیں۔ مسجد روح کی بالیدگیوں اور تطہیر کا ذریعہ اور ذکر الٰہی میں مگن کرنے کا نام ہے۔ مسجد کے قیام کا تصور اس وقت بھی موجود تھا جب حضرت آدم بھی موجود نہ تھے ساتویں آسمان پر عرش بریں کے نیچے البیت المامور جسے عرف عام میں فرشتوں کی مسجد کہتے ہیں کعبہ بالکل اس کے نیچے ہیں اتنا نیچے اگر اوپر سے ایک پتھر پھینکا جائے تو وہ کعبہ کی چھت پر گرے دوسرے لفظوں میں کعبہ ایک کھڑکی ہے جس کا دروازہ عرش پر کھلتا ہے۔ ہماری دعائیں براہِ راست وہاں پہنچتی ہیں (حوالہ ڈاکٹر حمید اللہ مقالہ خصوصی پریس نومبر ۱۹۸۰ء) مسجد مسلم تہذیب کی پہچان اس کی ثقافت اور کلچر کی اٹھان ہے۔ مسلمانوں نے کہاں کہاں مسجدیں تعمیر نہیں کیں اگرچہ پوری کائنات مؤمن کے لئے مسجد کا درجہ رکھتی ہے مگر مسلمانوں کے سوز دل نے مسجد کی صورت میں ایسے نقش ابھارے ہیں کہ وہ قیامت تک زندہ رہیں گے۔ مسجد اقصیٰ پیغمبروں کی مسجد۔ سرزمین حجاز کی مساجد، یمن کی مسجد، صفا مسجد البکریہ، مسجد اشرفیہ تائظ، اندلس کی جامع مسجد، قرطبہ جس کے کنارے کوئی مرد مؤمن اکیسویں صدی میں اسلام کی صدی کے خواب دیکھ رہا ہے۔ مسجد قرطبہ حضرت علامہ محمد اقبال کی امنگوں اور آرزؤں کی مسجد اور مسلم تہذیب کا وہ عظیم شاہکار جو سپین میں دیوار شکستہ کے نقش و نگار کی حفاظت کر رہا ہو اور آنے والے دنوں کی نوید دے رہا ہے کہ شاید پھر وہی حدی خواں وہی نمازی وہی غازی جو قریہ قریہ اسلام کی تبلیغ اور سچائی کی عظمت کے لئے پھرا کرتے تھے پھر موسیٰ بن نصیر طارق ابن زیاد کی صورت میں سپین کو پھر اسلام کی سرزمین بنادیں۔ جامعہ مسجد شبلیہ چھٹی صدی ہجری کی مسجد،

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

مسجد طلیطلہ پھر غازیان اسلام کی اذانوں کی منتظر ہیں۔ مراکش کی مسجد قرادین تیسری صدی ہجری کی روایات کو زندہ کرتی ہیں ایک مشہور یونیورسٹی کا درجہ رکھتی ہے رباط کی مسجد حسن، جامع مسجد تنمل، الجزائر کی مسجد المنصور تلمسان آٹھویں صدی ہجری کی اسلامی اقدار کو سامنے لاتی ہے۔ تیونس کی جامعہ مسجد قیروان تیسری صدی زینو تبہ مسجد تیونس پھر مصر کی وہ مسجد جو یونیورسٹی کا درجہ رکھتی ہے جامعہ الازہر قاہرہ، فاطمی دورِ حکومت کی یادگار مسجد عمرو بن العاص، مسجد ابن طولوں قاہرہ، مسجد مدرسہ سلطان حسن قاہرہ، مسجد محمد علی قاہرہ شام میں مسجد عمر دوسری صدی ہجری جامع مسجد دمشق اموی عہد کی عکاسی کرتی ہے۔ ترکی میں جامع مسجد برصہ آٹھویں مسجد و مزار شہزادہ محمد استنبول، جامع مسجد منصوبہ سلیمانیہ، استنبول، جامع مسجد سلطان احمد، استنبول، جامع مسجد مرادیہ، عراق میں مینار جامع القمریہ، ایران میں جامع مسجد اردستان، جامع مسجد اصفہان، مسجد شاہ اصفہان، اس طرح بخارہ میں کلیاں مسجد، ثمر قندھ کی مسجد بی بی خانم افغانستان میں مسجد نوگنبہ بلخ بھارت میں جامع مسجد احمد آباد، قوت الاسلام، مسجد دہلی، جامع مسجد دہلی، موتی مسجد دہلی، جامع مسجد فتح پور سیکری، مقبوضہ کشمیر میں جامعہ مسجد سری نگر۔

پاکستان میں محمد بن قاسم کی قائم کردہ مساجد مسجد نیلاگنبہ، مسجد وزیر خاں، سنہری مسجد لاہور، شاہی مسجد لاہور، مسجد بھونگ رحیم یار خاں، مسجد شاہی ٹھٹھہ، الیاسی مسجد ایبٹ آباد، مسجد عید گاہ ملتان، غرض یہ کہ پوری دنیا میں بلاد اسلام میں ہزاروں کی تعداد میں وہ مساجد موجود ہیں جو جوش ایمانی اور جذبہ حمیت دینی کی مظہر ہیں۔ مسجد شب بھر۔ مسجد توبنادی شب بھر میں والی نظم علامہ محمد اقبال نے اسی نظم کے بارے میں لکھی تھی۔

مسلم تمدن اور اسلامی ریاست میں مسجد جی ایچ کیو کا درجہ رکھتی ہے۔ مسجد بطور عدالت، سپریم کورٹ ہے۔ پارلیمنٹ ہے۔ مسجد شوریٰ سرکٹ ہاؤس Combined Military Hospital (CMH) دارالحکومت غرض یہ کہ مرکز ثقافت سے لے کر مرکز سیاست مسجد ہی مسجد ہے۔ لیکن ہم نے مسجد کو کیا بنا دیا ہے۔ ہم نے اسے ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان سے دور کر دیا ہے۔ ایک فرقہ کا دوسرے فرقہ کا داخلہ ممنوع کر دیا ہے بلکہ بورڈ آویزاں کر دیئے ہیں۔ لاؤڈ سپیکر ایسے منتخب کئے ہیں کہ دوسرا مسلک رکھنے والے مسلمان مسجد سے دور چلا گیا ہے۔ دہشت گردی اور فرقہ واریت کے ہاتھوں مسجد ویران ہو گئی ہے۔ پولیس کے

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

پہرے میں باہر سے آنے والا جب دیکھتا ہے کہ ایک مسلک جو اسلام کی اساس پر قائم ہوا اسی ملک کے مسلمان اپنی مسجد کو محفوظ نہیں رکھ سکتے۔ مسجد سے تحمل، تدبر، رواداری کو رخصت کر رہے ہیں۔ زبان سے ہر کوئی لاالہ الااللہ کا ورد کرتا ہے لیکن عملاً اپنے اندر تعصبات، نفرت کے بت چھپائے پھرتا ہے۔ نفرتوں، تصادم، بغض و عناد کے بت کو توڑے گا۔ مسجدوں کو کون آباد کرے گا۔ جس مسجد کو ہم نے مغربی دنیا کی ایجادات، اختراعات کے مقابلے پیش کرنا تھا وہ مسجد ہم نے مقفل کر دی ہے۔ صدر دروازے پر لکھ دیا ہے کہ نمازی اپنی جوتی کی خود حفاظت کرے۔ جب کوئی مسجد میں داخل ہو تو اسے سامان مل جاتا ہے۔ یہاں مسجدیں امان سے محروم کیوں ہیں؟ معصوم نمازیوں پر بم دھماکے کیوں۔ معصوم بچوں کی لاشوں اور خون مسلم کی ارزانی اور وہ مسجد میں۔ ہم مسجد کو کیا شکل دے رہے ہیں۔ مسجد تو مسلمانوں کی سب سے بڑی متاع ہے۔ مادی اور روحانی ضرورتوں کی تکمیل بے روح اور جسم کو قوت کو بحال کرنے کام کر کے آیئے۔ مسجد کو پھر وہی مقام وہی مرتبہ دیں جو اس کا حق ہے۔ مسجدیں آباد ہوں تو اہلِ شہر حفظ و امان میں ہوتے ہیں اور اگر مسجدیں ویران ہوں تو رہنے والے بھی پریشان ہوتے ہیں۔ آیئے اپنی پریشانیاں دور کریں اور مسجد کو چلیں۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ترقی کی شاہراہ پر

بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان جنوبی پنجاب کی وہ منفرد دانش گاہ ہے جس نے ۱۹۷۵ء سے لے کر ۱۹۹۷ء تک کے ۲۲ سالہ دور میں علم و عرفان، شعور و آگہی، فکر و نظر کے ایسے چراغ روشن کئے ہیں جن کی بدولت پورے علاقے میں خواندگی، بلند معیارِ زندگی اور صنعتی و زرعی ترقی کے روشن امکانات پیدا ہوئے ہیں۔ طلباء و طالبات کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ پورے ڈویژن میں پہلے صرف ۲۶ ڈگری کالج تھے اب ۶۵ ڈگری کالج قائم ہو چکے ہیں۔ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی تقریباً ۲۵ تدریسی شعبہ جات پر مشتمل ہے۔ جس میں کئی نئے اضافے ہوئے ہیں جن میں بی۔بی۔اے، ایم۔کام، بی۔ایس۔سی کمپیوٹر، ایم۔ایس۔سی کمپیوٹر، ایم۔بی۔اے، انجینئرنگ میں سول انجینئرنگ کی کلاسز جاری ہیں۔ این۔ایف۔سی انسٹی ٹیوٹ (کھاد فیکٹری) کے الحاق سے بی۔ایس۔سی کیمیکل کی کلاسز جاری ہیں۔ یونیورسٹی الیکٹریکل انجینئرنگ کی کلاسوں کا اجراء کرنے کی بھی کوشش کر رہی ہے۔ یونیورسٹی جہاں تدریس، تحقیق کو فروغ دے رہی ہے وہاں یونیورسٹی تعمیرات کی صورت میں نئے بلاک تعمیر کر رہی ہے۔ جن میں انتظامی بلاک مکمل ہو چکا ہے اور وہاں کنٹرولر امتحانات کے دفاتر، ٹریژار کے دفاتر، پروجیکٹ ڈائریکٹر کے دفاتر منتقل ہو چکے ہیں۔ رجسٹرار اور وائس چانسلر کے دفاتر چند دنوں تک منتقل ہو جائیں گے اس کے علاوہ یونیورسٹی میں سٹاف کالونی میں متعدد گھر تعمیر ہو چکے ہیں اور پروفیسر اور دیگر عہدوں پر فائز اساتذہ اور انتظامی افسران کو الاٹ ہو چکے ہیں۔

بہاء الدین زکریا یونیورسٹی اپنے محدود وسائل کے باجود نصابی، تعلیمی اور تعمیراتی سرگرمیوں میں پیش رفت کر رہی ہے۔ انجینئرنگ کے شعبہ کے منتقل بھی آخر مراحل میں ہے۔ یونیورسٹی انجینئرنگ کالج اپنا بھرپور اور فعال کردار ادا کر رہا ہے۔ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی کا زرعی کالج بھی ارتقاعی مرحلوں میں ہے۔ اداروں کو وجود میں آنے کے لئے وقت مطلوب ہوتا ہے۔ یونیورسٹی زرعی کالج اپنے قابل قدر اساتذہ کی نگرانی میں معیاری تعلیم اور تدریس کو جدید خطوط پر مہیا کر رہا ہے۔ کچھ لوگ اعتراض برائے اعتراض کے حامی ہیں۔ انہیں ہر چیز میں انتشار، افتراق نظر آتا ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر عاشق محمد خان دُرانی وائس چانسلر نے یونیورسٹی کو ایک مثبت سمت فراہم کی ہے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی کی قائم کردہ تعلیمی تدریسی روایات کو آگے بڑھا رہی ہے۔ ان تمام علوم میں پیش رفت کر رہی ہے جو مدرسہ بہائیہ کی صورت میں قائم تھے۔ اکنامکس، شعبہ بزنس، ایڈمنسٹریشن، شعبہ میٹریل سائنس، شعبہ ابلاغیات، فارمیسی، انجینئرنگ، زراعت، شماریات، ریاضی، ایجوکیشن، کامرس، بیالوجی، باٹنی، زوالوجی، سیاسیات، مطالعہ پاکستان، تاریخ جیسے شعبے قائم ہیں۔

بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان کے اساتذہ کرام جدید تعلیم یافتہ باہر کی یونیورسٹیوں سے التحصیل اور علم و ہنر میں منفرد مقام کے حامل ہیں۔ اساتذہ کی تعداد تقریباً ۲۱۰ ہے جبکہ طلباء و طالبات کی تعداد چار ہزار کے قریب ہے۔ اس سال ایم-اے، ایم-ایس-سی کے داخلے نومبر میں شروع ہوں گے۔ سردست بی-بی-اے، فارمیسی، انجینئرنگ اور زراعت کے داخلے جاری ہیں۔ یہ داخلے میرٹ کی بنیاد پر ہوتے ہیں اس میں ملتان ڈویژن کے طلباء و طالبات کی نشستیں بھی مختص ہیں اور پورے پاکستان کی سطح پر طلباء و طالبات داخلہ حاصل کرتے ہیں۔ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی نے اپنے ۲۲ سالہ کے دوران جو نام اور مقام بنایا ہے یہ اسی کا اعجاز ہے کہ ملک بھر میں یونیورسٹی کو ایک توقیر کا درجہ حاصل ہے۔ اس کے نتائج تسلیم کئے جاتے ہیں۔ اس کے فارغ التحصیل طلباء و طالبات کو ملازمتوں میں ترجیح حیثیت دی جاتی ہے۔ یہ ان کی اہلیت کا ثبوت ہے۔ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ اس نے اپنے کیمپس کو خوب سے خوب تر بنانے میں خصوصی توجہ دی ہے۔ اشجار، اثمار کی بھرمار ہے۔ خوبصورت لان، سبزہ اور باغ اس کیمپس کا نکھار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یونیورسٹی کو تشجر کاری کے مقابلے میں ملک بھر کی یونیورسٹیوں میں اول آنے پر ایک لاکھ روپے حکومت پاکستان کی طرف سے ملے اور اب مزید حوصلہ افزائی کے لئے حکومت نے چار لاکھ روپے کی گرانٹ دی ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یونیورسٹی میں تیزی کے ساتھ شجر کاری مہم جاری ہے۔ اس سال ۱۹۹۷ء کے ہدف کے مطابق تقریباً ڈیڑھ لاکھ مختلف پودے لگائے جائیں گے جو کمپس کی فضاؤں اور رعنائیوں میں ایک خوبصورت اضافہ کریں گے۔

بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان ترقی کی طرف گامزن ہے۔ اسے مثالی قیادت میسر ہے۔ طلباء اور عملہ میں لگن ہے کہ اسے اعلیٰ روایات اور علم اور تدریس کی رفعتوں سے آشنا کیا جائے۔ انشاءاللہ ۲۰۱۰ء میں بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان ہر اعتبار سے مکمل ہو گی۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

میاں چنوں میں محفلِ میلادؐ

خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو اپنی صبح شام ذکر حبیب کی محافل سے سجاتے ہیں اور اپنے دامن میں خیر و برکت کی سعادت سمیٹتے ہیں روح کی لطافتیں اکٹھی کرتے ہیں اور کثافتوں سے بچتے ہیں۔ ایک ایسی محفل ہر سال غازی برادران میاں چنوں میں بھی سجاتے ہیں ذوق و شوق کا ایک عجیب عالم ہوتا ہے محبت اور عقیدت کے قافلے خانیوال، تلمبہ، عبدالحکیم، چیچاوطنی، ساہیوال، لاہور اور فیصل آباد سے رواں دواں میاں چنوں پہنچتے ہیں کوئی دعوت نامہ جاری نہیں ہوتا از خود قافلے آتے ہیں اور رات گئے تک سرورِ کائنات فخرِ موجودات کی مدح میں لکھی گئی نعتیں کلام اور پیغام سنتے ہیں۔ محفل دس بجے سجتی ہے اور رات کے تین بجے تک چلتی ہے کسی کو اٹھنے کا خیال نہیں آتا جو جہاں بیٹھ گیا خوش ہو گیا کہ محفل میں جگہ مل گئی ہے اور اپنی قسمت پر ناز کرنے لگا کہ اسے یہ سال بھی ذکر حبیب سننے کو نصیب ہوا ہے، مسلمان کا ایمان ہے کہ ذکر حبیب پروانہ راہ داری جنت ہے، دنیاوی اور آخروی نجات کا ذریعہ ہے، اولادِ آدم پر اللہ تعالیٰ کے جتنے احسانات ہیں ان میں سب سے بڑا احسان ظہور محمدیؐ ہے، جس ہستی نے اندھیروں میں روشنی پھیلائی جس نے تاریک براعظموں میں عقل، شعور، دین متین کا ایسا چراغ روشن کیا جس نے سوچ کے نئے دھارے پیدا کئے صرف ۲۳ سالوں میں بارہ لاکھ مربع میل رقبہ پر ایک عظیم الشان اسلامی سلطنت وجود میں آئی جو تین بڑے اعظموں پر مشتمل تھی ایشیاء، افریقہ، یورپ، مسلمان ایک طرف چین دوسری طرف سپانیہ، تیسری طرف فرانس تک پھیل گئے، محفل، میلاد کی تقاریر سے فکر کے نئے گوشے ابھرتے ہیں۔ میاں چنوں کی اسی محفل میں ایک مقرر نے کیا خوب کہا جب ان کا ذکر ہو دنیا سراپا گوش ہو جائے، جب ان کا نام آئے مرحبا صلی علیٰ کہئے۔

(مہر القادری)

اس محفل میں نعت رسول مقبولؐ کے لئے ملک کے کونہ کونہ سے نعت خواں تشریف لائے ہوئے تھے ملتان سے منیر حسین ہاشمی، قاری عبدالغفار نقشبندی، اور ریڈیو پاکستان ملتان کے پروڈیوسر شمشیر حیدر ہاشمی (مہر صاحب) نظامت کے فرائض سرانجام دے رہے تھے، ہر نعت خواں سوزدل محبت کی اتھاہ گہرائیوں سے اپنا تازہ جذبہ اور سچے لفظوں سے مدح

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

رسول کر رہا تھا قاری لیاقت نیازی کی قرأت بے مثل اور لحن داؤدی کی عمدہ مثال تھی اس محفل کے روح رواں غازی برادران تھے جناب ارشد غازی ، اختر غازی، انور غازی اور عبدالرشید جیسے بزرگ محفل میں شامل تھے صرف کمی تھی تو ہمارے دوست سرور غازی کی تھی جو گذشتہ روز لندن سے واپس آتے ہوئے خانیوال میں انتقال کر گئے۔ وہ اپنی ذات میں عشق رسول کی لذت لئے ہوئے تھے مرحوم جس جذبہ و لگن سے یہ محفل ہر سال سجاتے تھے دیکھنے والے حیران ہوتے کہ ایسا جنون ، ایسا جذبہ اور ایسا عشق رسول اس نوجوان میں کیسے آیا۔ لندن کی فضاؤں میں رہنے والا لیکن دل اس کا دیارِ حجاز کی ہواؤں سے تازہ تھا، اسی محفل میں ایک عالم دین نے اسلام اور سرور کائنات کے حوالہ سے جو اسلام کا دفاعی نظام پیش کیا ان کی گفتگو سن کر محسوس ہوا کہ اسلام کے دامن میں کتنے موتی سموئے ہوئے ہیں، انہوں نے بتایا غزوہ احزاب میں کفارِ مکہ نے مدینہ کا ۲۰ دن محاصرہ کیا، حضرت سلیمان فارسیؓ کے مشورے پر ایرانی طرز کے مطابق شہر کے گرد ایک خندق کھودی گئی اس جنگ میں حضرت سلیمان فارسی کے مشورے کے مطابق دو نئے آلات حرب استعمال کئے گئے ، منجنیق دبابے تیار کئے گئے جسے اس دور کی توپ اور ٹینک کہا جا سکتا ہے فاضل مقرر نے فرمایا اسلام جدید ترین علم سائنس اور ٹیکنالوجی کا نام ہے سرورِ کائنات نے مسلمانوں کو چین جانے کا مشورہ اس لئے نہیں دیا تھا کہ وہاں قرآن و حدیث یا اسلامی فقہ پڑھائی جاتی تھی مقصود جدید علوم و فنون سے آگاہی تھی یہ مسلمان کی گم شدہ میراث ہے اسی لئے حضور اکرم حضرت محمد ﷺ نے کئی صحابہ کرام کو شام میں دبابے اور منجنیق کی صنعت سیکھنے کے لئے بھیجا اس محفل میلاد میں ہمیں بھی کچھ کہنے کا موقع ملا، صرف اتنا عرض کیا کہ پیغمبر اعظم و آخر نے علم و آگاہی کے ایسے باب کھولے جنہوں نے سائنس اور ٹیکنالوجی کی وسعتوں کو آگے بڑھایا دور جدید کو عرب تہذیب کا بہترین تحفہ سائنس کا ہے محفل میلاد کے صدر نشیں جناب عبدالرشید نے خطاب کرتے ہوئے کہا سورۃ الفیل اس واقعہ کی نشاندہی کرتی ہے جو عرب دنیا میں ۴۵ سال پہلے رونما ہوا تھا جسے ہر شخص جانتا تھا اگر یہ واقعہ درست نہ ہوتا تو لوگ انکار کر دیتے واقعہ معراج مریخ اور چاند تک تسخیر کی نشانیاں واضح کرتا ہے۔ سرورِ کائنات کی سیرۃ طیبہ مسلمانوں اور عالم انسانیت کے لئے سرچشم ہدایت ہے، علامہ محمد اقبال نے اسے ان جذبوں سے سراہا ہے۔

آبروئے ما زنام مصطفیٰ است

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

محفلِ میلاد پریشانیوں سے نجات کا نام ہے، اپنی وابستگی اور والہانہ محبتوں کے اظہار کا نام ہے Back to Muhammad Peace be upon him کا نام ہے، اکیسویں صدی اسلام کی صدی کہلانے والی ہے اس لئے ہمیں اسوۂ رسول ﷺ کو اپنانا چاہئے۔

اس مادیت اور اندھی دولت پرستی سے بچنے کے لئے ایسی محافل تذکیہ نفس اور تطہیر قلوب کا باعث ہیں۔

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازن تر
نفس گم کردہ می آید جنیدؒ و بایزیدؒ اینجا

میاں چنوں خوش نصیب خطہ ہے جہاں ہر سال رات گئے تک ذکر جمال ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیب کی باتیں ہوتی ہیں اپنے تعلق کے رشتے جڑتے ہیں اسلام کی اساس اور قومی یکجہتی کی بنیادیں مضبوط کی جاتی ہیں، ہر شہر کو میاں چنوں بننا چاہئے مگر اس کے لئے سرور غازی جیسے نوجوان چاہئیں جو سارا سال اس محفل کا انتظار کرتے ہیں اور اسی محفل کی آرزو میں اس دنیا سے رخصت ہوتے ہیں۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

پوری دنیا فتح کرنے کا خواب

جب ہم بچے تھے عجیب عجیب خواب دیکھتے تھے۔ جب سورج کو طلوع ہوتے دیکھتے تو خیال کرتے کہ ساتھ کے گاؤں سے سورج ابھر رہا ہے اور جب غروب ہوتے دیکھتے تو اپنے گاؤں سے دوسرے گاؤں تک بھاگتے کہ چلو سورج کو قریب سے دیکھیں۔ ایسے ہی خواہش کرتے جیسے کراچی کے واسی کلفٹن اور ڈیفنس کے علاقوں سے گزر کر سمندر پر جا کر مغرب کے وقت سورج کو پانی میں ڈوبتا دیکھتے ہیں اور دوستوں کو بتاتے ہیں کہ سورج سمندر میں اس لئے اترتا ہے کہ اپنی گرمی کو ٹھنڈا کر سکے۔ ہر شام کراچی کے سمندر کے ساحل پر مغرب سے کچھ دیر پہلے روزانہ سورج کو ڈوبتے دیکھنے کی آرزو کشاں کشاں لوگوں کو لے جاتی ہے۔ بچے، بوڑھے، جوان اور خواتین سب اس منظر سے محظوظ ہوتے ہیں اور مجھے بچپن کے وہ سنہرے دن یاد آتے ہیں جب کھیتوں اور کھلیانوں میں بھاگتے بھاگتے سورج اور چاند کا تعاقب کرتے اور پھر خود تھک ہار کر ان معصوم لاہوری بھائیوں کی طرح بیٹھ جاتے جنہوں نے صبح سویرے دوڑ لگائی کہ نیو کیمپس والی نہر پر چل کر دوسرے عازمین حج کی طرح مکہ شریف کا سفر کریں اور دوسروں کی طرح حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کریں جب کیمپس سے آگے شاہدرہ کھوئی تک پہنچے سانس پھول گیا۔ ایک بھائی نے دوسرے بھائی سے بڑی معصومیت سے کہا "بائی شیدے خیال کریں کتھے کعبہ شریف پیچھے نہ رہ جائے تے اسی اگے نکل جایئے"۔ معصوم خواہشوں، آرزوں اور امنگوں کا کوئی ساحل نہیں۔ آج سے صدیوں پہلے پوری دنیا فتح کرنے کی خواہش رکھنے والے کیا کیا لوگ نہیں تھے کبھی سائرس نے آرزو کی، کبھی سکندر اعظم نے خواہش کی اور مارے مارے، جنگل جنگل پھرتا رہا۔ ملتان تک آیا مگر ملتانیوں نے ایسا تیر مارا کہ دنیا کا فاتح گھر تک نہ پہنچ سکا۔

دنیا فتح کرنے اور اپنا سکہ جمانے کی معصوم خواہش چنگیز خان کو بھی تھی اس نے بھی بغداد اور بخارہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اس امنگ میں ہلاکو خان، نپولین بوناپارٹ اور ہٹلر بھی شامل تھے مگر کسی کے مقدر میں دنیا فتح کرنے کا سہرا سر پر نہ سجا۔ کاش وہ صحافی ہوتے ان کے قبضے میں ذرائع ابلاغ ہوتے، ان کی آرزو جلد پوری ہو جاتی۔ ذرائع ابلاغ نے آج کی دنیا میں ایسا انقلاب پیدا کیا ہے وقت اور فاصلے کی ایسی طنابیں کھینچی ہیں کہ دنیا سکڑ کر ایک گاؤں

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ایک محلّہ بن گئی ہے۔ آج بل کلنٹن وائٹ ہاؤس میں بیٹھ کر دنیا بھر کے عوام سے براہ راست مخاطب ہو سکتا ہے ایک سیکنڈ میں ایک گم نام عام سا شخص سیٹلائٹ کے رابطے سے بین الاقوامی شخصیت بن سکتا ہے۔ مسافتیں لمحوں میں بدل گئی ہیں۔ سیٹلائٹ، کمپیوٹر اور E.Mail جیسے ابلاغی رابطے پوری دنیا کو فتح کر رہے ہیں۔ کانگرس لائبریری کی کتابیں کوٹلہ توے خاں میں بیٹھ کر پڑھی جا سکتی ہیں۔ نیوز ویک اور ٹائم کے شمارے ٹبی شیر خاں سے جاری ہو سکتے ہیں مغرب کا روزانہ کوئی بھی اخبار آپ صبح سویرے اپنے گھر بیٹھ کر پڑھ سکتے ہیں۔

ذرائع ابلاغ نے انسانی فکر کو متاثر کرنے اور بدلنے کی جو بے پناہ صلاحیت حاصل کر لی ہے اب اس کے سامنے نہ کوئی دیوار برلن ہے اور نہ ہی روس کا آہنی پردہ، جس کے اندر جھانکنا منع تھا۔

ذرائع ابلاغ جسے میڈیا کہتے ہیں آج ایک طاقت ہے اور اس طاقت کا انحصار انفارمیشن ٹیکنالوجی ہے جسے کالجوں، یونیورسٹیوں میں بطور نصاب شامل کرنے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ ماہرین غور و خوض کر رہے ہیں۔ انفارمیشن کا پھیلاؤ اس تیزی سے جاری ہے کہ کوئی رکاوٹ، رکاوٹ نہیں رہی۔ دنیا بھر کا انسان دوسرے انسان کے قریب آنا چاہتا ہے ایک دوسرے کے خیال اور نظریات سے آگاہ ہونا چاہتا ہے اپنی بات کہنا چاہتا ہے اور دوسرے کی بات سننے کے لئے ہمہ تن گوش ہے۔

پرانے تصورات، وہم، خدشے ختم ہو رہے ہیں نفرتیں خلوص میں بدل رہی ہیں ایک دوسرے کی مدد کا جذبہ پروان چڑھ رہا ہے۔ یہ سب کچھ ذرائع ابلاغ کا کرشمہ ہے لیکن حیرت یہ ہے کہ دنیا بھر کا کلچر بدل رہا ہے افکار و نظریات بدل رہے ہیں لیکن ایک ہمارا ہمسایہ ملک ہے جس کے نظریات کا صدیوں کا تعصب غالب ہے۔ اس تعصب کے جالے کو صاف کرنے میں ذرائع ابلاغ جو موجودہ دور میں حکمران ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں کیوں ناکام ہے کیا جالا کا حصار مضبوط ہے جو ابلاغ کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہے۔ پوری دنیا کا پریس کشمیر کے مظلوموں کی داد فریاد کیوں نہیں سنتا، کیا ان کے ساتھ کوئی دوسرا حاکم یا حکمران ہے۔ اگر ایسا نہیں تو ابلاغ عامہ کو اپنی حکمرانی کا اعلان کرنا چاہئے اور مظلوم کشمیری کا ساتھ دینا چاہئے۔ ابلاغ تو دکھی انسانیت کا موضوع ہے مگر اس دکھی انسانیت کے محسن کے لئے کشمیر کے مظلوم انسان نظر نہیں آتے۔ ابلاغ عامہ تو سر سے پاؤں تک احتساب ہوتا ہے بے انصافی کے خلاف جہاد

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ہوتا ہے۔ ایک ہاتھ میں داد اور دوسرے ہاتھ میں تیشہ فریاد ہوتا ہے۔ ہر سطر ضرب کلیمی اور ہر لفظ نقشِ فریادی کی شکل رکھتا ہے۔

اگر آج ذرائع ابلاغ کے ہاتھ میں حکمرانی ہے تو اسے جان لینا چاہئے۔ حکمرانی کا عصا صرف اور صرف انصاف اور مظلوم کی فریادرسی کرنا ہے اگر ایسا نہیں تو کئی سکندر، کئی ہٹلر اور کئی چنگیز منوں مٹی کے نیچے بے بسی کی مٹی بن گئے ہیں۔ خدا نہ کرے کہ ابلاغ عامہ کے ساتھ بھی ایسا ہو۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

نئی ایجوکیشن پالیسی کب آئے گی

پاکستان کو قائم ہوئے پچاس سال ہو گئے ہیں۔ گولڈن جوبلی تقریبات منانے کے بعد قوم ستا رہی ہے۔ گولڈن جوبلی تقریبات میں ہر ادارہ ہر فرد نے بھر پور حصہ لیا گذشتہ برسوں کی کامیابیوں اور ناکامیوں کا محاسبہ بھی کیا اور آئندہ کے لئے ٹھوس لائحہ عمل اپنانے کا عزم بھی کیا۔ اگر کوئی ادارہ اس سارے عمل میں الگ تھلگ خاموش تماشائی بنا رہا ہے اور جس نے نہ گذشتہ ماہ و سال کو جائزہ لیا اور نہ آئندہ کی ٹھوس منصوبہ بندی کی وہ ہماری صوبائی اور مرکزی وزارت ہائے تعلیم ہیں جنہیں اس بات کا کبھی احساس ہی نہیں ہوا کہ پاکستان بننے کے بعد اس قوم کو سات تعلیمی پالیسیاں مل چکی ہیں آخری تعلیمی پالیسی ۲۱ دسمبر ۱۹۹۲ء کی تھی جو اس وقت کے وزیر تعلیم سید فخر امام نے متعارف کرائی اس پالیسی میں جو دعوے کئے گئے ان میں ایک دعویٰ اس صدی کے آخر تک شرح خواندگی ۷۰ فیصد ہو جانے کی نوید سنائی گئی سرکاری شعبے میں ۴ اور نجی شعبہ میں ۱۶ یونیورسٹیاں قائم ہوں گی۔ شہری اور دیہی علاقوں میں تعلیمی عدم مساوات دور کر دی جائے گی۔ غرض یہ کہ یہ پالیسی بھی سابقہ پالیسیوں کی طرح فائلوں میں دب گئی اور اس میں عمل درآمد کا وقت ہی نہ آیا کیونکہ جو پالیسی اہلِ علم اساتذہ طلبہ کے مشورہ کے بغیر بنے گی اس کا حشر یہی ہو گا۔ ہمارے ماہرین کو یہ کبھی خیال ہی نہیں آتا کہ وہ جن لوگوں کے لئے لیبر ایجوکیشن، زراعت اور دیگر پالیسیاں بناتے ہیں کم از کم ان سے مشورہ تو کر لیں اور اس بات کو بھی دیکھ لیں کہ ان کو کیا فائدہ ہوا ہے۔ اس وقت ہمارے ملک میں کئی طرح کے تعلیمی نظام رائج ہیں۔ شہروں میں انگریزی تدریس کے ادارے۔ کہیں اولیول اور کہیں اے لیول کہیں ٹاٹ والے سکول اور کہیں ٹاٹ سے محروم سکول۔ کہیں ڈیسک، کرسی والے سکول اور کہیں کمپیوٹرائزڈ ماحول کے ادارے۔ کہیں سمیسٹر سسٹم اور کہیں سالانہ امتحان۔ اور کہیں بائی پارٹس By Parts غرض یہ کہ تعلیم ایک ہے اور اس کے معیار الگ الگ ہیں اور دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ شہری اور دیہی زندگی کا فرق مٹا دیا جائے گا۔ لیکن حالت یہ ہے کہ ہم اپنی تعلیم کو ایک معیار پر لا ہی نہیں سکتے۔ اور کہتے ہیں کہ قومی یکجہتی پیدا نہیں ہو رہی۔ تعلیم کی بے بصری اور بے حسی کا یہ عالم ہے کہ میٹرک سے لے کر بی۔اے اور ایم۔اے تک ہم نے مطالعہ پاکستان اور اسلامیات کو لازمی قرار دیا ہے تاکہ

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

اسلامی اقدار کو فروغ ملے اور مطالعہ پاکستان سے پاکستانیت اور قومی یکجہتی کا ادراک بڑھے لیکن کبھی ہم نے یہ سوچا ہی نہیں کہ اتنے اقدامات سے کیا نتائج نکلے ہیں۔ کیا اسلامی اقدار معاشرہ میں پھیل گئی ہیں۔ کیا ہمارا نوجوان اس لازمی مضمون سے اپنی شخصیت میں نکھار پیدا کر سکا ہے اور کیا صوبوں کے درمیان بہتر افہام ہوا ہے۔ حالت یہ ہے کہ ایک مردم شماری تک ہم ایک دوسرے کو قائل نہیں کر سکے۔ کالاباغ ڈیم پر ہمارے درمیان اختلافات ہیں۔ بھارتی کلچر ہمارے ذہنوں کو مفلوج کر رہا ہے۔ سیٹلائٹ ٹی وی کے پروگرام بے حیائی کو فروغ دے رہے ہیں اور ہم محض کچی پکی عمارت پر سفیدی سے اس کے داغ چھپانا چاہتے ہیں۔ اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے نامور مصنف پروفیسر خواجہ علقمہ صدر شعبہ سیاسیات نے کیا خوب کہا کہ ہمیں اسلامیات لازمی اور مطالعہ پاکستان ابتدائی کلاسوں میں یعنی پرائمری میں متعارف کرانا چاہئے تاکہ ذہنوں میں مضبوط جڑیں بنا سکے ہم یونیورسٹی کی سطح پر کوشش کرتے ہیں جہاں وہ اثرات پیدا نہیں ہوتے جو پرائمری کی تعلیم میں ہو سکتے ہیں۔ ایک بات انہوں نے بڑے پتے کی کہی کہ ہمیں مغربی اور بھارتی کلچر کا مقابلہ کرنے کے لئے Media Studies کو پرائمری کے نصاب میں شامل کرنا چاہئے ابلاغیات کا علم ایم-اے کی سطح کی بجائے پرائمری سے اس کا آغاز ہو میں نے خواجہ صاحب کو بتایا کہ ابلاغیات کو بی-اے کی سطح پر بھی نہیں پڑھایا جاتا اور آپ پرائمری کی بات کر رہے ہیں تو انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ ہمیں اب ایک نئی پالیسی کی ضرورت ہے۔ پرائمری تعلیمی پالیسیاں زائد المیعاد ہو گئی ہیں۔ ہماری وزارت ہائے تعلیم کو ملک میں انقلابی اصلاحات کے لئے اور ملک کو ایشین ٹائیگر بنانے کے لئے نئی تعلیمی پالیسی کی شدید ضرورت ہے۔ ہم تعلیم کے بغیر ترقی کا اگلا قدم نہیں اٹھا سکتے۔

خواجہ صاحب کی باتیں اپنی جگہ حقیقت یہ ہے مرحوم محمد خان جونیجو نے تعلیم کے لئے ۷۰ فیصد شرح خواندگی کا ہدف بنایا لیکن ہدف یہ بھی ہے کہ ابھی تک ہمارے ملک میں ۷۰ فیصد ناخواندہ لوگ ہیں۔ تعلیم ہماری ترجیحات کا آخری بیکار نکتہ یا ہدف ہے۔ یہی وجہ ہے ہمارے روز بروز گرتے ہوئے معیارِ تعلیم، تعلیمی اداروں کی مکدر فضا، داخلوں میں مشکلات، تعلیم یافتہ نوجوان محرومی، مایوسی اور پسماندگی کی دلدل میں پھنس گیا ہے نہ تعلیم بامقصد ہے اور نہ ہی ادارے حالات کو بہتر بنانے کے لئے کوشاں ہیں۔ ہر طرح کے ادارے گلی کوچوں میں کھل گئے ہیں ان کی تدریس اور تعلیم نوجوان بچوں کو مزید جاہل بنانے، کلرک کا مقام

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

دلانے اور مزید مایوسی کی فضاؤں میں کھو دینے کا اہتمام کرتے ہیں۔ بھاری بھر کم فیسیں اور ٹرین سے اترنے والے بھاری بھر کم سامان کی طرح معصوم بچوں کے کندھوں پر بستے جنہوں نے معصوم بچوں کی کمریں ٹیڑھی کر دی ہیں۔ تعلیم روز بروز اتنی مہنگی ہو گئی ہے کہ چائلڈ لیبر کا نعرہ لگانے والوں کے لئے آسانی ہو گئی ہے کہ پرائمری سکولوں سے Drop Out کی شرح بڑھ گئی ہے۔ اس طرح بے شمار بچے اپنی صلاحیتوں سے اور قوم ان کے جوہر سے محروم ہو جاتی ہے۔ نئی روشنی سکولز پر جیکٹ ان بچوں کو علم کی روشنی فراہم نہیں کر سکے پہلے تعلیم اور پھر محنت بیت المال کے پروجیکٹ بھی اچھے نتائج نہیں دکھا سکے۔

قوم ایک نئی موثر، بامقصد تعلیمی پالیسی کی آرزو مند ہے یہ قوم دے گا؟ اس کے بارے میں کون سوچے گا؟ اس کا جواب جناب رانا محمد اقبال یا جناب غوث علی شاہ یا دونوں؟

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

بند گلی اور آخری راستہ

خیر سگالی کا مثالی جذبہ اگر کہیں دیکھنا ہو تو آپ نواب پور ملتان سے چونگی نمبر ۸ (سابقہ) سے آنے والی بسیں دیکھیں آپ کو خوشگوار حیرت ہو گی کہ اسی بس میں بکریاں، بھیڑیں، مرغیاں، کبوتر سوار ہیں۔ ان جانوروں کے ہمراہ دیگر سواریاں مرد وزن، بچے خوشی خوشی سفر کر رہے ہوتے ہیں۔ اگر کہیں راستہ میں بس رک جائے تو ساری سواریاں اسے دھکا دیتی ہیں اور بکریاں، بھیڑیں، مرغیاں پھر بھی اپنی نشست پر براجمان رہتی ہیں۔ انہیں وی آئی پی کا درجہ ملا ہوتا ہے اور باقی سواریاں دھکے کھاتی، گرتی پڑتی منزل تک پہنچتی ہیں۔ یہ بسیں محبتوں اور دلچسپیوں کی علامت ہیں۔ دیہاتی سادہ لوگ اسی سادہ بس میں سفر کرتے ہیں حقہ سگریٹ ساتھ رکھتے ہیں اور قہقہے بھی۔ زور شور کی داد بھی دیتے ہیں اور وفور جذبات سے کندھے پر بھی ہاتھ مارتے ہیں۔ ٹیپ ریکارڈر کے گانے انہیں مست بھی کرتے ہیں۔

ہمیں بھی ایک دفعہ ان بسوں میں سفر کرنے کا تاریخی موقع ملا۔ ہمارے سامنے ایک دیہاتی شادی کا سالن دیگچی میں لئے سر پر رکھ پر بیٹھا تھا۔ ہر طرح کے احتیاط کہ کہیں کوئی بکری پیشاب نہ کر دے یا ان میں مینگنیاں نہ ڈال دے لیکن جونہی بس "شاہ دی کھوئی" کے پاس پہنچی۔ سپیڈ بریکر کی وجہ سے ایسا دھچکہ لگا کہ سالن کی دیگچی ایسی گری کہ سالن کی بوٹیاں کسی کے سر پر، شوربہ کسی کے کپڑوں پر اور دیگچی بکریوں کے ہاتھ لگی۔ پوری بس گائے کے گوشت میں پکے ہوئے سالن کی خوشبو سے مہک اٹھی۔ پوری بس میں خوشیاں ہی خوشیاں بنستے مسکراتے چہرے اور سالن والے کے چہرے پر ایسی مایوسی جیسے اس کی جیب کٹ گئی ہو، جیسے اس کا ٹکٹ گر گیا ہو اور اسے دوسرا ٹکٹ خریدنا ہو۔ بیچارہ ہمدردیوں کا مرکز بن گیا۔ ہر سواری ہمدرد، ہر دل اداس، کہ اب یہ گھر والوں کو کیا کھلائے گا اور اس کے بچے جو اس سالن کی انتظار میں ہیں ان کا کیا بنے گا بس رواں دواں جاری ہے۔ کھڈے اس کی رفتار کو روک تو لیتے ہیں لیکن اس کی آواز کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ہر کھڈے پر کلمہ شہادت پڑھنے کو جی چاہتا لیکن بس کے طربیہ ماحول کو دیکھ کر چپ کر کے بیٹھے رہے کہ جب سب خوش ہیں تو ہم اداس کیوں بنیں۔

بس ڈرائیور کی مہارت کو دیکھ کر اس کا انٹرویو کرنے کا سوچا۔ ان سے پوچھا کہ بس چلانے سے پہلے کیا کرتے تھے۔ ڈرائیور نے بڑے فخریہ انداز سے بتایا۔ جب کسی ملازم سے

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

تجربہ کا سرٹیفکیٹ پوچھا جائے تو وہ خوشی سے بتائے گا کہ میں پہلے فلاں فیکٹری کا جنرل مینیجر تھا اب آپ کے ہاں درخواست دی ہے۔ڈرائیور نے بھی اسی اعتماد سے بتایا کہ وہ پہلے بستی صالح مہے کے فلاں ذمیندار کے ٹریکٹر ڈرائیور تھے۔مالک کے دو کتے ٹریکٹر تلے آکر مر گئے اس لئے اس نے مجھے جواب دے دیا،اب مجھے اس بس پر نوکری مل گئی ہے اللہ کا کرم ہے کہ ایک در بند کئی در کھل گئے ہیں۔میں نے اس خوبصورت انٹرویو پر ڈرائیور کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اب اس در کو بند نہ کرنا کیونکہ اس میں اللہ کے بندے سوار ہیں۔ڈرائیور نے مسکراہٹ سے یقین دہانی کرائی اور پھر بس کو نواب پور کی تنگ سڑک پر دوڑانا شروع کر دیا اور بڑے داد طلب انداز سے میری طرف دیکھا اور بتایا سڑک تنگ سہی لیکن میری بس کو رستہ مل جاتا ہے سارے دکاندار اپنی ریڑھیاں ایک طرف کر لیتے ہیں اپنے بینچ ہٹا لیتے ہیں اگر کوئی نہ ہٹائے تو ان کے بینچ اور ان کی ریڑھیاں میری بس کے ساتھ لگ جاتی ہیں ان پر پڑی سبزیاں سڑک پر بکھر جاتی ہیں کہیں توریاں اور کہیں آلو بکھرے پڑے ہوتے ہیں۔کیوں صاحب جی!ڈرائیور ہو تو مجھ جیسا جسے راستے خوب مل جاتے ہیں۔اور میں نے کہا اور ہمیں آخری راستہ کا ادراک ہو جاتا ہے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

سوال کا جواب بھی سوال میں ملا مجھے

اردو کے استاد کلاس روم میں اپنے طلبا کو برصغیر کے نامور مصنف، ادیب سجاد یلدرم کے حالات زندگی پڑھا رہے ہیں اچانک آخری بینچ سے آخری طالب علم سوال اٹھاتا ہے ''سر یلدرم کے کیا معنی ہیں ؟اتفاق سے استاد محترم کو یلدرم کے معنی نہیں آتے وہ ادھر اُدھر دیکھتے ہیں انہیں دو لڑکے ایسے نظر آتے ہیں جو آپس میں بات کر رہے ہوتے ہیں بس۔ استاد کو موضوع مل جاتا ہے ان دو لڑکوں کو مخاطب کر کے کہتے ہیں تمہیں شرم نہیں آتی۔ پوری کلاس میں علمی سوالات اٹھائے جا رہے ہیں علم وادب کی ترقی کے بارے میں سوچا جا رہا ہے اور تم گپوں میں مصروف ہو۔''

بیس منٹ کر نصیحتوں اور ڈانٹ ڈپٹ کا سلسلہ جاری رہتا ہے اتنے میں پیریڈ کا وقت ختم ہو جاتا ہے اور یلدرم کے معنی وہیں رہ جاتے ہیں۔ اتفاق سے یلدرم کے معنی ہمیں بھی نہیں آتے تھے استاد اردو ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ نے بتایا کہ یہ ترکی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی بجلی کی چمک ہے۔

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ کلاس روم میں بعض طالبِ علم اچھے سوالات اٹھاتے ہیں مگر استاد کی قہرمانی سوال کو ابھرنے سے پہلے دبا دیتی ہے۔ بعض معصوم بچے اپنے ابو سے امی سے گھر میں سوال کرتے ہیں ایسے ایسے سوالات جو بعض اوقات والدین کی سمجھ میں بھی نہیں آتے لیکن ڈانٹ ڈپٹ کی بجائے ان کا معقول جواب بچوں کو دیا جائے۔ معصوم ذہن نئی سے نئی بات ماننا چاہتے ہیں۔ زندگی کے پُر اسرار موضوعات، کائنات، ستارے، کہکشاں سبھی ان کے لئے حیرتوں کا سامان ہیں۔ ان ذہنوں کے معصومانہ سوالات ان کے تجسس، جستجو اور تلاش کے جذبوں کے عکاس ہوتے ہیں۔ اچھا سوال ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ علم کو بڑھاتا ہے اور فکر کو نئی شکل دیتا ہے۔

A Good Question Deserves To Live

اگر سوال کرنے پوچھنے کا عمل رک جائے تو علم کیسے بڑھے گا جب کائنات معرض وجود میں نہیں آئی تھی خالق کائنات نے فرشتوں سے پہلا مکالمہ یا پہلا سوال یہ کیا تھا کہ تم کیا جانتے ہو اور جب انسانیت عالم ارواح میں تھی تو پہلا سوال یہ تھا ''کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں'' اور

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

جواب یہ تھا کہ بے شک آپ ہمارے رب ہیں۔

یعنی سوال زندگی ہے سوال علم کی وسعت ہے فکر کی جولانی ہے، ذہن کی گوشوں کی جلوہ فشانی ہے۔ اگر سوال جنم نہ لیں تو کائنات کی سرگرمیاں ختم ہو جائیں۔ یہ حیات و کائنات صرف اور صرف سوال پر منحصر ہے۔ اس کائنات کی ترکی انہیں سوالوں اور انہیں جوابوں سے آگے بڑھی ہے انسان کی ذہانت کا اندازہ سوال سے ہوتا ہے اگر سوال کمزور ہو تو سوال کرنے والے کے ذہن کو پڑھا جا سکتا ہے۔ معاشرے میں ان گنت سوالات موجود ہیں مگر ہم ان کا جواب دینا نہیں چاہتے۔ یا ہمیں معلوم نہیں یا ہم ان کا جواب تلاش ہی نہیں کرتے۔ اپنی محدود معلومات کے سبب دوسرے کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو سوال گندم اور جواب جَو ہوتا ہے۔ Beat about the Bush اسی سے نکلتا ہے۔ اکثر اسمبلی یا پارلیمنٹ میں متعدد سوالات اٹھائے جاتے ہیں اور بعض اوقات ان کے جوابات وزیر یا پارلیمانی سیکرٹری دیتے ہیں۔ اور سوال اٹھانے والا کہتا ہے جواب درست نہیں اور سوال کا جواب دینے والا کہتا ہے کہ سوال ہی درست نہیں تھا۔ ان حالات میں سوال کی تہذیب کرنی پڑتی ہے اور جواب کی بھی Vetting کرنی پڑتی ہے۔ اس طرح سوال اور جواب نکھر جاتے ہیں شاید اس کائنات کا حسن سوال ہے اگر سوال مر جائے تو جواب کہاں سے آئے گا۔ لہذا سوال کو زندہ رہنا چاہئے اور اچھے سوالات نئی سوچ کو نئی راہیں دیتے ہیں۔ سوال در حقیقت ابلاغ کا نقطہ آغاز ہے۔ سوال آپ کے کلام کو اور آپ کے پیغام کو آگے بڑھاتا ہے بعض اوقات بڑے افسروں کی بریفنگ کے بعد پوچھا جاتا ہے Any Question اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ No Question اور سوال و جواب کا سیشن مجروح ہو جاتا ہے اور بہت سے گوشے جو علم اور تحقیق کو آگے بڑھاتے دم توڑ دیتے ہیں۔ کتنے ذہن، کتنے دماغ صرف سوال کو پذیرائی نہ ملنے سے اپنی تحقیق سے محروم ہو جاتے ہیں۔ کتنے ارسطو، بقراط، سقراط، ابن سینا، ابن غزالی، ابن خلدون ہماری کلاسوں میں موجود ہیں مگر انہیں سوال کرنے کا حوصلہ نہیں ملتا۔ جھجک، پریشانی، اعتماد سے محروم ان کی ذہانت کو ملیامیٹ کر دیتی ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم ہر اچھا منصوبہ بناتے ہیں اس کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہیں اور بچوں کو بامقصد شہری بنانے سے محروم منصوبہ بندی کرتے ہیں کتنے والدین، کتنے اداروں اس بات پر سوچتے ہیں۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

How to train the kids?

ان کی تربیت ان کے سوال اور آپ کے صحت مند جواب ہیں۔ دیکھنے میں یہ آیا ادھر بچے نے سوال کیا ادھر اس کو گالیوں سے بھرا جواب ملا۔ بے مقصد سوال کرتے ہو۔ اپنا اور میرا وقت ضائع کرتے ہو اس صورت حال سے کیا تصویر سامنے آتی ہے کہ بچہ اپنے باپ سے گھر والوں سے بیزار ہو جاتا ہے کہ مجھے اہمیت نہیں دی جاتی میرے سوالوں کا جواب نہیں ملتا۔ میں کہاں جاؤں کس سے سیکھو؟ کلاس میں استاد کی ڈانٹ گھر میں والدین کا رویہ، معاشرہ ویسے ہی سوال وجواب سے محروم ہے۔ نفسا نفسی نے معاشرہ کو اصلاح سے اور بچوں کی تربیت سے محروم کر دیا ہے تو ایسے معاشرے جو سوال سے محروم ہیں انتشار کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کسی سوال کا جواب No Comments نہیں ہونا چاہئے۔ الجھے ہوئے ذہن کو سلجھانے کے لئے اس کے جواب کو معنی دینا ضروری ہے۔ اگر سوال کا جواب نہیں ملے گا تو اخبار کیسے نکلے گا No Comments کوئی خبر نہیں سوال جب بہت سے پوچھے جائیں گے تو خود بخود نکھر جائیں گے اور جواب زیادہ مدلل اور با مقصد ہو جائیں گے۔ سوال تو بادلوں میں چھپے ہوئے پانی کا ادراک دیتا ہے۔ سوال تو زمین کی تہہ میں پوشیدہ خزانوں کا علم دیتا ہے سوال تو سمندر سے گوہر نایاب کا پتہ بتاتا ہے۔ سوال ہی علم ہے۔ سوال ہی زندگی۔ سوال ہی کائنات اور سوال ہی کائنات سے آگہی کا نام ہے۔ تمام ایجادات، تمام علوم، تمام فنون کا سر چشمہ سوال ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بعض اوقات سوال کا جواب بھی سوال ہی میں ملتا ہے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

گرد

گرد کیا ہے ؟کوئی اس کی متعین تعریف نہیں۔ کہیں اس کا نصاب میں ذکر نہیں۔ کاش طلباو طالبات کو کلاس میں پڑھایا جاتا کہ گرد کس طرح ہمارے جسم و جاں اور معاشرہ پر اثر انداز ہوتی ہے۔ آنکھ، کان میں چلی جائے تو ملٹری کے ٹیسٹ میں امیدوار کو فیل کرا دیتی ہے۔ معاشرے میں گردش کرے تو معاشرہ گرد آلود ہو جاتا ہے۔ فضا کا رخ کرے تو ہوائی کمپنیوں کو ناکام بنا دے کوئی جہاز وقت مقررہ پر منزل مقصود پر نہ پہنچ سکے۔ آشوب چشم اسی کی مہربانیوں سے جنم لیتا ہے گرد کے ذرات ۱۰ میکران (Microns) کی تعداد میں جہاں چاہیں آزادانہ گھوم پھر سکتے ہیں۔ جن دکانداروں کو اپنے سرمہ نور بصیرت پر بڑا ناز ہے کہ آنکھوں میں چمک اور چہرے کی رونق بڑھاتا ہے وہ سرمہ گرد کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ گرد آنکھوں کی بینائی اور کان کی شہنائی کو اس طرح اڑاتی ہے جیسے بندوق کی گولی درختوں پر بیٹھی چڑیوں کو اڑا دیتی ہے۔ گرد جنوبی پنجاب کا انمول تحفہ۔ تھل کبھی اس کا مرکز ہوا کرتا تھا۔ یہاں سے گرد کی آندھیاں چلتی تھیں اور ہمارا شاعر ہوا کے رستے میں چراغ جلاتے مگر یہ آندھیاں انہیں بجھا دیتیں۔

گرد کیوں جنم لیتی ہے ؟اس لئے کہ جنوبی پنجاب کا درجہ حرارت بہت زیادہ ہے۔ نمی موجود نہیں ہوتی۔ خشکی کی وجہ سے گرد کو خوش گوار فضا میسر آتی ہے۔ کچھ لوگ گرد کو ملتان تک محدود کرتے ہیں اور اسے گرد و گرما سے ترجیح دیتے ہیں۔ گرد صرف ملتان کا نہیں پورے پنجاب اور جنوبی پنجاب کا خصوصی تحفہ ہے۔ جس سے نہ کان بچتے ہیں نہ آنکھ اور کلائی کی گھڑی جس میں معمولی معمولی ذرات چلے جاتے ہیں اور اچھی خاصی گھڑی کا ستیاناس کر دیتے ہیں۔ گرد سے کیسے بچا جائے۔ گرد کا دشمن صرف سبزہ ہے۔ سبزہ کہاں سے لائیں ؟اگر اسے سڑکوں پر لگائیں تو کارپوریشن اور ایم ڈی اے کے حکام اس طرح توڑ پھوڑ کرتے ہیں جیسے تاتاریوں نے بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ کارپوریشن کے حکام کہتے ہیں کہ ہمارا ۳۳ کروڑ کا سالانہ بجٹ ہے جبکہ ۲۱ کروڑ صرف عملہ کی تنخواہ پر خرچ ہوتا ہے اور یہ عملہ گرد کے فروغ میں موثر کردار ادا کرتا ہے۔ سڑکوں پر گرد کی ڈھیریاں گلیاں گرد سے اٹی اور راستے گرد آلود اتنے ہیں کہ کبھی عملہ اٹھانے کی کوشش نہیں کرتا۔ انہوں نے کسی پرانے بزرگ سے سن

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

رکھا ہے کہ ملتان کی پہچان گرد ہے۔ اگر گرد سڑکوں سے اٹھا دی گئی تو پھر ملتان کی پہچان گم ہو جائے گی۔ لہذا پہچان کو قائم رہنا چاہئے۔

گرد کی دیدہ دلیری تو دیکھئے کہ اپنے اپنے کمرہ کو ہر طرح سے محفوظ کر لیا ہے۔ پردے لگے ہوئے ہیں اے سی چل رہا ہے کہیں سے گرد کا امکان نہیں مگر آپ میز پر نگاہ دوڑائیں تو آپ کو بند کمرہ میں گرد کی تہہ نظر آئے گی۔ ایک بار نہیں کئی بار آپ کمرہ صاف کریں گے۔ میز پر رکھی اشیاء صاف کریں گے کتاب رسالہ صاف کر کے رکھیں گے مگر تھوڑی دیر کے بعد گرد ان پر موجود ہو گی۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ ہم معاشرے میں ہر برائی کے خلاف اعلان جہاد کرتے ہیں تو گرد کے خلاف ہماری کوئی تنظیم کیوں نہیں۔ آلودگی کے خلاف تو سبھی ہیں مگر گرد کے خلاف ایک عظیم تحریک کی ضرورت ہے تاکہ انسان اور اس کے ماحول کو بچایا جا سکے۔ گرد کی شرح روز بروز بڑھتی جا رہی ہے ملتان اور جنوبی پنجاب کے دیگر خطے اسی کی زد میں آ رہے ہیں گرد نے انسان کو اپنے ماحول میں بیزار کر دیا ہے۔ گرد پر قابو پانے کے لئے ہر محلہ ہر گلی میں گراسی پلاٹ ہونے چاہئیں۔ مگر المیہ یہ ہے کہ ہمارے بلدیاتی اداروں نے ہر کارپوریشن، ہر ضلع کونسل میں حدود میں واقع مکان، دکان کو فروخت کر کے اپنے محل تعمیر کر لئے ہیں۔ ہر پلاٹ بک گئے ہیں سبزہ زار دفاتر میں بدل گئے ہیں۔ اگر شہر میں سبزہ ہو باغ و پارک ہوں تو پھر گرد کا وجود نہیں رہے گا۔ تھل کے چولستان آباد کرنے میں اضلاع بہاولپور، ملتان، میانوالی میں واقع لاکھوں ایکڑ بنجر اراضی کو زیر کاشت لانا ہے۔ اگر ایسا کر لیا گیا تو پھر گرد کے طوفان، اور ظلم اور بے انصافی کی آندھیاں نہیں چلیں گی۔ مٹی کے چلتے پھرتے طوفان مسافروں کو تنگ نہیں کریں گے۔ مسافر راستہ نہیں بھولیں گے۔

مسافر ہوں سفر ہے کام میرا
مجھے راہ طلب میں شام کیوں ہو

132

گرد ٹنوں، منوں کے حساب سے ہمارے معاشرے میں پھیلی ہوئی ہے مگر ہم اس کا نوٹس نہیں لیتے۔ گلے، سانس، ناک، کان، آنکھ کے عوارض بڑھ رہے ہیں۔ مگر ہم نے گرد سے محبت کر لی ہے۔ ہر دکان سے شام تک بکنے والا گوشت گرد سے اٹا ہوتا ہے۔ پھلوں، سبزیوں پر گرد، جوس بیچنے والوں کے برتنوں میں گرد، بالٹی میں رکھا ہوا پانی گرد سے متاثر ہوتا ہے۔ ہم گرد کے دوست بن گئے ہیں۔ مٹھائیوں پر گرد، اشیاء خوردونوش پر گرد، غرض

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

یہ کہ گرد ہی گرد ہے۔ فضائی، ہوائی آلودگی میں گرد موجود ہے۔

ہمیں آئندہ اپنے ایم پی اے اور ایم این اے کو ووٹ اس بنیاد پر دینا چاہئے کہ وہ گرد کے خلاف اسمبلی میں ایکٹ منظور کرائیں تاکہ گرد کو ملک سے نکالا جا سکے۔ گردرا کے ایجنڈوں سے زیادہ خطرناک ہے اس کی وجہ سے دہشت گرد ہمیں نظر نہیں آتے۔ گرد اور دہشت گرد ایک ہی قبیلہ کا نام ہے۔ ان دونوں کے خلاف ہمیں اعلان جہاد کرنا چاہئے تاکہ اندر کے دشمن کو باہر نکالا جا سکے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ملتان کا زیرو پوائنٹ

لاہور کو تہذیبی، علمی، ادبی، ثقافتی اور سیاسی شناخت کا شہر کہتے ہیں۔ اس ساری شناخت کے پیچھے جو قوت کار فرما ہے وہ لاہور کے فوارے ہیں۔ ہر چوک، ہر موڑ کسی فوارہ سے وابستہ ہے۔ اس قابل کھاتا، لہراتا، جھومتا پانی لاہوریوں کے دل بہلاتا ہے اور باہر سے آنے والوں کو نظارہِ شوق دیتا ہے اور احساس دلاتا ہے کہ شہروں کا حسن فواروں سے ہے۔ ٹھنڈے پانی کے چشموں سے ہے جو شہر اس سے محروم ہیں بھلا وہ بھی کیا شہر ہیں۔ ان فواروں سے لاہور کی بدرنگ، بے ذوق، بے ہنگم ٹریفک کو قرار ملتا ہے۔ سواریوں کو سکھ اور جانے والوں کو راحت ملتی ہے۔ اسے طربیہ، خوشگوار، پُر لطف ماحول سے جب ہم اپنے پسماندہ، دور افتادہ شہروں کو لوٹتے ہیں جی چاہتا ہے جونہی ٹرین سے اتریں اور سٹیشن سے باہر نکلیں ہمارے سامنے فوارہ موجود ہو جو نیاگرہ فال کی طرح خوبصورتیاں بکھیر رہا ہو۔ حسن اور لطافت کی بہار پیدا کر رہا ہو۔ سفر کی ساری تھکاوٹ اتر جائے۔ پھر جب شہر میں داخل ہوں تو گھنٹہ گھر کے سامنے والی خالی جگہ جو آج کل سیاست کی "رام گلی" بنی ہوئی ہے اس جماعت کو جب جماعت کو جی میں آتے اپنا پرچم لہرا دیتے ہیں اور جس وقت موڈ ہو اپنا جلسہ کر ڈالتے ہیں ہماری خواہش ہے کہ اس تنگ جگہ پر اگر کوئی فوارہ نصب کر دیا جائے تو سیاسی جلسوں پر پانی بھر جائے گا اور ٹریفک کے رکنے سے جو مسائل پیدا ہوتے ہین وہ بھی خود بخود حل ہو جائیں گے اور جب کارپوریشن کو کسی جلسہ کو خراب کرنا مقصود ہو تو فوارہ چلا دیں تو ساری سیاست پانی پانی ہو جائے گی۔ ہمری بھی کیا کیا اور عجیب عجیب خواہشیں ہیں۔ ہر خواہش پہ دم تو نہیں نکلتا البتہ خوارد کی آرزو جھلگتی ہے۔ جی میں آتا ہے کہ ملتان کو اسلام آباد کی طرح صاف ستھرا شہر بنا لیں۔ اس کی سڑکیں بلیو ایریا کی طرح کشادہ، لمبی اور گھاس اور درختوں کی مثال بنیں۔ کبھی خواہش پیدا ہوتی ہے کہ کاش ملتان کے قریب کوئی سمندر ہوتا۔ ہم بھی کلفٹن میں سیر کرنے جاتے۔ سمندر کے پانی میں نہاتے اور تنگے پاؤں ریت پر چلتے، جوگنگ کرتے، سمارٹ بنتے اور حسین نظر آتے۔ بڑھی ہوئی توند، بدھے جسم اور تھکاوٹ کا خاتمہ ہو جاتا۔

لے جائے گا ساتھ اپنے سمندر کو اٹھا کر
یہ شخص جو ساحل پر کھڑا سوچ رہا ہے

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

مگر ایسا کب ممکن ہے۔ ملتان میں سمندر کیسے آسکتا ہے۔ ویسے بھی ہم نے ملتان سے ہر قسم کے نالے ختم کر دیئے ہیں البتہ دلوں سے ضرور اٹھتے ہیں یا ان پر قبضہ کر لیا ہے یا عین ان کے درمیان اپنے مکان بنا لئے ہیں۔ اپنا سیوریج سسٹم اتنا بہتر کر لیا ہے کہ پانی شہر سے باہر نہیں جاتا۔ ہزار جتن کر لیں پانی کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ مجھے پردیسی نہ بناؤ بلکہ آزاد بھینسوں کی طرح سڑکوں پر چلنے پھرنے دو۔ جدید وسائل اور مشینری نہ ہونے کی وجہ سے ہم بھی اس پانی سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں۔ جب تک جی چاہے شہر میں تعفن پھیلاؤ۔

ملتان اچھے پارکوں سے محروم ہے۔ ویسے بھی یہاں وسیع پارک بن نہیں سکتے۔ سارا علاقہ زرعی ہے اور زراعت کو وسیع رقبہ کی ضرورت ہے۔ اس لئے کارپوریشن پارک اور باغ بنانے کی بجائے شہر کو تنگ کرنے کے منصوبے بناتی ہے البتہ کارپوریشن اور ایم۔ڈی۔اے والے شہریوں پر کبھی کبھی مہربان بھی ہو جاتے ہیں۔ ان کی مہربانی کا ایک ثبوت چونگی نمبر ۹ پر ''مکی ماؤس'' والا اکلوتا فوارہ ہے۔ اسے جس جدید طرز تعمیر سے بنایا گیا ہے اس کا پانی سڑک سے گزرنے والوں کو خود بخود متوجہ کرتا ہے۔ جب ان کے اجلے کپڑوں پر زنگ آلود پانی گرتا ہے تو شہری مکی ماؤس والے فوارہ کے حسن سے محفوظ ہوتا ہے۔ اس فوارے کی اور بھی بڑی بڑی خصوصیات ہیں جن میں ایک خصوصیت بذات خود ''مکی ماؤس'' ہے اسے کس دماغ نے تراشا ہے اسے حسن کارکردگی کا اعزاز ملتان چاہئے کہ یہ مکی ماؤس شاید یونیورسٹی کے طلباء کے لئے ہے جو ابھی بچے ہیں اور شاید کے۔جی کلاس میں پڑھتے ہیں یا ان مسافروں کے لئے ہے جو لاہور سے مختلف بسوں سے آتے ہیں اور چونگی نمبر ۹ پر اترتے ہیں یا یہ مکی ماؤس کسی کیلئے بھی نہیں ہے کیونکہ کوئی بھی اس سے متاثر نہیں ہوتا۔ البتہ فوارہ اور مکی ماؤس جن بجلی کی تاروں سے آراستہ ہیں وہ تاریں کھلی ہیں۔ ان میں کرنٹ موجود ہے۔ کوئی معصوم بچہ ان تاروں سے کھیل سکتا ہے اور یہ تاریں جان لیوا بھی ہو سکتی ہے۔ ملتان آج کل بارشوں کی زد میں ہے۔ یہ کھلی تاریں مکی ماؤس کا تو کچھ نہیں بگاڑ سکتیں البتہ ہمارے معصوم چہرے اور چاند جیسے مکی ماؤس متاثر کر سکتی ہے۔ چونگی نمبر ۹ کا یہ فوارہ ہماری فوری توجہ چاہتا ہے۔ احساس دلاتا ہے کہ میں یہاں کیوں ہوں اور کیسے ہوں؟ چونگی نمبر ۹ کا دوسرا نام ملتان کا زیرو پوائنٹ ہے۔ یہ زیرو پوائنٹ اسلام آباد کا ہم پلہ بننا چاہتا ہے۔ یہ مقام یہ مرتبہ اسے کون دے گا؟

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

روح کی غذا-ناکردہ گناہوں کی سزا

ایک حساس شاعر نے کتنے بلیغ انداز میں کہا تھا

سودا کی جو بالیں پہ ہوا شور قیامت
خدام ادب بولے، ابھی آنکھ لگی ہے

ہمیں جس شور قیامت کا سامنا ہے وہ ٹیپ ریکارڈر اور اس کے ساتھ کھڑے بڑے بڑے ڈیک ہیں جو ہر گلی کوچے وار ہر بازار میں اس زور شور سے بجتے نظر آتے ہیں اور ان کی آواز سے ایسے کان بجتے ہیں کہ پھر کچھ سنائی نہیں دیتا۔ کہتے ہیں موسیقی روح کی غذا ہے یقیناً ہو گی جب لطیف رنفیس خیالات سے مطابقت رکھتی ہو۔ یعنی سننے والا بند کمرہ میں بیٹھ کر دھیمی آواز میں کوئی غزل کوئی عارفانہ کلام خوبصورت لفظوں سے ترتیب دیا ہوا نغمہ، شعر اور خوبصورت دھنوں سے سجی کلاسیکل شاعری سنے تو یقیناً روح کو تقویت اور طبیعت کو فرحت حاصل ہوتی ہے اور یہ دنیا یہ کائنات حسین دکھائی دیتی ہے۔ روح اور دماغ معطر اور شاد آباد ہو جاتا ہے دل کے تار بج اٹھتے ہیں۔ کیونکہ موسیقی انسان کی رگ رگ، نس نس میں موجود ہے۔ یہ ساز فطرت ہے۔ کوہساروں، مرغزاروں اور حسین وادیوں سے موسیقی کی لہریں نکلتی ہیں۔ درختوں کی سرسراہٹ، بہتے آبشاروں کی نغمگی، چاند کی روپہلی کرن شعر و نغمہ کو جنم دیتے ہیں یہ شعر و نغمہ دکھی دلوں میں زندگی کی بشاشت اور تازگی بھر دیتا ہے۔ انسان کی روح صاف ستھری کپاس کی طرح دھل جاتی ہے اور دل و دماغ کی فضا معطر ہو جاتی ہے۔

چہار چیز دل برو کدام چہار
شراب و سبزہ و آبِ رواں و روئے نگار

چار چیزیں دل کے غم کو دور کرتی ہیں جن میں مشروب، سبزہ، آبِ رواں اور روئے نگار شامل ہیں اور ہمارے صوفی بزرگ دل کو غم ان چار چیزوں میں تلاش کرتے ہیں۔

چہار چیز دل برو کدام چہار
نماز و روزہ و تسبیح و توبہ استغفار

لیکن یہ گلیوں میں چیخم دھار بے تکے گانے اور اونچی آواز میں بجتے ہوئے ڈیک کس طرح روح

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

کو مصاوت کرتے ہیں۔ دل و دماغ کو ہیجان اور انتشار سے دوچار کرتے ہیں، آدمی اپنے ماحول سے بیزار ہو جاتا ہے۔ اکثر محلے، گلی میں جھگڑے، فساد، قتل کا Cause of Action یہی ڈیک ہوتا ہے۔ جس پر کنے کنے جاناں بلو دے گھر کے گانے اور اسی نوعیت کی بے تکی موسیقی فسادِ معاشرہ ہے۔ نوجوانوں کو اس موسیقی اور موسیقی کے دوران پڑھائی اکیسویں صدی کی دہلیز پر قدم کا نیار .جحان ہے۔

اکثر نوجوان بے روزگاری، وسائل سے محرومی کا حل ان گانوں میں تلاش کرتے ہیں اکثر لوگ گھریلو جھگڑوں، خاندانی الجھنوں کا حل ان گانوں کو اونچی آواز میں سننے میں تلاش کرتے ہیں۔ ''اکیلے پن'' سے بچنے کا حل بھی ان ڈیکوں کی بے ہنگم آواز میں تلاش کیا جاتا ہے۔

لوگ اس چیخ و پکار میں اپنے دکھ چھپانا چاہتے ہیں لیکن پورے معاشرہ کو جو عذاب میں ڈال چکے ہیں ان سے نجات کون دلائے گا۔ کوئی محلّہ کی اصلاح کمیٹی ان کے ڈیک کو بند کرانے کی جرأت نہیں رکھتی۔

پولیس ان کو Radio Act کے تحت چالان نہیں کرتی۔ بے وقت کی اس راگنی کو روکنے کا حال کسی کے پاس نہیں۔ یہ ڈیک بج رہے ہیں اور پوری آواز کے ساتھ سوتوں کو جگا رہے ہیں۔ لوگوں کا جینا حرام کر رہے ہیں۔ رات گئے تک گاڑیوں میں دکانوں میں، بازاروں میں بج رہے ہیں۔ اہل محلّہ کی نیندیں اڑ گئی ہے مگر ان کے ڈیک خراب نہیں ہوئے، ریڑھی والے دیک لگائے پھرتے ہیں کھجوریں بیچنے والے، قلفیاں فروخت کرنے والے، آئس کریم کی سائیکلیں سب مل کر بچوں کو اور ان کی Study کے ماحول کو برباد کر رہے ہیں۔ کوئی ایسا مرد مجاہد نظر نہیں آتا جو انہیں احساس دلائے کہ آپ معاشرے میں شور کے بیوپاری کیوں بن گئے ہیں۔ ایک طرف ڈیک ہیں اور دوسری طرف لاؤڈ سپیکر ہیں۔ ڈیک اور لاؤڈ سپیکر کے درمیان دن بھر کا تھکا انسان جینا چاہتا ہے۔

اسے سکون، اسے اطمینان کون دلائے گا۔ ٹیپ ریکارڈر اور ڈیک کا سوئچ کون آف کرے گا۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

لیڈر اور ان کے بیانات

صحافی کو صحافت کرنی ہوتی ہے جو غیر موصول ہو اس کی نوک پلک سنوارنے اور خبر کو نکھارنے کے لئے بڑے جتن کرنے پڑتے ہیں اور معیاری اخبار نکالنے کے لئے فکر و دانش کے سارے خانے استعمال کرنے ہوتے ہیں اور بڑی امیدوں اور توقعات سے اخبار کو قارئین کرام تک لانا ہوتا ہے اخبار فروش اپنی سائیکلیں اور موٹر سائیکلیں بھگا بھگا کر قارئین تک پہنچتے ہیں۔ قارئین کرام اخبار کے انتظار میں ناشتہ موخر کر دیتے ہیں۔ جب تک گھر میں اخبار نہ پہنچ جائے ایسے لگتا ہے جیسے کوئی کام ابھی ادھورا ہے۔ اخبار گھر میں روزمرہ کی اہم چیزوں کی طرح ایک حصہ ہے۔ ناشتہ کی طرح اہم ہے اگر یہ قصور کیا جائے کہ جس گھر میں اخبار ریڈیو ٹیلی ویژن موجود نہیں وہ گھر کیسا ہو گا۔ اس گھر کے افراد اس بھرپور انفارمیشن کے دور میں معلومات سے کتنے محروم ہوں گے۔ بات چیت میں۔ میل ملاقاتوں میں۔ تقریبات میں ایسے افراد اپنی گفتگو میں کیا اضافہ کرتے ہوں گے۔ جنہیں اخبار پڑھے کئی دن گزر جائیں اور جن گھروں میں اخبار نہ آئے تو ان کی کیفیت کیا ہو گی۔ لہذا۔ اخبار۔ صحافی۔ اخبار فروش اور قارئین کرام معاشرے کا اہم حصہ ہیں جنہیں اپنے دائرے میں اور حلقہ اثر میں اخبار کو دیکھنا پڑتا ہے۔ پڑھنا پڑتا ہے لیکن قارئین کرام ان سب سے مختلف طبقہ ہے صحافی کو اپنے کام کا انعام تنخواہ میں ملتا ہے مدیر اپنی ذمہ داریوں کا معاوضہ لیتا ہے۔ اخبار فروش کو کمیشن ملتا ہے۔ اور قارئین کرام کو اپنی جیب سے ۷ روپے، ۱۰ روپے ۱۲ روپے ایک اخبار پر خرچ کرنے پڑتے ہیں اور اس خرچ کے بعد جو انہیں انعام ملتا ہے وہ لیڈروں کے بیانات ہوتے ہیں۔ ایک لیڈر بیان دیتا ہے کہ عدلیہ اور پارلیمنٹ کے معاملات میں نہ کوئی ہارا اور نہ ہی کوئی جیتا لیکن قارئین کرام پوچھتے ہیں کہ اگر کوئی نہیں ہارا اور نہ ہی کوئی جیتا ہے تو پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

ایک ماہ سے بیانات در بیانات جو قوم کو پڑھنے پڑے ہیں اور جس اضطراب اور کرب سے وقت گزارنا پڑا ہے اس کا مداوا کیا ہے؟ قوم کو کیا ملا ہے؟ کیا مہنگائی ختم ہو گئی ہے۔ کیا نوکریاں ملنے لگی ہیں۔ کیا امن و امان کا لا اینڈ آرڈر کا ماحول پیدا ہو گیا ہے؟۔ قارئین کرام کو روزانہ ہزاروں لاکھوں الفاظ ہضم کرنے پڑتے ہیں۔ بعض لفظ نہایت کڑوے، زہریلے اور جان لیوا ہوتے ہیں بعض تلخ ترش ہونے کے علاوہ چاشنی اور مٹھاس سے لبریز بھی ہوتے ہیں۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ایک محتاط اندازے کے مطابق ایک منٹ میں ایک ارب لفظ استعمال ہوتے ہیں۔ قارئین کرام کو صدر، وزیراعظم، وزراء پارلیمانی سیکرٹریوں، مختلف محکموں کے سربراہوں چھوٹے بڑے سیاسی رہنماؤں، ورکروں، سماجی تنظیموں اور دانشوروں کے بیانات پڑھنے پڑتے ہیں ان بیانات کی وجہ سے بعض اوقات جائز خبروں کو جگہ نہیں ملتی۔ خبر کیا ہوتی ہے؟ اور کون سی خبر اہم ہے۔ قارئین کرام کسے پڑھنا چاہتے ہیں اس کا سروے، اندازہ اعلیٰ سطح پر نہیں لگایا جاتا بس بیانات ہی بیانات ہماری صحافت کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اگرچہ یہ بیانات ہماری قومی صحافت کو ورثہ میں ملے ہیں شروع سے لیکر آج تک ہماری صحافت ان لیڈروں کے بیانات اور ان کے خلاف بیانات کو شائع کرتی رہی ہے ہماری صحافت کا وہ دور تحریک آزادی اور قیام پاکستان کی طرف گامزن ہونے کا تھا اس وقت ہمارے تقاضے یہی تھے کہ ایک بامقصد تحریک سے وابستگی کیلئے ذہنوں کو تیار کیا جائے روحانی اور جذباتی فضا پیدا کی جائے لیکن الحمدللہ ہم آزاد ہو چکے ہیں پاکستان بن چکا ہے۔ پچاس سال کا طویل عرصہ ہماری آزادی کی بقا کا گزر چکا ہے۔ آئندہ کی کامرانیوں کے لئے ۲۰۱۰ء جیسے پروگرام بن رہے ہیں کہ یہ ممکن نہیں کہ ہماری آئندہ ترجیحات اور مقاصد کے تعین میں یہ بھی شامل ہو کہ ہم نے لیڈروں کے بیانات کو کم شائع کرنا ہے اور خبروں کیلئے زیادہ صفحات کو مختص کرنا ہے تاکہ قارئین کرام کو باتوں کی جگالی سے بچایا جائے۔ بیانات کی چھیڑ چھاڑ سے تنقید اور تردید کے ذہنی عذاب سے دور رکھا جائے۔ بعض حضرات کا شاید خیال ہو کہ سیاست گری کیلئے لیڈروں کے بیانات جمہوری ذہن کی آبیاری کرتے ہیں۔ شعور اور پختگی کو جنم دیتے ہیں۔ سیاست کے اتار چڑھاؤ سے آگاہ کرتے ہیں۔ یہی بیانات بحث و تمحیص کے ماحول کو تخلیق کرتے ہیں۔ بالکل صحیح تجزیہ ہے۔ کیا واقعی ان بیانات نے قوم کے شعور کو سمت دی ہے؟ سنجیدہ بحث و تمحیص کی روایت ڈالی ہے۔ اگر ایسا نہیں تو پھر قارئین کرام کو ہمیں فیصلہ کرنیکا حق دینا ہوگا۔

کیا قارئین کرام لیڈروں کے بیانات پڑھنا چاہتے ہیں یا نہریں، اداریہ، فیچر، کالم اور سنجیدہ مضامین اخبار میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ APNS اور انسٹیٹیوٹ آف پاکستان پریس کو اس سطح کی بحث کو رواج دینا چاہئے۔ وقارئین کرام کیا چاہتے ہیں؟ وہ بیانات جو ہاضمہ خراب کرتے ہیں یا وہ خبریں جو معلومات، تعلیم اور تفریح کے ساتھ ساتھ ایڈورٹائزنگ کی سہولت بھی فراہم کرتی ہیں۔ آیئے ہم مل کر آج دراحساس پہ دستک دیتے ہیں۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

کیا ایسا ہو سکتا ہے

ملتان یونیورسٹی، پنجاب یونیورسٹی کی دختر نیک اختر ہے اسی طرح پنجاب یونیورسٹی کی دوسری بیٹیوں میں سے بہاولپور، بلوچستان، کراچی، اسلام آباد، فیصل آباد، لشمیر، پشاور، راولپنڈی کی یونیورسٹیاں شامل ہیں۔ ماں کا مقام مسلم ہے ماں کی پیدائش ۱۲ اکتوبر ۱۸۸۲ء میں ہوئی۔ اس طرح ۱۱۵ سالہ یہ بزرگ خاتون اپنے علم و دانش اور تجربات کی بناء پر ایک ایسی مادر علمی ہے جس کے اثرات ہر مقام، ہر جگہ اور ہر فرد اور ہر ادارہ میں موجود ہیں۔ جامعہ پنجاب نے علم و عرفان کی ایک ایسی شمع روشن کی جس کی کئی قندیلیں تمام تر حوادث کے باوجود فروزاں ہیں۔ جامعہ پنجاب کے فرزندوں کی تعداد کروڑوں تک پہنچتی ہے آج بھی بی اے، بی ایس سی کے امیدواروں کی تعداد ۶۰، ۷۰ ہزار کے لگ بھگ ہوتی ہے۔ ہزاروں کی تعداد طلباز یر تعلیم ہیں اور ان گنت شعبے تدریس میں مصروف ہیں۔ جامعہ اولڈ کیمپس سے نکل نیو کیمپس میں منتقل ہو چکی ہے۔ اس کے انتظامی دفاتر بھی نیو کیمپس میں پہنچ چکے ہیں اور مینٹل کالج اور چند دیگر تدریسی شعبوں کے علاوہ اب سب کچھ نیو کیمپس میں ہے۔ کنٹرولر امتحانات کا عملہ اور رجسٹرار کا دفتر محض قبضہ قائم رکھنے کے لئے اولڈ کیمپس مین موجود ہے۔ تاکہ نواب بہاولپور کی یہ عطیہ جو ۱۸۷۸ء کے عہد کی یاد تازہ کرتا ہے اس پر کوئی اور قبضہ نہ کرلے یا کمرشل دکانیں نہ بن جائیں۔ جامعہ پنجاب جب قیام ہوئی تو اس کے قیام پر ایک جشن منایا گیا ۱۹۴۷ء میں یہاں سے چند پروفیسر بھارت چلے گئے تو ہمارے چند لوگوں نے دکھ کا اظہار کیا کہ ہائے پروفیسر بھارت چلے گئے اور یونیورسٹی خالی ہو گئی۔ وہ یہ بھول گئے کہ اب پاکستان بن گیا ہے ہم اپنے معمولات میں غیروں کا عمل پرداشت نہیں کرتے۔ آج جامعہ پنجاب نے طلبا اور اساتذہ کے وقار سے ترقی کی طرف گامزن ہے۔ لیکن اسے اپنی شناخت کا سفر طے کرنا ہے۔ ہر دور اور ہر ادارے کے اپنے Court of Arms ہوتے ہیں اداروں کے اپنے Pattern ہوتے ہیں۔ جامعہ پنجاب کی شناخت کے کیا معیار ہیں جامعہ کا مونوگرام ہماری توجہ چاہتا ہے اصلاح چاہتا ہے اور پنجاب میں رہنے کے حوالے سے اپنی شناخت مانگتا ہے۔ جامعہ پنجاب کا پہلا مونوگرام جو عہد انگلینڈ کی برکات کو ظاہر کرتا تھا جو درج ذیل الفاظ پر مشتمل تھا۔ Crescat-e-Rlurils جسے مولانا ظفر علی خاں کے بھائی اور نامور دانشور

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

پروفیسر حمید احمد خاں عہد میں بدلا گیا اور اس کی جگہ جس طغریٰ کو شامل کیا گیا۔ واللہ المشرق والمغرب مونوگرام میں سورج اور اس کے نیچے زمین دکھائی گئی ہے اس مونوگرام کو دیکھ کر ذہن میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا سورج صرف پنجاب میں ہوتا ہے اور زمین بھی موجود ہے حالانکہ دنیا میں ہر جگہ سورج بھی ہے اور زمین بھی موجود ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا نظام مشرق و مغرب کے علاوہ پوری حیات و کائنات پر محیط بلکہ بسیط ہے۔ اس لئے جامعہ پنجاب کا مونو گرام پنجاب کے علمی، ثقافتی پس منظر اور تشخص کو نہیں ابھارتا اور کہیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ یونیورسٹی پنجاب میں ہے۔ اسے پنجاب کی نمائندگی کے لئے پورے پنجاب کے علمی، تہذیبی، روحانی اور ثقافتی اثرات اور نفوذ کا اظہار کرنا چاہئے۔ اس سے تو بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان ہزار درجہ بہتر ہے کہ اس کے مونوگرام میں روحانی تشخص یعنی گنبد کا عکس موجود ہے کپاس کا پھول اور تسخیر کائنات کا نسخہ موجود ہے کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم اپنی ۱۱۵ سالہ قدیمی درس گاہ کو ماضی کی طرف جانے سے روکیں اور اسے اکیسویں صدی کی طرف لے جائیں جس کی طرف پوری دنیا کی نظریں لگی ہیں۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

مزارِ اقبال

۹ نومبر کی صبح ہر سال ننھے منے شاہینوں کے قافلے ہاتھ میں پھول لئے مزار اقبال کی طرف رواں دواں نظر تے ہیں۔ درس گاہوں کے سربراہ اپنے اپنے اداروں کی طرف سے مزار اقبال پر پھولوں کی چادریں چڑھاتے ہیں۔ مرکزی اور صوبائی حکام، گورنر پنجاب، وزیرِ اعلیٰ پنجاب اور ان کے وزیر بھی صبح ساڑھے آٹھ بجے مزار اقبال پر حاضری دیتے ہیں۔ ۹ نومبر کی صبح مزار اقبال پھولوں سے اور پھول لانے والوں سے بھر جاتا ہے۔ مزار اقبال پر کارڈ کی تبدیلی اور چاق و چوبند فوجی دستے بڑے طریقے اور سلیقے سے پھولوں کی چادریں چڑھانے کی رسم ادا کرتے ہیں۔ ۹ نومبر کو سارے رستے مزار اقبال کی طرف جاتے دکھائی دیتے ہیں۔ اپنی وابستگی اور روحانی لگاؤ کا اظہار کرتے ہیں۔ اس تشخص اور اس شناخت کیبازیابی کے لئے کوشاں نظر آتے ہیں۔ جو اس مزار کے اردگرد موجود ہے۔ ایک طرف شاہی قلعہ جو مسلمانوں کی عسکری فتوحات اور ناقابل تسخیر جذبوں کی عکاسی کرتا ہے دوسری طرف بادشاہی مسجد جو مسلمانوں کے سوز دل اور حسن و جمال کی آئینہ دار ہے ان مقامات کے سامنے مینار پاکستان کا عزم جو رفعتوں اور بلندیوں کی طرف آگے بڑھنے اور نظریۂ پاکستان کی وسعتوں کا علمبردار موجود ہے۔ اس سارے ماحول میں عروس البلاد لاہور کا وہ عکس بھی دکھائی دیتا ہے جس میں دریائے راوی کی لہریں موجزن ہیں۔ اور یہ لہریں لاہور رویوں کی امنگوں کی جھلک دکھائی ہیں۔ مزار اقبال کے اردگرد وہ شہر وہ لوگ اور وہ کوچہ و بازار دکھائی دیتے ہیں جنہوں نے صوفیائے کرام کے روحانی قافلوں کا بڑاؤ دیکھا ہے۔ حضرت داتا گنج بخشؒ حضرت میاں میرؒ، حضرت شاہ جمالؒ، حضرت مادھو لال حسینؒ کے ایمان افراز مقابر دکھائی دیتے ہیں۔ ان مراکز سے جو یقین آفرین پہلو ملتا ہے وہ یہ ہے۔

حاصل کسی کامل سے یہ پوشیدہ ہنر کر
کہتے ہیں کہ شیشے کو بنا سکتے ہیں خارا

ان ہستیوں کے مراکز سے محبت، خدمت، رحم، احسان، ذکر و عبادت کا سبق ملتا ہے۔ انسان سے انسان کی محبت کا فلسفہ سمجھ میں آتا ہے۔ سوز و مستی جذب و شوق کی منزلیں، طے ہوتی نظر آتی ہے۔ کائنات کے بکھیڑوں میں الجھے ہوئے لوگوں کو سکھ کا درس ملتا ہے۔ عصر

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

حاضر کی بوتلوں میں بھرے ہوئے زہر کا تریاق ملتا ہے۔ان مراکز سے یہ نقطہ بھی کھلتا ہے کہ عظمت خلق خدا کی بھلائی میں ہے۔ تکریم ذات روحانی مدارج میں آگے بڑھنے سے ہے۔

اسی کش مکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں
کبھی پیچ و تاب رازں کبھی موڑ و ساز رومی

مزار اقبال صرف ایک دیدہ ور کا مرکز نہیں نہ ہی شاعر رنگین نو کا مقبرہ ہے۔بلکہ ایسے مرد قلندر کی درس گاہ ہے جہاں سے عشق و مستی کے قافلے جنش و تحرک کا پیغام لئے نئی منزلوں کی طرف جاتے دکھائی دیتے ہیں۔ کہ ابھی سفر باقی ہے۔ ابھی ان گنت مقامات ہمارے نقوش آگہی کے منتظر ہیں۔

بھٹکے ہوئے آہو کو پھر موئے حرم لے چل
اس شہر کے خوگر کو پھر وسعت صحرا دے
اس دور کی ظلمت میں ہر قلب پریشان کو
وہ داغ محبت دے جو چاند کو شرما دے
بے لوث محبت ہو بیباک صداقت ہو
سینوں میں اجالا کر دل صورت مینا دے
احساس عنایت کر آثار مصیبت کا
امروز کی شورش میں اندیشہ فردا دے

مرزا اقبال ہر سال ہمیں احساس دلاتا ہے۔ ہمیں اپنی اقدار کی پہچان کرنی چاہئے۔ اپنے بچوں کو اپنی ماضی اور اپنے ورثے سے آگاہ کرنا چاہئے۔ ہمیں اجنبی تہذیب کی جین ہنٹ، بے ہنگم موسیقی اور بے مقصد زندگی کی بجائے اپنے بچوں کو ''آداب فرزندی'' سکھانے چاہئیں۔ مغرب کے سادہ پرستانہ ہٹ تراشنے کی بجائے اپنی شناخت اور پہچان کے معیار بنانے چاہئیں۔

لاقانونیت اور تشدد کی چنگاریوں کو بڑھنے سے روکتا ہے۔ انتشار، اور تفرقہ کی سیاست کو دفن کرنا ہے۔ مرکز کو مضبوط اور فرد کی آزادی کا تحفظ کرنا ہے۔ ہمیں محبتوں کا پیغام دینا ہو گا۔ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر۔ ایک دوسرے کا سہارا بن کر متصادم اور متحرب قوتوں کا مقابلہ کرنا ہے۔

مرزا اقبال ہر سال ہمیں افکار اقبال سے آگاہ کرنا ہے۔ کچھ لوگ صرف پھول چڑھانے

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

کو اپنی فضیلت سمجھتے ہیں۔ بعض ٹیلی ویژن کے کیمرہ کا انتظار کرتے ہیں کسی کو پریس فوٹو گرافر کے تاخیر سے آنے پر تشویش ہوتی ہے۔ کوئی مزار اقبال کی مناسب "کوریج" کے لئے پریشان ہوتا ہے۔ کچھ لوگ موقع پر "پولورائیڈ" تصاویر بنا کر اپنے کاروبار کو فروغ دیتے ہیں۔ غرضیکہ ۹ نوبر مزار اقبال ہر رنگ اور ہر ڈھنگ سے نظر آتا ہے۔ کچھ لوگ ایسے بھی اس دن دیکھے جاتے ہیں جو الگ تھلگ ہاتھ میں بانگ درا لئے مزار کے ایک کونے میں بیٹھے کلام اقبال پڑھ رہے ہوتے ہیں۔ کیا سوچتے ہیں؟ اور اقبال سے کیا پوچھتے ہیں کاش کوئی صحافی کوئی ٹیلی ویژن کا نمائندہ اس درویشیوں سے بھی انٹرویو کرے جو بتا رہے ہوتے ہیں کہ اقبال نے پاکستان کی ترقی کی تمام تر راہیں سمجھائی تھیں۔ ۱۹۳۰ء کے خطبہ کے بعد صرف ۱۷ سالوں میں پاکستان لے کر دیا۔ مرکز کو مضبوط کرنے و وحدت اسلامی پیدا کرنے کا درس دیا۔ نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر تک۔ مسلمانوں کی ایک زنجیر مربوط کرنے کی کوشش کی۔ پاکستان کو عالم اسلام کا قلعہ، مرکز بنانے کے عزم کا اظہار کیا ہے۔ کیا ہم اس درس سے اس مقصد سے آگاہ ہونے کے لئے ۹ نومبر کو مزار اقبال پر حاضری دے رہے ہیں۔ اگر دے رہے ہیں تو ہماری سوچ کا محور، ہماری امنگوں کا افق اور مقاصد کا تعین۔

ہر لحظہ نیا طور، نئی برق تجلی
اللہ کرے مرحلہ شوق نہ ہو طے

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

بہاولپور

بہاولپور پنجاب کا اہم ترین شہر، پاکستان کا دل، بادشاہوں کا مسکن پر سکون، امن وامان کا گھر، صاف ستھرا، مختصر آبادی، جان پہچان کی آسانی، ملنے ملانے کا وضعدار شہر ہے۔

بہاولپور کو قدرت کی طرف سے تمام روحانی اور مادری آسائشات میسر ہیں۔ جدید سہولتوں میں شاندار مواصلاتی رابطے، ریل، روڈ، جہاز کی سہولتیں، ترقی کے لئے جدید تعلیم کے مراکز موجود ہیں۔

اسلامیہ یونیورسٹی جدید قدیم علوم و فنون کا اہم مرکز ہے اولڈ کیمپس شہر کے وسط میں موجود ہے جسے خوبصورت پھولوں اور پھلوں والے درختوں سے سنوارا گیا ہے۔

آم کے قدیم پیڑ اس شہر کے خلوص مٹھاس اور مہمان نوازی کی روایت کو یاد دلاتے ہیں۔

شہر میں نفسا نفسی نظر نہیں آتی۔ سکون سے محروم زندگی کا کوئی تصور نہیں، آرام، اطمینان اور ٹھہراؤ اس شہر کا مزاج ہے۔

بہاولپور کے شہری وضعداریوں اور ڈیرہ داریوں کی روایت کو آج بھی سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ یہاں کی زبان میں بلا کی موسیقی، کشش اور مٹھاس ہے، دھیرے دھیرے باتیں کرنا، ٹھہر ٹھہر کر جملے ادا کرنا بہاولپور کی گھٹی میں پڑا ہے۔

اس کے کوچہ وبازار ابھی قدامتوں کی حفاظت کر رہے ہیں۔ فرید گیٹ آج بھی ثقافتی، تجارتی مرکز ہے یہاں نئی اشیاء سے تعارف ہی نہیں ہوتا بلکہ نئے لوگوں سے ملنے اور ان سے باتیں سننے کا موقع بھی ملتا ہے۔

بہاولپور عباسی خاندان سے محبت، عقیدت، عزت کرنے والوں کا شہر ہے۔ اس شہر میں جدید و قدیم عمارات ایک ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔

بہاولپور وکٹوریہ ہسپتال ۱۹۰۶ء کی تعمیر کو اجاگر کرتا ہے یہاں کے محل و دربار پرانی طرز تعمیر کی عکاسی کرتے ہیں۔

فرید گیٹ کے اندرونی سڑک اور شہر کے وسط میں واقع عظیم الشان مسجد عجوبہ بہاولپور ہے۔ مسجد کے در و دیوار مسلم تہذیب کی وسعتوں کو ظاہر کرتے ہیں سنگِ و خشت مسلمانوں کے سوز جگر اور ذہن رسا کی دعوت دیتے ہیں۔ کشادہ صحن، وضو کی جگہیں تطہیر فکر و نظر کا

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

سامان بہم بہچاتے ہیں۔

مسجد کی کفایت کے لئے تقیر یبا تین سو کے قریب دکانیں تعمیر ہیں اور دکانوں کے اوپر مسجد کی تعمیر ہے جہاں آج کل مرمت کا کام زور شور سے جاری ہے۔ تزئین او آرائش کی شدید ضرورت ہے۔ مسجد شہر کے وسط میں ہے جمعہ اور عیدین کے اجتماعات روح پرور ہوتے ہیں۔

مسجد کے اندرونی حصے، گنبد اور محرابیں نواب بہاولپور کے ذوق تعمیر کے حسن کو ظاہر کرتی ہیں۔ نواب بہاول خان اور صادق خاں خامس کا عہد تعمیرات اور جدید عمارات کے نقش و نگار کہلاتا ہے۔

قلعہ وڑاور کی مسجد نواب بہاولپور اور اس خطے کے عوام کو سوچ کو ابھارتی ہے۔

بہاولپور ابلاغ کا بھی مرکز ہے یہاں سے کئی اخبارات، کئی مجلّے اور کئی رسالے شائع ہوتے رہے ہیں۔

یہاں کا پریس کلب بڑا فعال رہا ہے اب بھی شاید ہو گا مگر اس کا اظہار کہیں نہیں ہوا اس کی وجہ قیادت کا فقدان ہے یا صحافتی برادری کی تنظیمی بحران سے دوچار ہے۔

بہر حال اعوام کی خواہش ہے کہ بہاولپور پریس کلب فعال ''محرک نظر آئے تاکہ یہاں کے صحافی جو بلند مرتبہ اور مقام رکھتے ہیں وہ بھی وزیر اعظم پاکستان، صدر مملکت اور دیگر پارلیمانی گردیوں کی کورتج کے لئے بیرون ملک نمائندگی کا دورہ کر سکیں اور یہ شرف انہیں ملنا چاہئے۔

بہاولپور کی سنٹرل لائبریری کا بڑا شہر ہے پورے ڈویژن کی بڑی لائبریری ہے اس میں کئی نادر نسخے موجود ہیں۔

کاش! جدید نسخے بھی یہاں وافر مقدار میں موجود ہونے چاہئیں۔ سنٹرل لائبریری کو ہر اعتبار سے جدید وسائل و جرائد سے آراستہ کرنا اور قدیم اور جدید نسخوں کی فراہمی حکومت اور بہاولپور کے دانشوروں کی ذمہ داری ہے۔

کئی خانواروں اور خاندانوں کے پاس قدیمی دستاویزی نسخہ جات موجود ہیں ان علمی تبرکات اور ان گراں قدر مسودات کو لائبریری میں ان خاندانوں کے نام کے گوشے بنا کر محفوظ رکھا جا سکتا ہے یہ قومی ملکیت ہیں اور انہیں حاصل کرنے اور استفادہ کرنے کا حق قوم کے پاس ہونا چاہئے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

اہالیان بہاولپور اپنی خوبصورت تحریروں سے جس طرح علم وادب کی خدمت کر رہے ہیں اس حوالہ سے ایسی کتابیں سامنے آنی چاہئیں تاکہ اس خطہ کا ادبی شعور زیادہ مربوط طریقے سے اجاگر ہو سکے۔

چولستان کے خطے جس تیزی سے آباد ہو رہے ہیں اور وہاں آبادی کی بود وباش بڑھ رہی ہے یقیناً وطن عزیز کی قومی آمدنی میں اضافہ وو سائل میں فروانی ہو گی۔

بہاولپور تعلیمی اعتبار سے آگے بڑھ رہا ہے میڈیکل کالج ریڈیوں پاکستان بہاولپور، یونیورسٹی، صادق پبلک سکول، کالج اور دیگر تعلیمی وابلاغی ادارے اس خطے کی آواز ہیں اور ترقی کا زینہ بھی ہیں۔

بہاولپور تمام ترقی کے باوجود ابھی پرانے خلوص کی زندہ تصویر بھی ہے۔ ابھی عام دیہاتی اور شہری افراد مادیت کی بڑھتی ہوئی آگ سے دور ہیں۔

بہاولپور کے لوگ مسعود شہاب کے علمی کارناموں کو فراموش نہیں کر سکتے جنہوں نے اوچ شریف اور بہاولپور پر گراں قدر تحقیقی کام کیا ہے۔

ایک نیا اضافہ مسعود احمد شاہ ڈائریکٹر جنرل چولستان اتھارٹی کا ہے جنہوں نے سیرت النبیؐ پر بے مثال کام کیا ہے۔ علمی، ادبی اور سماجی جدید بہاولپور کی تعمیر و تکمیل میں اپنا بھرپور کردار ادا کر رہی ہیں اور وہ دن دور نہیں کہ بہاولپور ہماری ترقی کا ایک سمبلی ہو گا۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

علاج بالغذا

تیر ہدف، فوری اثر اور معیاری دوائی کی تلاش میں نکلنا ایسے ہے جیسے ''انسانم آرزو است'' کرنے والے روشن سویرے میں چراغ لیکر نکلتے ہیں کہ خدا کرے کوئی ''بھلا مانس'' مل جائے کوئی اچھی اقدار کا حاصل انسان مل جائے۔ جیسے اچھے انسان ناپید ہوتے جارہے ہیں۔ جیسے جذبوں اور خلوص میں ملاوٹ ہو رہی ہے۔ ایسے ہی رشتے کمزور پڑتے جارہے ہیں۔ بلکہ صوفیائے کرام کی زبان میں جب غذا ٹھیک نہ ہو تو نگاہ کیسے ٹھیک ہو سکتی ہے۔ کچھ ایسی کیفیت دوائیوں کی ہو گئی ہے ان میں ملاوٹ اس درجہ بڑھ گئی ہیکہ اصل دوائی مل جائے تو مریض کو اپنا مرض بھول جاتا ہے اور شکرانے کے نوافل ادا کرتا ہے کہ اسے اچھی اور اصل دوائی نصیب ہو گئی ہے۔ مجھ ڈرگ سٹور پر وہ نوجوان یاد آرہا ہے جو میڈیکل سٹور کے مالک سے کہہ رہا تھا کہ جناب مہربانی فرمائیں مجھے نمبر ون نہیں نمبر ٹو دوائی چاہئے۔ دکاندار نے حیرت سے پوچھا ''کیوں'' اور اس نوجوان نے بڑی معصومیت سے کہا ''اس لئے نمبر ٹو کی جگہ نمبر تھری بک رہی ہے'' اور نمبر تھری دوائی میں کئی تاثیر نہیں بلکہ زندگی کو روگ لگانے اور بھاری پیسے دے کر بیماری خریدنے کا نام ہے۔ ملاوٹ ہماری زندگی کا حصہ بن گئی ہے مارکیٹ میں کوئی چیز اٹھا کر دیکھیں آپ کو اس کی کریڈنگ نظر آئے گی۔ قیمتیں ایک جیسی اور اشیاء میں زمین آسمان کا فرق سپر پیٹرول کی جگہ ڈیزل ملا پٹرول میں انتہائی گھٹیا کار رفتہ آئل ملا ہوتا ہے کہیں سپر کے ساتھ مٹی کا تیل سج سے بدبو الگ اور گاڑی کا ستیاناس الگ مگر آپ سے قیمت سپر کی وصولی کی جائے گی اور ایک لٹر صرف کہنے کی حد تک ایک لیٹر ہوتا ہے جھٹکا صرف سکھوں کے نظام معاشرے میں نہیں ہوتا بلکہ اس کا عملی مظاہر پیٹرول پمپوں پر بھی ہوتا ہے دیکھنے والا کمپیوٹر کی تیز رفتاری اور پیٹرول پمپ پر کھڑے ہوئے ملازم کی برق رفتاری کے جو مناظر دیکھتا ہے وہ اسے سارے رستے پریشان رکھتے ہیں اور اس پریشانی میں ''ڈرائیونگ'' وہاں جان بن جاتی ہے استعمال کی عام اشیاء میں ملاوٹ کھاد، بیج، مرچ مصالحہ غرضیکہ ہر شے ملاوٹ کی زد میں ہے۔ انسان کس طرح زندہ ہے یہ دیکھ کر خدائے بزرگ و برتر کی ''بڑائی'' یاد آجاتی ہے جس نے ''موت کا ایک دن معین ہے'' کا تعین فرما کر انسان کو زندہ رکھا ہے ورنہ معاشرہ نے انسان کو مار دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ان حالات میں

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

مجھے دنیاپور کے عظیم حکیم محمد شریف موحوم و مغفور یاد آتے ہیں جو ہر وقت اپنی جیب میں لہسن کی ڈلیاں اور اجوائن کی پھلیاں رکھتے تھے ان کا خیال تھا لہسن دل کے عوارض کو دور کرتا ہے زندگی بڑھانے میں مدد دیتا ہے اور انسان کو تمام تر معاشی، معاشرتی جھٹکوں اور ملاوٹ کی سختیوں سے بچاتا ہے اور اجوائن معدہ کی تطہیر کرتی ہے اور غذا کو خواہ جیسی بھی ہو اس کے مہلک اثرات سے بچاتی ہے۔

حکیم محمد شریف جناب صابر ملتانیؒ کے تلمذ خاص تھے اور انہی کے مشن علاج بالغذا کو آگے بڑھا رہے تھے لیکن ایک حادثے کی نظر ہو گئے۔ حکیم محمد شریف دنیا میں نہیں رہے مگر ان کا علاج بالغذاء آج بھی مریضوں اور عام انسانوں کیلئے مفید نظر آتا ہے۔ جب بھوک لگے دوائی نہیں غذا کھائیں۔ رمضان المبارک کے روزے اسی بھوک کو بڑھانے اور غذا کے استعمال کو لانے کا مؤثر ذریعہ ہیں۔ بھوک ے بعد غذا استعمال کرنا صحت یابی کی علامت ہے۔ لہذا جتنی سادہ ہو گی صحت اتنی زیادہ مضبوط ہو گی۔ غذاؤں میں پھل، سبزیاں، دالیں جو عموماً مالوٹ سے پاک ہوتی ہیں انسان کو زندہ رکھتی ہیں۔

غذا کے استعمال میں تین باتیں حکیم صاحب زور دے کر کہا کرتے تھے زیادہ بھوک ہو تو غذا کھائیں ورنہ تو ند باہر نکل آئے گی۔ دوسری بات دل جس چیز کو چاہے وہ کھائیں غذا حسب ذائقہ اور کیفیت موسم کے مطابق ہو تو غذا بہتر ہے وگرنہ غذا میں معقول اور قیمتی اجزاء صحت کو بحال نہیں کر سکتے۔

تیسری بات غذا اس وقت تک کھاتے رہیں جب تک بھوک ایک حصہ باقی ہو تو غذا کو چھوڑ دیں کہیں ایسا نہ ہو کہ سارے معدے پر غذا حاوی ہو جائے اور معدہ کام کرنا چھوڑ دے ایسی صورت میں بد ہضمی، ہیضہ اور اسہال اور قے کا پیدا ہو جانا قدرتی امر ہے۔

تھوڑا کھانا پیٹ بھر کے کھانا دونوں جسم و جاں کیلئے عذاب ہیں۔ اس لئے ان میں توازن پیدا کرنا ایسے ہی جیسے کسی مملکت مین توازن سے حکومت مستحکم ہوتی ہے اور اگر ریاست میں قدرتی توازن مفقود ہو جائے تو مستحکم سے مستحکم حکومت کے گرنے کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ انسان کی اپنی ذات بھی ایک ریاست کی مانند ہے جسے توازن درکار ہے۔ حکیم محمد شریف مرحوم کبھی کبھی فاقہ کو بھی بیان کرتے تھے ان کا خیال تھا فاقہ بھی صحت کیلئے ضروری ہے ہر وقت کھاتے رہنے سے معدہ تنگ آ جاتا ہے جیسے مزدور اگر آرام نہ کرے تو بیمار پڑ

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

جاتا ہے اس لئے فاقہ صحت، قوت اور جوانی کو قائم رکھتا ہے۔

''رنگ لائے گی یہ فاقہ مستی ایک دن'' مرزا غالب ایسے نہیں کہا کرتے تھے ان کی فاقہ مستی غربت کی لذت سے آشنا تھی اور حکیم محمد شریف کی فاقہ مستی صحت سے عبارت ہے۔ حکیم صاحب یہ بھی کہتے تھے جو غذا ہم کھاتے ہیں وہ غذا بارہ گھنٹوں میں ہضم ہوتی ہے تین گھنٹے معدہ میں رہتی ہے۔ چار گھنٹے چھوٹی آنتوں میں اور پانچ گھنٹے بڑی آنتوں میں گزارتی ہے۔ جب تک پوری غذا ہضم نہ ہو جائے اس وقت تک اور غذا ہر گز نہیں کھانی چاہئے اگر آپ کھا لیں گے تو خمیرہ تعفن، تیزابیت کا شکار ہو جائیں گے اور پھر ملاوٹ والی دوائیاں، نمبر دو سے لے کر نمبر تین کے نسخے آپ کی صحت کو بحال نہیں کر سکیں گے اور پھر آپ کو میڈیکل سٹور سے اسی نوجوان کی طرح کہنا پڑے گا کہ مجھے نمبر ٹو دوائی چاہئے۔ اور حکیم محمد شریف کا علاج بالغذا بھی مفید نہیں رہے گا کیونکہ اب اس کی مزید تشریح اور اصلاح کیلئے حکیم صاحب اس دنیا میں نہیں رہے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

جُور کے تو کوہ گراں تھے ہم

آج سے چند روز پہلے نامور صحافی اے پی پی کے آفیسر جناب احمد بشیر کے انتقال کی خبر اسلام آباد سے ملی۔ پھر آج دوسری خبر اور وہ بھی اسلام آباد کے حوالہ سے ممتاز صحافی دانشور غنی اعرابی کے اس جہان فانی سے رخصت ہونے کی ملی۔ ابھی اس سانحہ سے سنبھلے نہ تھے کہ کراچی سے طنز و مزاح کے عظیم شاعر دلاور فکار کے انتقال کی خبر ملی اور خبر کے ساتھ ان کے اپنی موت کی گواہی کے اشعار بھی پڑھنے کو ملے۔ مرنے والے کس قدر موت سے آشنا ہوتے ہیں۔

خبر یہ ہے کے بدایوں سے آیا ہے راوی
کہ قبر میں بصد آرام سو گیا ہوں میں
خبر نہیں کہ میری موت کب ہوئی لیکن
سنی تو میں نے بھی ہے فوت ہو گیا ہوں میں

دلاور فکار بر صغیر کے نامور شاعر تھے جن کے کلام اور بیاں کا چرچا مشاعروں میں بھر پور انداز سے ہوتا تھا۔ وہ بدایوں میں پیدا ہوئے تھے اور پھر قیام پاکستان کے بعد بھارت سے کراچی آگئے تھے اور پھر عمر بھر کراچی میں رہے اور شاعروں اور مداحوں کے درمیان طنز و مزاح کے پھول بکھیرتے ہوئے آج اس جہان رنگ و بو سے رخصت ہو گئے ہیں۔ یکے بعد دیگرے علم و دانش، فکر و نظر کی یہ شخصیت ہم سے جدا ہو گئیں ایسے محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا عہد اہل کمال سے جدا ہونے کا عہد ہے۔ ایک سے بڑھ کر ایک سخن کا آفتاب غروب ہونے کو ہے اور ہم ان ہستیوں کے ساتھ سے ہر بار دوچار ہو رہے ہیں۔ موت کا ایک دن متعین ہے۔ کسی فرد واحد کو اس سے مفر ممکن نہیں لیکن بے رحم مسیحاؤں کے ہاتھوں بے وقت مرنے کا صدمہ ہر وقت لگا رہتا ہے کہ نہ جانے یہ ہمارے مسیحا جو اپنی ذات کو اپنے علم اور تجربہ میں ارسطو خیال کرتے ہیں نہ جانے کب اپنی لاپروائی سے ہمیں وقت سے پہلے رخصت کر دیں اور موت کے گھاٹ اتار دیں۔ کتنے ادیب کتنے دانشوران مسیحاؤں کے ہاتھوں دم توڑ گئے ہیں۔ ان بد نصیب لمحوں میں ہمارا دوست اسد اللہ شیخ مرحوم کا بھی ذکر آتا ہے جب اسے ڈاکٹروں کی لاپروائی کا شکار ہونا پڑا وہ نوجون جو عمر بھر خلوص کی تپتی دھوپ

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

میں چلتا رہا کبھی طالب علموں کے غم میں کبھی ملتان شہر کی تمدنی سہولتوں کے فقدان میں کبھی کارپوریشن کے سرد ماحول میں جہاں فائلوں کو وقت کی بے رحم قوتیں اس قدر بے دردی سے دیمک کے حوالے کرتی ہیں کہ فائلیں بھی موت کی لذت سے دوچار ہوتی ہیں۔ ان فائلوں کے اوراق نہ صرف بوسیدہ ہو جاتے ہیں بلکہ جگہ جگہ سے اسقدر خستہ ہو جاتے ہیں کہ وہ تاریخ کی ایسی تحریریں بن جاتے ہیں کہ جسے جہاں سے بھی پڑھیں حوالہ نہیں ملتا۔ منظوری کی جگہ دیمک کے نقوش ملتے ہیں اور ایک اچھا خاصہ ریکارڈ ہماری لاپروائی کا منہ بولتا ثبوت بن جاتا ہے۔ موحوم اسد اللہ شیخ جن کی برسی جمعۃ الوداع کے روح پرور موقع پر ادا کی جا رہی ہے اس نوجوان کی علمی، سماجی، تہذیبی خدمات پر اہل فکر روشنی ڈالیں گے اور اس کے ادھورے مشن کو آگے بڑھانے کے عزم کا اظہار کریں گے۔ وہ شخص دن بھر ان بوسیدہ خستہ فائلوں کی تلاش اور ان پر عمل درآمد کے لئے کوشاں رہا۔ اسد اللہ شیخ میرا کلاس فیلو تھا۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ بوسن روڈ کالج میں داخلہ لیا۔ طالب علموں کی خدمت کے لئے ایک انجمن بھی بنائی جو سیکنڈ ہینڈ کتابوں کو اکٹھا کرتی اور مستحق طلباء کو فراہم کرتی۔ نادار طالب علموں کیلئے وظائف کا خاموشی سے بندوبست کرتی اور اس طرح اسد اللہ شیخ طالب علموں کی ضرورتوں اور خدمتوں میں مصروف رہتا۔ پھر وہ دن بھی آیا وہ ملتان کارپوریشن کا ممبر منتخب ہو گیا۔ کارپوریشن کے اجلاسوں میں اس کی آواز گونجتی مسائل پر وہ خوب بولتے۔ جب مسائل حل نہ ہوتے بیقرار ہو کر دوستوں کی محفل کا رخ کرتے۔ حال دل سناتے۔ معاشرے کی تلخیاں گناتے۔ بیوروکریسی کے سرد رویہ کی شکایت کرتے۔ پھر ایسے گوشے ڈھونڈتے جہاں انہیں اہل علم کی ڈھارس ملتی کبھی وہ مولانا کوثر نیازی کے ڈیرے پر پہنچے۔ وہاں سے فکر کی نئی دنیا لے کر آئے۔ کبھی حضرت شورش کشمیری مرحوم سے اپنی ارادت کو مضبوط کرتے۔ کبھی جاوید ہاشمی کو اپنی بات سناتے کبھی فخر امام کے لئے دیدہ و دل فرش راہ ہوتے۔ کبھی جبار مفتی سے صحافت اور صحافیوں کے رویوں کا ذکر کرتے کہ ہماری صحافت اداروں کی مضبوطی کے لئے مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خاں اور حضرت حمید نظامی جیسی شخصیتوں کے نقش قدم پر کیوں نہیں چلتی۔ ان کی روایات کو آگے کیوں نہیں بڑھاتی۔ کیا ہم ان کے امین اور وارث نہیں۔ ہماری مسلم صحافت اس قدر کمزور اور بے بس کیوں ہے۔ جبار مفتی ان کو کیا جواب دیتے! پھر ان کا رخ ولی محمد واجد جیسے کہنہ مشق صحافی کے در دولت پر

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ہو تا ان سے باتیں کرتے اور پھر تعلیم کی دنیا میں اپنی عافیت تلاش کرتے۔ کبھی ملتان کے سر سید ثانی چودھری عبدالرحمٰن سے ملتے۔ کبھی علامہ شبیر بخاری سے رابطہ کرتے کبھی پروفیسر ڈاکٹر محمد نذیر رومانی سے گلہ کرتے کہ وہ ملتان یونیورسٹی کو کیسے چلا رہے ہیں۔ غرضیکہ ہر محفل اور ہر نشست میں حاضری دینے کے لئے بیتاب رہتے۔

مثل خورشید سحر فکر کی تابانی میں
شمع محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق

سب کا رفیق اسد اللہ شیخ ہم سے کئی سال ہوئے جدا ہو گیا ہے ایک دن ہمیں بھی خدا کے پاس جانا ہے لیکن دکھ اس بات کا ہوتا ہے کہ ایسے اچھے لوگ ہم سے اتنی جلدی کیسے جدا ہو جاتے ہیں۔ اس سے تو بہتر ہوتا کہ ہم ان سے نہ ملے ہوتے۔ آج ان کی جدائی کا صدمہ تو نہ اٹھاتے مگر ایک ڈھارس یہ بھی ہوتی ہے کہ اگر نہ ملتے تو آج اس کسک سے کیسے فیض یاب ہوتے جو ان کی جدائی سے ملی ہے۔ یہ درس کہاں سے لیتے کہ اپنے اپنے معاشرے کی اٹھان کیلئے ہمیں ہر لمحہ سرگرم عمل رہنا ہے۔ بے بس، مجبور لوگوں کو سہارا دینا ہے۔ غریب کی آواز اور مجبور کی آنکھ بننا ہے۔ ایوانوں میں بے بس طبقے کی نمائندگی کا فرض ادا کرنا ہے اگر ایسے کاموں میں موت آبھی جائے تو بعد خوشی قبول کرنی چاہئے۔ نفس مطمئنہ کی نوید جو ہمیں قرآنی تعلیم سے ملتی ہے تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی۔ یہ وہ متاع ہے جو عمر بھر کی ریاضت سے نصیب ہوتی ہے۔ اسد اللہ شیخ خوش نصیب ہے کہ وہ اس منزل کا مستحق ٹھہرا اور یہ ایوارڈ وہ اس جہان فانی سے لے کر گیا جس ایوارڈ پر وہ اطمینان سے یہ شعر پڑھا کرتے تھے اور اکثر اپنی گفتگو تقریر میں سنایا کرتے تھے۔

جور کے تو کوہ گراں تھے ہم جو چلے تو جاں سے گزر گئے
رہ یار ہم نے قدم قدم تجھے یاد گار بنا دیا

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ملتان کے محسن

ملتان کی وہ تاریخ جو کبھی لکھی نہیں گئی ملتان کے افراد کے دلوں میں زندہ ہیں مگر تاریخ کے اوراق سے اوجھل ہیں۔ زمانے کی تیز رفتاری اور گردش لیل و نہار نے ہمارے اہل قلم کو اتنا مصروف کر دیا ہے کہ فکر و خیال سے وہ افراد نظروں سے اوجھل ہو گئے ہیں جن کی بنیاد پر آج کا ملتان قائم ہے۔ اس سات دریاؤں کے شہر اور سات دروازوں اور النگ (Walled City) کی تاریخی اہمیت کے حامل خطہ کو تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ اس شہر نے ان گنت عہد دیکھے ہیں ان گنت صاحب فکر و نظر اہل سیاست اور اہل حرفہ کے وہ قبیلے دیکھے ہیں جنہوں نے اس شہر کو اپنے علم و ہنر سے صدیوں کیلئے محفوظ کر لیا۔ کبھی اس شہر سے ہیون تسانگ جیسے چینی سیاح گزرے یہ عہد تقریباً ۶۴۱ء کا تھا پھر ۸۸۲ء البلادری کا دورہ ہوا۔ ۹۱۶ء میں ابو زاہد ہوالمسعودی ۹۵۷ میں ملتان آئے ہیں۔ ۹۷۰ میں ابو ریحان البیرونی ۹۷۶ میں ابن ہیکل کی آمد ہوتی ہے۔ ۱۳۳۴ میں ابن بطوطہ کا اس شہر بے مثال سے گزر ہوتا ہے۔ قزوینی ۱۳۷۵ میں آیا تو اس نے اپنی کتاب اثار البلاد اخبار العباد میں ملتان کی عظمتوں کے گیت لکھے یہاں کے مزاروں اور ان مندروں مین سونے چاندی کے بتوں کا ذکر کیا جب محمد بن قاسم نے ملتان فتح کیا تو ملتان کا الگ ڈھنگ بدل گیا یہاں اسلامی تہذیب کے نقش و نگار ابھرے اور سفید پگڑی اس خطے کی پہچان بنی۔ پھر اس شہر میں اللہ والوں کے ڈیرے لگنے شروع ہوئے شاہ گردیز سے حضرت یوسف شاہ گردیز، ایران سے حضرت شاہ شمس سبزواری، مدینہ منورہ سے حضرت غوث بہاء الدین زکریا ملتانی، حضرت شاہ رکن عالم، حضرت موسیٰ پاک شہید، حافظ محمد جمال گردیزی، قریشی، گیلانی، مشہدی، بخاری یہاں آباد ہونے لگے۔ پھر افغانستان سے افغانوں کے قبائل یہاں آباد ہوئے جو آج سدوزنی، ابدالی، خاکوانی، خاکانی، ملزئی، علی زئی غرضیکہ ہر قبیلے کی الگ الگ پہچان ہوئی۔ قیام پاکستان کے بعد یہاں بھارت سے نقل مکانی اور ہجرت کر کے آنے والے مہاجرین بھائیوں نے اس شہر کو اپنے ہنر اور تجربہ سے مالا مال کیا اس شہر کی جدید خطوط پر تعمیر اور ترتیب کا مرحلہ مکمل کیا اور آج ملتان کی پہچان ان افراد کی بھرپور دلچسپی اور محبت سے ہے۔ ملتان خوش نصیب خطہ ہے جسے ہر عہد میں محبت کرنے والے افراد ملے ہیں۔ رواداری خلوص اور پیار کے پیکر ملے ہیں۔ انہی معدودے

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

چند افراد میں وہ عہد ساز لوگ بھی شامل ہیں جنہیں تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ جو جدید ملتان کے بانی ہیں۔

ان ہستیوں میں سر فہرست قبلہ مخدوم محمد سجاد حسین قریشی جنہوں نے ۱۹۲۲ سے ۱۹۹۸ء تک کے دور سے ملتان کی بھر پور خدمت کی ایک شخصیت پیر خورشید احمد قریشی کی تھی جسے لوگ بھولتے جارہے ہیں اپنے عہد کا ایک عظیم فرزند، علم و کمال کا یگانہ روزگار ایک منفرد نام کل محمد خاں ترین کا ہے جس نے ہینڈ لوم انڈسٹری کی ملتان میں بنیاد رکھی۔ ٹرانسپورٹ کی دنیا میں حاجی حمید الدین کا گوروی دیوان غلام عباس، پیر دوست علی قریشی، تعلیم کی دنیا میں چودھری عبدالرحمٰن، ہیڈ ماسٹر مسلم ہائی سکول ملتان، سید عنایت علی شاہ گردیزی پائلٹ سکول ملتان مسرت مرزا بیک ملت ہائی سکول ملتان۔

ملتان کی روحانی تربیت میں حضرت مولانا احمد سعید کاظمی کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا ملتان کے بے تاج بادشاہ مولانا حامد علی خاںؒ کو تاریخ فراموش نہیں کر سکتی۔ حضرت چادر والی سرکار کا فیض جاری ہے حضرت شوکت حسین گیلانی کی روحانی کمالات آج بھی ملتان میں موجود ہیں۔

اس شہر کی صحافتی دنیا میں جنہوں نے عہد ساز کردار ادا کیا ان میں ریاض نور اور اشعاع اور الشمس کے جریدوں کے علاوہ افراد میں شمس ملک، خان رضوانی، حضرت نور احمد فریدی، مہر ڈاکٹر عبدالحق شامل ہیں۔

ایک علم دوست شخصیت جیسے ملتان کبھی فراموش نہیں کر سکتا وہ آغا شیر احمد خاموس کی شخصیت تھی۔ ملتان کی ادبی ثقافتی سرگرمیوں کے متحرک ان کی ذات تھی۔ منشی عبدالرحمٰن ایک دوسرا نام ہے جو انٹ رہے گا مولوی فیضان، مولوی عرفان احمد انصاری ایڈووکیٹ ملتان کی ترجمانی کا فرض ادا کرتے تھے۔ خان محمد احسن خاں ایڈووکیٹ ایک بڑا نام تھا جس نے ہمیشہ مسلم بنگال سے لے کر پاکستان کی سیاست میں کلیدی کردار ادا کیا اور سیاست دانوں کو ایک مقام پر اکٹھا کیا۔ آموں کی لڑیاں جوڑ کر ائرپورٹ پر حکام کو دکھانے اور انہیں ملتان کا تعارف کرانے میں جناب ملک فیض بخش رجوانہ کا نام بھی زندہ رہے گا اور فیض عام نرسری ان کی ذہنی کاوشوں کی علامت رہے گی۔

ملتان کا ایک نامور فرزند اور بابائے زراعت ملک خدا بخش بچہ بھی ایک عہد ساز شخصیت

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

کے مالک ہیں زندہ ہیں اور کاشتکاروں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اسی طرح ایک معتبر نام سید فخر الدین بلے کا ہے جنہوں نے ملتان کو اطلاعات معلومات اور تعلقات کے معاملوں میں باخبر رکھا ہے اور اس شہر کی آواز کو ہر آن بلند رکھا۔

ملتان ان گنت محسنوں کی سر زمین ہے یہاں ایسے دیدہ در پیدا ہوئے جنہوں نے ملتان کو اپنے علم اور ہنر سے وہ فضیلت بخشی کہ ملتان آج انہی افراد کا زیر بار ہے۔ سیاست، زرعت، تجارت، تعلیم، صنعت و حرفت ..... ، آرٹ، اور آرٹسٹ جس کوچہ میں بھی جائیں آپ کو اونچے نام اور اونچے مقام کے نسان ملیں گے۔ ملتان کے یہ وہ چراغ ہیں جنہوں نے ہر شعبہ حیات میں ان گنت حکمت کی قندیلیں روشن کی ہیں، کبھی مجسم خیر کی صورت میں مولانا خیر محمد مجسم مدرسہ خیر المدارس، کبھی مدرسہ تعلیم الابرار کی صورت میں ابو الحسن قاسمی، کبھی ڈاکٹر محمد جمال بھٹہ بانی و معمار نشتر میڈیکل کالج ملتان، نادر کتب اور محفوظات میں عبدالحلیم خاں ترین، سید حسن رضا گردیزی، عمر کمال خاں ایڈووکیٹ ملتان کی تاریخ کا علمی حوالہ ہیں تقریبات کا زندہ حوالہ ارشد حسین ارشد ہے۔ کاش زمانہ اس کی قدر کرتا اور اسے کسی منصب پر فائز کرتا، ملتان کے ادبی، روحانی اور علمی نکھار کا انداز یہاں کے افراد کے زبان و بیان سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے وہی مٹھاس وہی چاشنی وہی دھیما پن وہ سادگی جو یہاں کے اسلاف کا ورثہ ہے۔ آج ملتان کو انہی افراد کی ضرورت ہے جو خلوص و وفا کی انمول تصویر تھے جنہوں نے رواداری اور مٹھاس سے اس شہر کی تعمیر کی اس کی تعمیر میں کبھی زبان، علاقہ، ذات، حائل نہیں ہوئی جو اس شہر میں آبسا وہ اسی شہر کا کہلایا اس کی پہچان یہ شہر ہوا۔

عاصی کرنالی کو ملتان کی روحانی اقدار کا اور یہاں کے مزاج کا وہی پیار ہے جو ارشد ملتانی اور یا امیہ ملتانی کو ہو سکتا ہے عرش صدیقی نے بھی ملتان کو اپنی پہچان بتایا۔ ملتان نے ایسے نامور حضرات بھی دیکھے ہیں جنہوں نے روحانیت اور سیاست میں کمال پیدا کر دیا جن میں حضرت زین العابدین گیلانی اور صحافت میں قد آور شخصیت ہیں شیخ مظفر الدین جنہیں بابائے صحافت بھی کہا جاتا ہے۔ زمیندار سدھار کے مالک اور مدیر تھے الشمس محمد اکرم خاں بھی ایک حقیر نام تھا ہفت روزہ کارزار کے ظفر مخدون اور خواجہ عبالکریم قاصف عاشق حسین حسنی کا ہفت روزہ روشن چراغ بال کشن تبرہ گرد گنٹھال کے مدیر تھے۔ جنہوں نے صحافت کی آبرو بڑھائی۔ علمائے کرام میں سید عطاء اللہ بخاری سے بڑھ کر کوئی خطیب کیا ہو سکتا ہے جن کی کچی اینٹوں

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

کا مزار گل ٹیکس کے قبرستان محلّہ قدیر آباد میں ہے۔ عہد حاضر کے صحافیوں میں جنہیں داستان صحافت امام کہنا موزوں ہو گا محترم شیخ ریاض پرویز ہیں جن کی یادیں اور اس عہد کی باتیں ایک مستند کتاب کا درجہ رکھتی ہیں۔ ملتان انہی افراد کے کارناموں سے اور انہی افراد کے لاثانی کردار سے آج بھی زندہ ہے اور زندہ رہے گا لیکن دکھ اس بات کا ہے کہ ہم نے ان ہستیوں کو کیا مقام دیا ہے۔ نہ کوئی تاریخ نہ کتاب اور نہ کوئی یادگار صرف زبان اور بیان کی حد تک اور وہ بھی کبھی طاق نسیاں نہ ہو جائیں۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ایک کمرہ-6 آدمی

پاکستان کی ساری سیاسی جماعتیں دن رات غریب کی زندگی سنوارنے ان کے دکھ بانٹنے میں مصروف رہتی ہیں۔ یہی حال عوامی نمائندوں کا ہے۔ جنہوں نے غریبوں کے زخم اکٹھے کر رکھے ہیں۔ جنہیں وہ اپنے منشور میں جلی حروف سے لکھتے ہیں انتخابی جلسوں میں رقت آمیز لہجہ میں بیان کرتے ہیں۔ غریب جس کو مناسب تربیت نہیں ہوئی ہوتی وہ وہ آسانی سے ان خوش نما اور خوش نوا لفظوں کے چکر میں آجاتا ہے۔ بڑی بڑی امیدیں وابستہ کر لیتا ہے جونہی نواب صاحب الیکشن جیتیں گے ہم غریبوں کے دن پھر جائیں گے۔ گلی نالی جہاں گندا پانی متعدی بیماری کی طرح چمٹا رہتا ہے ختم ہو جائے گا۔ جس گلی میں ہر وقت نور جہاں کے مقبرے جیسی تاریکی چھائی رہتی ہے وہ بھی مرکزی باب لگ جانے پر بقعہ نور بن جائے گی۔ جس سکول کی چھت ہر سال گرتی ہے اور بچوں کو زخمی کرتی اور بعضوں کی جان لیتی ہے وہ بھی مرمت ہو جائے گی۔ واسا کے بال اور واپڈا کا اضافی سرچارج بھی ختم ہو جائے گی۔ غریبوں کو وہی بل ملے گا جس کی انہوں نے بجلی یا سوئی گیس جلائی ہو گی۔ ایسی ہی Good Goverance کے سنہری خواب آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں اور الیکشن تقدیر بدلنے کا نام بن جاتا ہے اور ہر امیدوار مقدر کا ستارہ اور ملت بیضا کا بطل جلیل نظر آنے لگتا ہے جونہی الیکشن کا کام تمام ہوا اراکین نے حلف اٹھایا پھر مرکزی شہروں کو وہ چلے گئے کبھی کبھار مہمانوں کی طرح بستی میں آئے تو ان کے درشن اور غیر مقدمی جلسوں سے انہیں فرصت نہ ملی اور غریب کبھی اپنی بستی کو اپنے محلّہ کو اور وہاں سے مستقل اٹھنے والی بدبو کو دیکھتا رہتا ہے جسے کارپوریشن والے اٹھانا اس لئے ضروری نہیں سمجھتے کہ روز روز کے کوڑا کرکٹ کو کہاں کہاں پھینکا جائے۔ بات غریبوں کی غربت کی ہو رہی تھی اور پھر بلدیاتی الیکشن پر ہیں اور ایسے ہی پیارے لوگوں نے حصہ لینا ہے اس لئے ان کے منشور ماہرین تیار کر رہے ہیں۔ بلکہ اس انداز سے تیار کر رہے ہیں کہ دکھتی رگ پر اس طرح اثر پذیر ہوں کہ واہ واہ کے ترانے بن جائیں گے اور لوگ داد دیں کہ کس آن سے اور کس شان سے ہمارا یہ مہمان اترا ہے غریبوں کی باتیں تو ہر ایک کرتا ہے کیا کیا اندازے اور تخمینے بیان کرتا ہے۔

Word Development Indicators

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

لفظ Poverty کی تشریح اور پھر ۱۲۰ ممالک میں اس کی شرح کو کم کرنے کے دعوے بیان کئے جاتے ہیں۔ اعداد و شمار سے ثابت کیا جاتا ہے کہ پوری دنیا کی دو تہائی آبادی غربت کے چنگل میں پھنسی ہے۔ معیار زندگی کی پست ہے۔ ایسے ماحول میں بے روزگاری عام ہے۔ صاف پانی، بہتر تعلیم اور علاج معالجہ کی سہولتیں نایاب ہیں۔ جنوبی ایشیاء میں صحرائی افریقہ اس طرح پس کے رو کتے ہیں جیسے چکی کے دو پاٹ میں آیا ہوا دانہ پس جاتا ہے۔ ورلڈ رپورٹ کے اعداد و شمار غربت کی زبوں حالی، غریب کی مجبوری اور ست معیار زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔ خدا بھال کرے ان این جی اوز کا جو فائیو سٹار ہوٹلوں میں عالی شان سیمینار کا انعقاد کرتی ہیں۔ دو تین لاکھ کے اخراجات سے احساس غربت کی بیداری پیدا کرتی ہیں۔ انگریزی میں بڑے بڑے مدیر، ماہرین، اقتصادیات اپنے گراں قدر مقالے پیش کرتے ہیں۔ اس موقع پر بروشر اور مفید لٹریچر بھی تقسیم کیا جاتا ہے جیسے کراچی میں عورت پر تشدد کی کانفرنس ۱۸، ۱۹ دسمبر کو منعقد ہوئی کہ عورتوں پر تشدد کو کیسے روکا جائے۔ فائیو سٹار ہوٹل کی رہائش شاندار یومیہ اور ایگزیکٹو کلب کے کرایہ جات سے ایسے محسوس ہوا جیسے "عورت پر تشدد" کے موضوعات ختم ہو گئے تو پھر ان ورکشاپوں اور کانفرنسوں کی ضرورت نہیں رہے گی اسی طرح غربت ایک پیارا لفظ ہے اسے بھی قائم رہنا چاہئے۔ کیونکہ غربت ورلڈ رپورٹ کا ایک مستند ایجنڈا ہے اگر غربت ختم ہو گئی تو ورلڈ رپورٹ کے ایجنڈے کا کیا بنے گا۔ اس لئے مسائل پر غور تو جاری رہے دراصل مسئلہ ختم نہ ہو۔ یہی کانفرنس ورکشاپ اور سیمینار کی خوبی ہے۔

جب ہم پڑھتے ہیں کہ ہر روز دس ہزار نئے شیر خوار پیدا ہوتے ہیں اور ایک ہزار سے زائد بچے غریبانہ ماحول کی وجہ سے مر جاتے ہیں اور جو بچ جاتے ہیں وہ ایک غریب افلاک زدہ معاشرہ میں ناقص ملاوٹ شدہ خوراک پر پلتے ہیں اور صبح سے شام تک Unproductive Services میں زندگی گزار دیتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے اپنی منصوبہ بندی پر اور دکھ ہوتا ہے ان منشوروں ان انتخابی نعروں اور پانچ سالہ ترقیاتی منصوبوں پر جن میں ہم بڑے بڑے دعوے بڑے بڑے پروگرام تشکیل کرتے ہیں سارا دن خوش رہتے ہیں کہ بس اب ہمارے دن بدل جائیں گے۔ جنوبی پنجاب سے اگر کوئی وزیر سفیر، سینیٹر الیکشن جیت جائے تو ہمیں جنوبی پنجاب کی قسمت کے بدلنے کے خواب نظر آنے لگتے ہیں۔ اور اہم بھول جاتے ہیں کہ مشتاق احمد گورمانی سے لے کر جناب فاروق احمد لغاری تک نے اس خطہ کیلئے اور اس خطہ کے

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

عوام کیلئے کیا گیا منصوبے نہیں دیے۔ کیا اس علاقے میں صنعتیں لگ گئی ہیں۔ معدنی وسائل پر جدید ریسرچ ہو رہی ہے کاٹن پر جننگ فیکٹریوں کے علاوہ صنعتیں لگ گئی ہیں جو Finished Products تیار کرتی ہیں کپڑا تیار کر کے مارکیٹ میں لاتی ہیں۔ ہمارے سیمینار صرف ہلکے پھلکے موضوعات پر ہوتے ہیں کہ غربت مٹاؤ غریب کو جینے کا موقعہ دو جبکہ وہ حالات دور کرنے کا ارادہ نہیں کرتے۔ جو غریب پاؤں کے نیچے گھسے ہوئے کنبوں کی صورت میں جھونپڑیوں میں اپنی ساری زندگی گزار دیتے ہیں ہم نے آزادی کے ان پچاس سالوں میں کیا غریب کیلئے کوئی ایسی کالونی تعمیر کی ہے جہاں غریب کو سر چھپانے کو جگہ ملی ہو جو پلوں اور اوور ہیڈ لائنوں کے نیچے عمر بھر زندگی گزارنے والوں کو گھر ملا ہو۔ اس لئے وہ مہنگے پلاٹ خرید کر کے قسطیں ادا نہیں کر سکتے۔ ہمارے اعداد و شمار چیخ چیخ کر بتاتے ہیں کہ جس تیزی سے ہماری آبادی بڑھ رہی ہے اس تیزی سے ہمارے مکان سے ہماری آبادی بڑھ رہی ہے اس تیزی سے ہمارے مکان تعمیر نہیں ہو رہے۔ کل مکانات کا ۵۲ فیصد صرف ایک کمرے کے مکانات پر مشتمل ہے جبکہ ہر ایسے مکان میں ۱۶ افراد فی کمرہ رہائش پذیر ہیں۔ ایسے مکانات میں ٹھسے ہوئے خاندان اچھے منشور کی بجائے بہتر رہائش تعلیم، صحت، عمدہ غذا اور صاف پانی کے آرزو مند ہیں۔ انہیں روزگار چاہیے۔ بیماریوں کے خلاف تحفظ کی فراہمی کی ادویات چاہئیں دکھ اس بات کا رہتا ہے کہ کتنے اچھے لفظوں پر غربت مٹاؤ کے دعوے ہیں۔ عملاً ایک سکیم بھی نہیں۔ ییلو ٹرا [illegible] سکیم کا حال پوری دنیا جانتی ہے۔ دی ہوئی قسطیں ضبط ہو گئیں۔ گاڑی چھین کر نیلام ہو گئی اور غربت مٹانے کا دعویدار نوجوان ایک کمرے میں درد سے کراہ رہا ہے جہاں اس جیسے پہلے پانچ جوان رہائش پذیر ہیں جو رضائی ڈھانپ کر بھاپ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ رضائی اور ایک کمرے میں چھ افراد کب تک ہمارے منصوبوں کو ناکام بنائیں گے۔ یا منصوبے انہیں ناکام بنا دیں گے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

عمر پور کی محنت کش ''مہارانی''

دیہی زندگی کی بھی عجیب زندگی ہے اچھی فصلیں ہو جائیں تو شہروں کے شوروم آباد ہو جاتے ہیں کاشتکار خوشحال ہو جاتا ہے نئی ماڈل کی گاڑی خرید کرتا ہے بڑے شہروں کے دورے کرتا ہے بڑے بڑے وزیروں کی دعوتیں کرتا ہے پرانی دشمنیاں یاد کرتا ہے اور نئی دوستیاں بنتا ہے حکام سے رابطے بڑھاتا ہے تحصیل کچہری کو آباد کرتا ہے پٹواری سے لے کر تحصیلدار تک صرف زمین کا ہی نہیں بلکہ متوقع آمدنی کا بھی جائزہ لیتا ہے صرف ایک فصل کتنی زندگی بدل دیتی ہے ترجیحات کا کس طرح تعین کرتی ہے اور جن کی زمینیں دریابرد ہو جائیں ان کی دنیا جھونپڑی تک محدود ہو جاتی ہے۔ مالک سے مزارع حاکم سے محکوم امیر سے غریب اور پھر ایسا غریب کہ سارا دن مٹر چننے میں گزر جاتا ہے اور شام کو ایک بوری مٹر کا معاوضہ صرف بیس روپے ملتا ہے پچھلے دنوں عمر پور کے ایک دیہات میں جانے کا اتفاق ہوا دریائے چناب کی زرخیز مٹی کے حسن کو دیکھنے کا موقعہ ملا کس طرح دریا ہر سال کشمیر کا سونا اور پہاڑوں کے اندر چھپے ہوئے خزینے کو دیہات میں منتقل کرتا ہے جہاں جہاں سے دریا گزر جاتا ہے وہاں ایسے زمینی خزانے چھوڑ جاتا ہے کہ لہر پہر ہو جاتی ہے فصلیں سونا اگلنے لگتی ہیں گندم گنا مٹر کے صرف بیج ڈالیں کسی پانی کی کسی دیکھ بھال کی ضرورت نہیں زمین اپنے سارے خزانے منتقل کر دیتی ہے غریب کو امیر بنا دیتی ہے۔ ہمارے دورے میں ایک مصنوعی کھاد کے بڑے آفسر بھی تھے وہ حیران تھے کہ ہماری کھاد کے بغیر اتنا انقلاب کیسے آجاتا ہے اس قدر ''کش گرین'' خطے کیسے وجود میں آتے ہیں گنا کے جوس میں اس قدر مٹھاس کیوں آجاتی ہے مٹر اس قدر میٹھے اور لذیذ کیوں بن جاتے ہیں پلاؤ میں مٹر ڈالیں تو زردے کی مٹھاس مل جاتی ہے دھنیاں میں اس قدر خوشبو شامل ہو جاتی ہے کہ ہاتھوں میں مہک رچ بس جاتی ہے پانی کا ذائقہ اس قدر میٹھا ہے کہ جس قدر پانی پی لیں کوئی مصنوعی مشروب اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ تازہ پانی اور صاف ہوا چہروں پر نکھار لاتی ہے گفتگو میں وقار اور چلنے پھرنے میں ایک بہار جیسی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے جب دیہاتی مہمانوں کو دیسی گھی میں دیسی مرغی کھلاتے ہیں تو ایسے محسوس ہوتا ہے کہ طب مشرق کا کوئی ایسا صدری نسخہ استعمال کر رہے ہوں جو کبھی بڑھاپے کو قریب نہ لائے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

دیہات کی لسی وہ مشروب ہے جو جلن کا علاج اور معدہ کی تیزابیت کا مجرب نسخہ ہے مگر شہر اس نعمت سے محروم ہیں لسی ملتی ہے تو دفتر میں نیند آجاتی ہے سارا دن چھنکیں اور طبعیت مضمحل رہتی ہے شہر والوں کے مقدر میں کینٹین کی چائے جو دماغ کو روشن کرتی اور معدہ کو جلا کے رکھ دیتی ہے معدہ صرف چائے پینے تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے جونہی کوئی ٹھوس غذا کھانے کو ملی جسم کے ہر جور سے احتجاج کی صدا بلند ہوئی کہ ہمیں صرف چائے تک رہنے دو جبکہ دیہاتی کی زندگی پر لطف ہے کہ وہ نیل کوٹ کے میلے کی گلی سڑی مٹھائی بھی شوق سے ہضم کر لیتا ہے رشک آتا ہے کہ کیا صحتمند معدہ ان دیہاتیوں کا ہے جبکہ ہم شہر کے باسی گنے کے جوس کا ایک گلاس پی لیں تو بڑی شدت سے احساس ہوتا ہے کہ کاش ہمارے ہمراہ کوئی معزز لوٹا بھی ہوتا جس کا فراغدلی سے استعمال کرتے۔

عمر پور خوش نصیب خطہ ہے جہاں فصلیں تر و تازہ چہرے ہشاش بشاش دیسی گھی دیسی مرغی اور پھر گنے کا جوش گڑ اور پیاز کھانوں ذائقے بڑھاتے ہیں یا تازہ جن کے ذائقے باسی بھی ہوں تو ایسے لگتے ہیں جیسے تازہ میں کیونکہ انہیں باسی کہنے یا پسند نہ کرنے سے آدمی شہری نہیں دیہاتی لگتا ہے دیہاتی لگنا تو کوئی بری بات نہیں دیہاتی سے مراد جب جہالت لی جاتی ہے تو اس وقت کچھ دکھ زیادہ ہوتا ہے اس وقت کیفیت وہی ہو جاتی ہے جس زمیندار کی زمین دریا برد ہو جائے اور وہ محل سے جھونپڑی میں منتقل ہو جائے اس عمر پور کی بڑھیا کی طرح ہو گئی موضع جات کی ملکہ تھی آج بیس روپے فی بوری مٹر کی مزدوری پر گزارہ کرتی اور سارے دن میں صرف ایک بوری تیار ہو جائے تو وہ بڑی خوش ہوتی ہے کہ آج دہاڑی اچھی لگی ہے وگرنہ ادھوری بوری پر آدمی مزدوری بھی نہیں ملتی اس لئے زمین دریابرد ہو گئی ہے اور ریلیف کا محکمہ لاہور میں ہے جہاں کا کرایہ سو روپے سے زیادہ ہے اور مزدوری صرف بیس روپے انصاف کتنا دور ہے اور دریابرد زمین کتنی نزدیک ہے ایسے موقع پر دیہاتی یہ شعر گا کر خوش ہو جاتے ہیں۔

بے وفا دی یاری ایویں جیویں رخ کھجور
دھپ لگے تے سایہ نہیں بُھل لگے تے پھل دور

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ملتان کی تہذیبی قدریں

شہنشاہ جہانگیر اور اس کی بیگم نور جہاں کو لاہو اس قدر پسند تھا کہ انہوں نے لاہور میں دفن ہونا پسند کیا بلکہ لاہور کی محبت میں اس قدر اسیر ہوئے کہ نور جہاں کی زبان شعر کی رعایت میں ڈھل گئی۔

لاہور رابجان برابر خرید، ایم
جاں داود ایم و جنت دیگر خرید ، ایم

میں نے اپنی جان کو بیچ کر لاہور خرید لیا ہے اور اس طرح دوسری جنت جو لاہور ہے وہ میں نے خرید لی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ دونوں ہستیوں کے مزار لاہور ہی میں ہیں مٹی سے اس قدر محبت کا اظہار شاید کسی نے نہ کیا ہو لیکن تاریخ میں ایک ایسا شہر بھی موجود ہے جسے دنیا بھر کے دانشوروں نے جان سے کیا روح سے چاہا ہے اور وہ ملتان ہے۔ ارض ملتان کو تاریخ میں جو فضیلت حاصل ہے اس کا اظہار اس شعر سے ہوتا ہے۔

مہد آدم کہ قدرسیاں داتند
جاگے اصل است موفتان نامند

ملتان کی مٹی خوشخطی کے لئے استعمال ہوتی ہے نقش و نگار کیلئے حسن اظہار کے لئے اور اس تخلیق آدم کے لئے استعمال ہوتی ہے جب قرنوں کی خاک اور دبی ہوئی راکھ سے انسان کا وجود حیات و کائنات کا روپ اختیار کر رہا تھا۔ ملتان بظاہر ایک ٹیلبم کے گرد آباد شہر ہے جس کے چاروں اطراف میں دریاؤں کا سنگم ہے مگر اس کی مٹی کے نیچے تہذیب کی وہ قدریں پوشیدہ ہیں جن کی اساس انسان دوستی محبت اور اخلاص ہے۔ جب اس خطہ میں اسلام کی روشنی پھیلی تو اس مٹی سے گنبد محراب مسجد کی صورت میں تہذیب کے ایسے نقش سامنے آئے کہ ملتان کی مٹی حقانیت اسلام کی قندیل بن کر چہار سو ضیاء پاش ہوئی اس مٹی سے منبرو محراب ہی نہیں تعمیر ہوئے بلکہ اس مٹی کی تاثیر سے حضرت جلال الدین سرخ بخاری اور بابا مسعود گنج شکر حضرت امیر خسرو اور حضرت خواجہ فرید کی روح پروری شاعری نے شعر و نغمہ کی صورت میں تصوف کے پھول تر و تازہ کئے۔ رشد و ہدایت کے باب روشن ہوئے اس مٹی نے علم و تدریس کی حویلیاں آباد کیں۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

اس مٹی نے اہل علم سے محبت اور خلق خدا کو الفت کا درس دیا اس مٹی نے یہ احساس اجاگر کیا۔

اٹھ فریدا ستیا جھاڑو دے مسیت
توں ستا رب جاگدا تیری ڈاڈھے نال پریت

خدا تعالیٰ سے اپنی نسبت کو مضبوط کرنے کے لئے شب بیداری ضروری ہے جب رب کائنات جاگ رہا ہے تو اس کا بندہ سو کیسے سکتا ہے اسے تو مسجد آباد کرنی چاہئے۔ آج مسجد کے باہر پولیس کا پہرہ ہے یہ ملتانی تہذیب کا کوئی ورثہ نہیں۔ یہ شہر امان ہے اس شہر نے تو انسان دوستی اور خدا خوفی کا ایسا درس دیا ہے جس میں نفی ذات اور من پسندی کا کہیں راج نظر نہیں آتا حضرت بابا فرید گنج شکرؒ فرماتے ہیں۔

فریدا میں نوں مار کے منج کر نکی کر کے کٹ
بھر خزانے رب دے جو بھاوے نو لٹ

فریدا خودی کو ایسا کوٹ کوٹ کر سیدھا کرو جیسے سرکنڈے کو کوٹ کر مونج بناتے ہیں اگر ایسا کرو گے تو اللہ کے خزانے تمہارے لئے بے حساب ہیں جس قدر چاہو اپنے دامن کو بھر لو کم نہیں ہوں گے ملتان علمی ادبی سرگرمیوں کا شہر ہے۔ ملتان سماجی اور تہذیبی تنظیموں کا مرکز ہے۔ ملتان کی نوجوان تنظیمیں اپنے وجود کا احساس دلاتی ہیں ہر روز ان کی تقریبات ان کا ملی اور سماجی شعور احساس دلاتا ہے کہ اس شہر میں مقامی مسائل سے لے کر قومی مسائل تک حل کرنے کے لئے ناخن تدبر موجود ہے۔ ملتان شاعروں، ادیبوں دانشوروں کا شہر ہے کسی بھی تقریب کا انعقاد کر لیں آپ کو نوجوانوں کی ایک وسیع جماعت اپنی فکری کاوشیں لئے نظر آئے گی بزرگوں اور استاد شعراء کی ایک بھری تعداد دکھائی دے گی جو ملتان کی تہذیبی قدروں کا سرمایہ ہیں اسی شہر میں آپ کو ایک ایسا شاعر استاد دانشور اکثر سڑکوں پر پیدل چلتے ہوئے نظر آئے گا جیسے تاریخ سرخ پنسل والا پروفیسر فرخ درانی کہے گی۔ یہ وہ استاد ہے جس نے ربع صدی سے زائد عرصہ تک تدریس کا فریضہ سر انجام دیا ہے شعر و سخن کی جدتیں دریافت کی ہیں کی تحقیق اور فکر کے معیار بنائے ہیں سورج میانی جسے تاریخ مدینۃ الصورہ فتح کی ہوئی بستی کے نام سے جانتی ہے اس سڑک پر ملتان کی وجاہتوں، چاہتوں کا ایک خوبصورت شاعر ارشد ملتانی ہے جس کے اشعار میں حکمت جس کے کردار میں ملتان کی نکہت

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

اور اٹھان میں وہی ملتانی مٹی ہے جسے بھارت والے اپنی تحریروں کو خوشخط بنانے کے لئے استعمال کرتے ہیں ملتانی مٹی تصوف کی خوشبو میں رچی بسی ہے اسے بزرگانِ دین نے اپنے کوزہ ، جام الفت اور مہمان نوازی کے لئے چنا ہے شالیمار کی بستی کا رخ کریں تو دنیا بھر سے محبت کرنے والے انسان سے ملاقات ہوتی ہے جسے اہلِ پاکستان عاصی کرنالی کہتے ہیں۔ اسی راستے پر جناب اسلم نصاری کی اقامت گاہ ہے یہ درویشوں سے محبت کرنے اور ملتان کی عظمت کو اجاگر کرنے والا شاعر ہے۔ خواجہ فرید کا مرید اور اس کی شاعری اور تخلیقی کاوشوں کا مفسر اسلم میتلا سرزمین جہانیاں سے اپنی فکری اساس لئے نظر آتا ہے اندرون شہر کی مجلسی زندگی پر نظر ڈالیں تو ملتان کا ایک محسن اپنی شاندار علمی محافل کی یادوں کا سرمایہ لئے رخصت ہو گیا ہے ملک اللہ بخش تعلیم اور تعلیمی اداروں کا ایک درخشندہ ستارہ تھا انہی تہذیبی قدروں کے امین پروفیسر خواجہ خورشید احمد تھے جن کا گھر لوہاری دروازہ میں مجلس احرار کے دفتر کے سامنے اور ہنوں کے چھجہ کے پہلو میں تھا اب وہاں یہ نہ مجلس احرار کا دفتر ہے اور نہ ہی پروفیسر صاحب کا گھر ہے دونوں ادارے نئی منزلوں کی طرف منتقل ہو گئے ہیں۔ ملتان نے اپنی تہذیبی قدروں کو سنبھال کر رکھا ہے انہیں دیکھنے کے لئے مشرقی پاکستان سے نورالامین تشریف لاتے تھے اور محمود علی صاحب تو اکثر یہاں حاضری دیتے رہتے ہیں اس شہر میں قدرت اللہ شہاب سے لے کر ڈاکٹر عبداللہ ، جوش ملیح آبادی فتیل شفائی شورش کاشمیری اینی میری شمل جرمن سکالر علامہ علاؤالدین صدیقی اور حضرت قائداعظم محمد علی جناح کی قابل فخر بہن مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح کئی بار یہاں تشریف لائیں۔

اس سرزمین کی تہذیبی قدروں میں یہ بھی حسن و کمال رہا ہے کہ اس سرزمین نے آنے والوں کے مفید مشوروں کو ہمیشہ خندہ پیشانی سے قبول کیا ہے اور انہیں اس شہر کی اٹھان میں استعمال کیا ہے یہاں پرنس کریم آغا خاں آتے رہتے ہیں سردار عبدالقیوم سابق صدر آزاد کشمیر نے روحانی مدارج کے لئے یہاں کے کئی دورے کئے ہیں دنیائے طب کی نامور شخصیت حکیم محمد سعید نے آواز اخلاق کے لئے اس شہر بے مثال کو چنا ہے۔ ملتان علم و فن کا شہر ہے شعر و سخن کا شہر ہے موسیقی جسے روح کی غذا کہتے ہیں یہاں موسیقی سے عارفانہ کلام سے محبت کرنے والوں کا دور رہا ہے اس سرزمین سے کبھی خواجہ فریدؒ کبھی اقبالؒ کبھی غالب اور کبھی پنجابی اور سرائیکی کے شعراء کا کلام گایا اور سنا گیا ہے ان محفلوں کو سجانے میں ملتان کے ریڈیو

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

سٹیشن کا بھی تاریخی کردار ہے اس نے کئی موسیقاروں کو متعارف کرایا کئی نئی آوازوں کو معتبر آواز بنایا ہے اس شہر سے ثریا ملتانی سے لے کر اقبال بانو مینا لودھی مسرت بانو نذیر بیگم نے عارفانہ کلام سے دلوں کو مہر و محبت سے آشنا کیا اس سر زمین سے استاد کوڑے خاں استاد معشوقہ خاں نے ملک بھر میں ملتان کا نام روشن کیا۔ ملتان صدیوں سے لے کر آج کے عہد تک اپنی علمی ثقافتی اور تہذیبی قدروں کا منفرد شہر رہا ہے لیکن المیہ یہ بھی ہے کہ آج مل بیٹھنے کے گوشے دستیاب نہیں۔ اس کے سرمائے کو محفوظ کرنے والے ادارے مفقود ہیں اور اگر یہ صورتحال جاری رہی تو کہیں ملتان صرف مضمونوں اخباری بیانوں کی حد تک تہذیبی شہر نہ رہ جائے اور اگر کوئی پوچھے گا کہ ملتان کا تہذیبی سرمایہ ہے تو حوالہ ملے گا کہ آپ اخبار کا فلاں شمارہ اٹھا کر دیکھ لیں اس میں ساری تاریخ درج ہے اور بس باقی ملتان خالی رہ گیا ہے اور صرف اخباری تراشے اس کی عظمت اور قدامت کے حوالے ہیں۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ہمارے شہر میں ایک آدمی تھا آسماں جیسا

اہم مناسب بھی اس درویش کا کچھ نہیں بگاڑ سکے

مخدوم محمد سجاد حسین قریشی کا شمار ان منفرد اور اعلیٰ مقام شخصیات میں ہوتا ہے۔ جنہیں خدائے بزرگ وبرتر کسی مخصوص خدمت کے لئے پیدا فرماتا ہے اور پھر اس خدمت کو انجام دینے کی توفیق اور صلاحیتوں سے بھی نوازتا ہے تاریخ شاہد ہے کہ ایسی شخصیات ہر دور اور ہر زمانے میں اور کم وبیش ہر معاشرے میں پیدا ہوتی رہی ہیں اور اپنے بعد آنے والوں کو درس حیادیتی رہی ہیں۔ جب قبلہ مخدوم سجاد حسین قریشی کی شخصیات کا جائزہ لیتے ہیں تو اللہ کے اس نیک بندے میں غیر معمولی اوصاف تھے۔ دلوں میں گھر کر جانا۔ اپنا گرویدہ بنالینا اور ہر ایک سے اس طرح ملنا جیسے وہ اہم ترین انسان ہو ایک غریب سے غریب آدمی کو سینے سے لگانا اس کے لئے ساتھ دکھ درد بانٹنا اس کی امداد کرنا۔ اس کے دامن میں دعاؤں کے تحفے ڈال دینا اس کے حوصلے بلند کرنا۔ مشکلات میں ڈھارس دینا۔ کیا ایسی خوبیاں معمولی خوبیاں ہیں۔ کیا ان کے مرتبے کو بلند کرنے والے اوصاف نہیں آج کسی کے پاس چار پیسے آجائیں تو رعونت سے اس کی گردن کے بل ٹھیک نہیں ہوتے۔ سیدھے منہ بات کرنا اس کیلئے دشوار ہوتا ہے اپنی مسند سے اٹھ کر سلام کا جواب دینا ممکن نہیں ہوتا۔ اپنے عمر بھر کے ساتھی کو پہچاننے سے انکار کر دینا اس مادی دور کے کمالات ہیں۔ قبلہ مخدوم محمد سجاد حسین قریشی ملتان کے رئیس خاندان میں ۱۹۲۳ میں پیدا ہوئے نازونعم کی ساری نعمتیں ورثے میں ملیں دنیاوی منصب بھی بہت زیادہ تھے متحدہ پاکستان کی قومی اسمبلی کے رکن رہے۔ ملتان کارپوریشن کے وائس چیئرمین پھر چیئرمین۔ ملتان کی امپرومنٹ ٹرسٹ کے سیکرٹری، کئی تنظیموں کے سربراہ اور روحانی مدارج میں جنوبی ایشیاء کی عظیم روحانی سلطنت جس کی اساس حجرت بہاوالدین زکریا ملتانی نے قائم کی تھی وہ آپ کو ورثہ میں ملی۔ آپ اس درگاہ حالیہ کے سجادہ نشین مقرر ہوئے۔ حضرت شاہ رکن عالم کی درگاہ کے بھی سجادہ نشین اور حضرت بی بی پاک دامنؒ کے بھی سجادہ نشین۔ مشائخ کرام کی تنظیموں کے بھی سرپرست اعلیٰ تھے، یہ سارے منصب یہ سارے جاہ جلال اس درویش کا کچھ نہ بگاڑ سے اس کے مزاج میں کوئی کروفر پیدا نہ کر سکے وہ سر سے لے کر پاؤں تک عجز وانکساری کا پیکر رہے۔ ہر مکتب فکر سے پیار کیا ہر

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ایک رہنما کو دل و جان سے مزید خیال کیا۔ اتحاد المسلمین کے لئے عمر بھر کوشاں رہے۔ حجرت غوث بہاء الدین زکریا ملتانی کے عرس کے موقع پر جس محبت عقیدت اور خلوص سے محفلیں سجاتے۔ انتظامات کا جائزہ لیتے۔ آنے والے زائرین اور عقیدت مندوں کے آرام کا خیال کرتے۔ ان کے طعام اور دیگر سہولتوں کے لئے اپنے گھر کے دروازے کھلے رکھتے۔ حکام کو احساس دلاتے کہ یہ مہمان معمولی نہیں اس بزرگ ہستی کے مہمان ہیں جس نے ملتان کو ہر بلاد پوری مندر سے نکال کر اسلام کی حقائیت سے آگاہ کیا جس کے کفر کے گڑھ کو مدینہ اولیاء بنایا جس نے ملتان جیسے پسماندہ خطہ سے تبلیغ اسلام کے قافلے روانہ کئے۔ یہ مہمان اس روحانی پیشوا کے ہیں جو آج ساڑھے سات سال پہلے ملتان میں قدیم ترین اقامتی یونیورسٹی کا قیام عمل میں لایا جس نے ملتان میں قرآن و حدیث۔ تفسیر فقہ کے بعد علوم و فنون کو متعارف کرایا۔ تجارت کا علم دیا۔ زراعت کے جدید طریقے سکھائے نقش خواہ دل میں ہوں یا سنگ و خشت میں ہوں، ہمارے پتھروں کو تراش کر فکرو نظر میں انقلاب پیدا کیا۔ کسی کو عراقی کسی کو حسینی کسی کو اوچ شریف میں کسی کو افغانستان میں کسی کو کشمیر میں کسی کو سلہٹ میں کسی کو بنگال میں کسی کو جاوا و سماٹرا میں کسی کو لعل شہباز قلندر بنایا کسی کو مخدوم عبدالرشید حقائی بنایا کسی کو مخدوم جہانیاں جہاں گشت بنایا۔ کسی کو آپ کی یاد آتی تو منہ سے آہ بلخ بخارہ نکلتا کسی کو یاد آتی تو شیخ السلام کی آواز لگاتا۔ اس غوث العالمین نے پورے عالم اسلام میں فقرو ولایت کے جھنڈے گاڑ دئے۔ مخدوم محمد سجاد قریشی اس مرد کامل اس درویش بے مثل کی ہر سال یاد مناتے اس کے کلام کو اس کے پیغام کو آگے بڑھاتے اہل درد کو اکٹھا کرتے تطہیر قلوب اور تزکیہ نفس سے مردہ دلوں میں زندگی کی دمک پیدا کرتے۔ دل کی کثافتوں کو دھوتے اور تصوف اور اسلام کی زندہ روشنی سے امراض باطنہ کا علاج دریافت کرتے حکمت و دانائی کی محفلیں باب القریش میں سجتیں۔ علم اور علماء کا ذکر ہوتا۔ ادب اور سیاست کے اوراق الٹائے جاتے۔ برصغیر کے حکمرانوں کے تذکرے اور ان کے انجام کے حوالے گفتگو میں آتے۔ مخدوم صاحب ایک پیٹ کتاب کی طرح ایک SYNDICATEDSCHOLAR اور انہی شاندار یادداشتوں کو ذہن کے گوشوں میں تازہ کرتے۔ مخدوم صاحب گورنر پنجاب تھے ان کے بے نیازی اپنی جگہ علم و انکساری کی مثالیں اپنے مقام پر جب ایک انگریز نے "مسٹر جناح نے پاکستان کے لئے کیا کیا" کا جملہ کہا مخدوم صاحب نے برق بلاین کر اسے ٹوکا اور کہا HE WAS FATHER!

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

بازاروں میں لاؤڈ سپیکر

لاؤڈ سپیکر یا آلہ عکبر الصوف ایک ایسی ایجاد ہے جسے خلق خدا نے جی بھر کر معتوب کیا ہے اور جی بھر کر چاہا ہے۔ ماضی میں اس کے ساتھ کیا کیا سلوک نہیں ہوئے۔ اس پر کیسے کیسے بیانات شائع نہیں ہوئے اسے کسی نے شیطان کا آلہ کہا کسی نے اس کے وجود کو برائی سے تعبیر کیا پھر ایسا دور بھی آیا کہ یہ معتوب مقررین کا انتہائی محبوب بن گیا۔ کسی گلی، محلہ یا شہر کی جیسی بھی تقریب ہو اس کا اہتمام ضروری ٹھہرا۔ جب تک لاؤڈ سپیکر نہیں آئے گا تقریب شروع نہیں ہو گی۔ جونہی لاؤڈ سپیکر نصب ہوا فضا میں ہیلوون ٹوتھری کی آواز گونجی۔ ٹیسٹنگ کا اعلان ہوا اور سامعین نے محسوس کر لیا کہ تقریب کا آغاز ہوا چاہتا ہے۔ سامعین گرجتے لاؤڈ سپیکر کی طرف لپکتے ہیں۔ یہ لاؤڈ سپیکر مجمع کو یکجا کرنے اور سامعین کی آخری صف تک آواز پہنچانے کا اہتمام کرتا ہے اگر کسی تقریب کا لاؤڈ سپیکر خراب ہو تو اچھی بھلی تقریب ناکام ہو جاتی ہے حاضرین تک آواز نہیں پہنچتی وہ بے چین ہو جاتے ہیں ''آواز'' آواز کی آواز بلند کرتے ہیں۔ منتظمین کے لئے الگ پریشانی ہوتی ہے کہ وہ آواز کہاں سے لائیں جو آخری آدمی تک پہنچ سکے بہر حال لاؤڈ سپیکر محض ایک ایجاد ہی نہیں ایک مؤثر ابلاغ بھی ہے اور ذرائع ابلاغ میں اسے وہ مقام حاصل ہے جیسے ریسور میں ڈش کا ہوتا ہے۔ ریسور جتنا ٹھیک ہو ٹیلی ویژن سیٹ جتنا اچھا ہو اگر ڈش کی جالی ٹوٹی ہوئی ہو تو نشریات ناممکن ہوتی ہے۔

یہی حال لاؤڈ سپیکر کا ہے اسے ہر اعتبار سے فٹ ہونا چاہئے۔ لاؤڈ سپیکر کی مقبولیت کا اندازہ آپ اس بات سے بخوبی لگا سکتے ہیں کہ اسے ہر چوک اور ہر سڑک کے آغاز میں لگایا جا رہا ہے آپ ایک سرے سے دوسرے سرے تک سفر کرتے جائیں شہر کی ساری سڑکیں ناپ لیں آپ کو کہیں ''نشریات'' میں تعطل نہیں ملے گا پوری توجہ سے زحمی سے آپ سارے پروگرام سے آگاہ ہو سکتے ہیں شہر کی سڑکیں اس سہولت سے آراستہ ہیں بجلی کے کھمبوں پر قطار اندر قطار یہ لاؤڈ سپیکر نصب ہیں اللہ کے نیک بندوں نے بڑے اچھے جذبوں سے بازاروں کے ماحول کو اچھے انداز تکلمے روشناس کرانے کے لئے ''آواز اخلاق'' کا بیڑا اٹھایا ہے کیونکہ بازاروں میں ہونے والی گفتگو میں اکثر ایسے گرے پڑے لفظ سننے کو ملتے ہیں جن کی وجہ سے شریف لوگوں کے کان سرخ اور چہرے لال ہو جاتے ہیں اس وبا کے خاتمہ کے لئے

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ابلاغ کے اس مؤثر آلہ کا استعمال عمل میں لایا گیا ہے تاکہ صبح سے شام تک بازاروں میں تلاوت قرآن مجید نعت رسول مقبولؐ کے کیسٹ چلائے جائیں تاکہ سننے والے اپنے اندر سوزوں اور ذوق و مستی کی روح پرور کیفیت پیدا کر سکیں۔ جس نے بھی ایسا سوچا ہے یقیناً اس کے دل میں معاشرے کی اصلاح کا مثبت پہلو موجود ہے لیکن ضروری نہیں کہ ہر مطلوبہ نتیجہ کا حصول ہر مروجہ طریقے سے حاصل کیا جا سکے۔ لاؤڈ سپیکر ہزار اچھا سہی مگر اس پر پروگرام پیش کرنے اور دوسروں تک پہنچانے کے کچھ آداب ضروری ہیں۔ تلاوت قرآن مجید اور نعت رسول مقبولؐ کے اوقات مقرر ہیں اس کے لئے خشوع اور خضوع کا ماحول برقرار رکھنا ضروری ہے۔

علمائے کرام اس سلسلہ میں بہتر جانتے ہیں اور تلاوت قرآن مجید اور نعت رسولؐ کی لذتوں اور کیفیتوں کا ادراک انہیں بہتر حاصل ہے۔ اکثر بازاروں میں جب تلاوت کی کیسٹ چل رہی ہوتی ہے لوگ بازار کی گہما گہمی میں کھوئے ہوئے ہوتے ہیں زور زور سے باتیں تکرار جھگڑے اور توتکار کا ماحول گرم ہوتا ہے اس سے تلاوت کا تقدس اور اسے غور سے سننے حکم مجروح ہوتا ہے۔ یہی کیفیت نعت رسول مقبولؐ کے وقت ہوتی ہے نعت رسول مقبولؐ مقام ادب ہے۔ نفس گم کردہ می آید جنیدؒ و بایزید اینجا است کا مقام ہے۔

جب ان کا ذکر ہو دنیا سراپا گوش ہو جائے
جب ان کا نام آئے مرحبا صلی علیٰ کہئے

ایسے پروگراموں کے لئے دن بھر کی بجائے صرف صبح کو کیسٹ چلائے جائیں تاکہ دن کا آغاز اچھے کلام سے اور عقیدت کے اظہار سے ہو بار بار اور دن میں کئی بار کیسٹ چلانے سے بازاروں میں جو بے ادبی کا ماحول نظر آتا ہے۔ وہ ان ہستیوں کی تعلیمات سے یکسر خالی ہے۔ ادھر عارفانہ کلام، عقیدت و محبت کا پیغام عشق و مستی کا۔ عقیدے کی پختگی کا ذکر و حضور و سرور کا عمل جاری ہوتا ہے اور ہر بازار میں عید کی خریداری اور پھر لوٹ مار کا مہنگائی اور سفید پوش طبقہ کی آخری پونجی کی صفائی کا عمل جاری ہوتا ہے۔ عید کی خریداری کے لئے بازاروں میں جو ہلڑ بازی، خواتین کو تنگ کرنے، پرس چھیننے، جیب کاٹنے اور دھکے دینے کا عمل دکھائی دیتا ہے اور ادھر لاؤڈ سپیکر پر الہامی کلام کا پروگرام کس دعوت فکر کا سامان ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم اس دو عملی کے ہاتھوں لٹ جائیں۔ سنیں کچھ اور کریں کچھ کے زمرے میں

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

دھر لئے جائیں۔ لاؤڈ سپیکر سے کیا ہم زیادہ اچھے پاکیزہ ذوق کے انسان بن جائیں گے ؟ تطہیر قلب کا عمل تو دل کی گہرائیوں سے شروع ہوتا ہے۔ کیا ہم اپنے دل میں تسبیح استغفار نہیں کر سکتے۔ عشق و محبت کا اور مدح رسول مقبول کا وظیفہ نہیں کر سکتے۔ ہمارے دلی جذبوں کو یہ لاؤڈ سپیکر کہاں تک سہارا دے گا۔ کیا ہمارے بازار صرف لاؤڈ سپیکر کی آواز سے ملاوٹ، ذخیرہ اندوزی، مہنگائی سے پاک ہو جائیں گے۔ اگر ایسا ممکن نہیں تو پھر لاؤڈ سپیکر کا بجلی کے کھمبے پر نصب ہونا بھی ضروری نہیں۔ تلاوت اور نعت رسول مقبولؐ کے لئے پہلے دل کی کثافتوں کو دھلی کپاس کی طرح صاف کرنا ضروری ہے تاکہ تجلیات کا ظہور ہو سکے اگر بازاروں میں لاؤڈ سپیکر صرف پیغام، احتجاج اور ایسوی ایشن کے ایجنڈے کو اراکین تک پہنچانے کا اہتمام ہے تو پھر اس کا سارا دن استعمال عام شہریوں کے لئے کیوں ہے۔

لاؤڈ سپیکر سے زیادہ مؤثر ایجادات آچکی ہیں ایسوی ایشنوں کو اس طرف پیش قدمی کرنی چاہئے۔ E.Mail کی ترقی سے فیکس کی سہولت سے موڈیم کی ایجاد سے اپنے پروگرام دوسروں تک پہنچانے چاہئیں۔ سارا دن کی تشریات سے کیا بازاروں میں کلام و بیان کے انداز بدل گئے ہیں۔ کیا ہمارے دکاندار آنے والے گاہک کو وہ مقام دیتے ہیں۔ جیسا ایک سفیر کو دوسرے ممالک اپنی اسناد تقرری پیش کرنے پر اہمیت دیتے ہیں۔ گاہک خدا تعالیٰ کی طرف سے دکاندار کے لئے رزق کا اہتمام کرنے آتا ہے ہم نے لاؤڈ سپیکروں کی قطار سے اچھے کلام سنانے کا ایک قدم اٹھالیا ہے لیکن ابھی دل میں گاہک کے لئے محبت، احترام، درگزر اور رحمت و شفقت کا قدم نہیں اٹھایا۔ کیا اس کے لئے دل کے اندر کسی لاؤڈ سپیکر کی ضرورت ہے جو ضمیر کی تہوں میں جمے ہوئے جذبہ کو جگائے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

دریائے اسلام جو تقریباً ۵۵ ممالک پر مشتمل ہے۔ جس کی آبادی تقریباً ۵۸ کروڑ ہے جس کے وسائل اور ذرائع میں دریائے نیل کی زرخیزی، سندھ کی طغیانی، دریائے اردن کی جولائی، ٹیکزگرم اور نن ٹیز لٹائی جیسے دریا اچھی فصلوں لذیذ اثمار اور گھنے اشجار کی ضمانت ہیں۔ بعض دریا کئی ملکوں کو ملاتے ہیں عراق، ترکی اور شام کی سرحدوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ دنیا نے اسلام کی قدرت نے تیل اور دیگر معدنیات کے خزانے دیئے ہیں۔ تیل بطور ہتھیار بھی استعمال ہوا ہے اور آج بھی اس کی اہمیت سے انکار نہیں۔ دنیا بھر کے ادارے، ٹرانسپورٹ اور صنعتیں اسی تیل کی مرہون منت ہیں۔ دنیا نے اسلام امیر ترین خطوں پر مشتمل ہے۔ افریقہ میں ان گنت مادی وسائل موجود ہیں۔ اشیاء افرادی قوت ذہانت میں اپنی مثال آپ ہے۔ یورپ کے خطوں میں آباد مسلمان اپنے علم، ہنر اور مرتبہ کی پہچان رکھتے ہیں۔ اسلامی ممالک میں وسط ایشیا کے ممالک بھی شامل ہیں جو اپنی صدیوں کی تہذیب اور عسکری جرأت کی وجہ سے بڑی طاقت سے آزاد ہوئے ہی اور اسلامی امہ میں اب اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ مشرق وسطیٰ اپنی مصنوعات، معدنیات اور کرہ ارض کے وسط میں ہونے کی وجہ سے دنیا بھر کی نظروں میں رہتی ہے۔ بڑی طاقتیں بہانے بہانے سے یہاں اپنا تسلط بڑھانا چاہتی ہیں۔ اس سرزمین کو سونے کی چڑیا سمجھتی ہیں اور اس کے وسائل پر قبضہ اور اس کے مسائل پر اجارہ داری قائم کر کے مشرق وسطیٰ کو مستقل طور پر جنگ کے دھانے پر کئی بار لا چکی ہیں اور اب عنان کوئی اس محاذ آرائی کی صورت میں کوئی اہم ثالثی کردار ادا کرنا چاہتے ہیں۔ مہذب دنیا اب جنگوں سے تنگ آچکی ہے لیکن حیرت ہوتی ہے کہ یہ مہذب دنیا یورپ اور دیگر ترقی یافتہ علاقوں میں جنگ نہیں ہونے دیتیں لیکن اسلامی امہ کو اس مصیبت سے نکلنے بھی نہیں دیتیں۔ جب انہیں معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اسلامی ملک اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی کوشش کر رہا ہے اس کے معائنہ کے بہانہ سے اس کی اندرونی ترقی پر شب خون مارنے کی کوشش کرتی ہیں اور اسے ایسا کمزور کرنے کی کوشش کرتی ہیں کہ وہ علاج معالجہ کے لئے دوائیوں سے محروم ہو جاتا ہے۔ دودھ، گوشت، غذا کی سہولتوں سے محروم ہو جاتا ہے المیہ یہ بھی ہے کہ دنیا نے اسلام کے کے پاس ان گنت وسائل ہونے کے باوجود اور افرادی قوت

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

میں ۸۵۰ ملین کی آبادی کے باوجود، بیشتر آبادی میں ۷۰ فیصد شرح خواندگی کے وصف کے باوجود یہ دنیائے اسلام ۲۳۰ بلین امریکی ڈالر اپنی معمولی درجہ کی خوراک جس میں چینی، گوشت اور بسکٹ شامل ہیں خرچ کرتی ہے اس قدر درآمدی ممتاجی قابل حیرت ہے یہ درآمدی محتاجی جو ۴۶ ملین ٹن اشیاء پر مشتمل ہے اور جس کی تعداد ۲۰۰۰ سال میں ۸۰ ملین ہو جائے گی۔ کیا دنیائے اسلام اپنی غذائی اشیاء خود تیار نہیں کر سکتی۔ کیا اسلامی مملک میں ایسی صنعتیں نہیں لگ سکتیں۔ کیا لائیو سٹاک سے ہمیں دودھ، مکھن، گوشت نہیں مل سکتا۔ کیا زرعی وسائل سے عالم اسلام کی ضرورتیں پوری نہیں ہو سکتیں۔ پھر یہ خطے غریب کیوں ہیں۔

اقوام غالب کی ان پر اجارہ داری کیوں ہے۔ اس لئے کہ عالم اسلام ابھی متحد نہیں۔ اس لئے کہ عالم اسلام کی فکری قیادت پر بڑی طاقتوں نے قبضہ کر رکھا ہے۔ اور انہیں ایسے مسائل میں الجھا رکھا ہے جس سے عالم اسلام ہر وقت اپنی بقاء سالمیت اور تحفظ میں الجھا دیتا ہے۔ صنعتیں لگانے، افرادی قوت کو بروئے کار لانے میں اسے کم مہلت ملتی ہے زیادہ تر وقت اس کا امریکی دباؤ سے بچنے اور بڑی طاقتوں کی مداخلت کے تریاق ڈھونڈنے میں لگتا ہے۔ اس کوشش میں اپنے بھی کبھی ناراض ہو جاتے ہیں اور دشمن تو ویسے بھی دشمن ہے۔

دنیائے اسلام کی اس زبوں حالی سے آگاہ کرنے کے لئے ہمارے نامور ماہر تعلیم جنہوں نے ساری زندگی معلّمی کی نظر کر دی۔ سرائے سدھو کی زرخیز زمینوں کو چھوڑ کر کبیر والا کی سیاسی سرگرمیوں سے الگ تھلگ قبیلے اور علاقہ کی سربراہی کو پس پشت ڈال کر اپنے آپ کو اساتذہ طلبا اور اداروں سے وابستہ کر دیانہ ستائش کی تمنانہ صلہ کی پرواہ۔ ان گنت تعلیمی اداروں کی معاونت کرنے، نئے ادارے کھولنے، تحریر اور تقریر کی سہولتیں فراہم کرنے اور اپنے دوستوں کی دل گیری اور عزیزوں کی دست گیری کرتے کرتے قلم اور کتاب کو اپنا مشن بنا لیا ہے۔ مہر گل محمد بظاہر ایک فرد کا نام ہے مگر یہ حساس انسان اسلامی درد سے آشنا اور دنیائے اسلام بیداری کا خواہاں ہے۔ ان کی حالیہ کتاب، دنیائے اسلام کا مختصر تعارف سامنے آتی ہے جو معنوں اور صوری اعتبار سے دیدہ زیب ہے۔ جس میں دنیائے اسلام کے سارے وسائل اور سارے مسائل شامل ہیں۔ یہ کتاب نہیں Hand Book ہے جسے ہر مسلمان کے ہاتھ میں ہونا چاہئے تاکہ اسلامی امہ مضبوط ہو سکے۔ دنیائے اسلام کو اس وقت درپیش چیلنج میں نمبر ایک یہ ہے اس کی سالمیت محفوظ رہے۔ اسلامی ممالک میں Better Under Stanging

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

پیدا ہو سکے ان اسلامی ممالک میں آج ایک اچھے ابلاغ کی ضرورت ہے تاکہ مشکل گھڑی میں ہم ایک ساتھ ہوں۔ مسئلہ کشمیر ہو یا فلسطین بوسنیا ہو یا بغداد، عالم اسلام کو ایک چھتری، ایک منزل ایک مقصد کے تحت ہونا چاہئے۔ ہم نے الگ ہو کر بڑی مار کھائی ہے۔ اکٹھے ہو کر ہم اقوام متحدہ کے اندر ایک چوتھائی طاقت ہیں اور باہر ہمارے پاس تیل کا ہتھیار اور وسائل کا انبار ہے پھر اسلامی دنیا غریب کیسے ہو سکتی ہے۔ اسلامی دنیا کی غربت مالی وسائل کی کمی نہیں صرف Unity of Muslim World کا فقدان ہے۔ اگر عالم اسلام کا ایک کعبہ ہے تو پھر قبلہ فکر بھی ایک ہونا چاہئے۔ ہم اپنے Collective Wisdom سے دنیا بھر کی امانت کا فرض ادا کر سکتے ہیں مگر عالم اسلام کا المیہ یہ ہے کہ پوری اسلامی دنیا میں کوئی ایسی ہستی موجود نہیں جو انہیں ایک تسبیح میں پرو سکے۔ قوم پھر جمال الدین افغانی کو تلاش کر رہی ہے پھر رومی اور رازی کو ڈھونڈ رہی ہے۔ قوم پھر شاہ فیصل جیسا مدبر دیکھنا چاہتی ہے۔ قوم پھر جمال ناصر کی تلاش میں ہے۔

قوم اس رہنما کی قیادت کی آرزومند ہے جو انہیں پھر وہی عزم و جلال سے آشنا کر دے جو کبھی مسلمانوں کو صلاح الدین ایوبی کے دور میں حاصل تھا۔ لیکن اس وقت مسلمانوں کی اونٹنی کی مہار مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی اب وہ ناقہ وہ اونٹنی اپنی مہار بڑی طاقتوں کے ہاتھ میں دے چکی ہے جسے وہ صحراؤں میں بھوکا، پیاسا رکھ کر بے دردی سے اس کی رفتار کو اور اس کے بھرپور کردار سے محروم کر رہے ہیں۔ وہ ناقہ بے زمام پھر سے اپنے قبیلے میں لوٹ آنے کی جنگ لڑ رہی ہے لیکن کون ساتھ دے گا۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

23 مارچ ہماری منزل کے تعین کا دن

قائداعظمؒ نے مسلمانان ہند کی زندگی کا رخ بدلنے کیلئے
جس حکمت عملی کا اظہار کیا تھا یہ اسی کا ثمرہ ہے کہ صرف سات
سال کی جدوجہد کے بعد ایک عظیم اسلامی مملکت وجود میں آگئی

قرارداد پاکستان منظور ہوتے ہی ہندو پریس نے شور مچادیا
قرارداد پاکستان ایک منزل تک پہنچنے کا فکری راستہ تھا
جسے عمل، جوش اور جذبے سے آگے بڑھایا گیا

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ ہماری تاریخ کا وہ دن ہے جب آج سے ۵۸ سال قبل برصغیر پاک وہند کے مسلمانوں نے اپنے تمام تر اجتماعی شعور سے یہ عہد کیا تھا کہ ہماری بظاہر اگانہ تشخص میں ہے۔ ۲۴ مارچ کو برصغیر کے مسلمانوں کے نمائندہ اجتماع میں یہ عزم کا اظہار کیا گیا تھا کہ ہم نے ظلم واستبداء کی زنجیروں کو کاٹنا ہے۔ اپنے حقوق کا تحفظ کرنا ہے اور پاکستان بنانا ہے کیونکہ ہندوؤں کے ساتھ مزید رہنا دشوار ہو گیا تھا۔ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ کو مسلمانوں نے حضرت قائداعظم محمد علی جناح پر عزم قیادت کی عقابی سوچ اور زریں افکار کی صداقتوں میں جس دانش فکر کا راستہ اختیار کیا تھا اسی فکر کی عملی دستاویز ۲۳ مارچ ہے۔ یہ صرف ایک قرار داد ہی نہیں بلکہ آگے بڑھنے، منزل کو پانے، کانٹوں بھری راہوں سے گزرنے سازشوں کے جال توڑنے چمنستان اقبالؒ و جناحؒ کو پانے کے لئے ٹھوس قدم بھی ہے۔

اس تاریخی موقعہ پر حضرت قائداعظم محمد علی جناح نے مسلمانان ہند کی زندگی کا رخ بدلنے کے لئے جس حکمت عملی کا اظہار کیا تھا یہ اسی کا ثمرہ ہے کہ صرف سات سالوں کی جدوجہد میں پاکستان جیسی عظیم اسلامی مملکت وجود میں آگئی اور برصغیر کے مسلمانوں کی تمناؤں، آرزوں اور امنگوں کو قبولیت کا شرف مل گیا۔ اس دفعہ ۲۳ مارچ کی تقریبات اور تجدید عہد کے موقعہ پر جو خوشی اور مسرت نصیب ہو رہی ہے وہ سر سید احمد خان کی صد سالہ تقریبات بھی ہیں اس مسیحائے قوم نے ۲۳ مارچ تک کامیابی کا رستہ ہموار کرنے اور قوم کو عزم وہمت، فہم وفراست عطا کرنے میں جس دو قومی نظریہ کا ادراک پیدا کیا اور رام اور رحیم

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

کا جو فرق واضح کیا یہ اسی کا اثر ہے کہ بر صغیر کے مسلمانوں نے اپنے سے طاقتور دشمن کو اپنی نظریاتی اور اجتماعی فکر سے شکست دی۔

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کا عظیم دن اس اعتبار سے پاکستان کی تعمیر و ترقی میں معاون ہے کہ اس دن مسلمانوں کو اپنے وجود کا اور اپنی بقا کا زندہ احساس ہوا۔ اس اجلاس میں بر صغیر کے تمام خطوں سے مختلف نمائندوں نے شرکت کی جن کی تعداد کا اندازہ تقریباً ایک لاکھ تھا۔ اس موقعہ پر حضرت قائداعظم محمد علی جناح نے جو معرکہ آراء خطبہ دیا تھا اس کے الفاظ کچھ یوں ہیں۔

"ہندو اور مسلمان دو فرقے ہیں بلکہ دو قومیں ہیں اس لئے ہندوستان میں پیدا ہونے والے مسائل فرقہ وارانہ نہیں بلکہ بین الاقوامی نوعیت کے ہیں۔ ہندوستان کے مسلمان آزادی چاہتے ہیں لیکن ایسی آزادی نہیں جس میں وہ ہندوؤں کے غلام بن کر رہ جائیں۔ یہاں مغربی جمہوریت کامیاب نہیں ہو سکتی کیونکہ ہندوستان میں صرف ایک قوم نہیں بستی چونکہ یہاں ہندو اکثریت میں ہیں اس لئے کسی بھی نوعیت کے آئینی تحفظ سے مسلمانوں کے مفادات کی حفاظت نہیں ہو سکتی۔ ان کے مفادات کا تحفظ صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کو ہندو اور مسلم انڈیا میں تقسیم کر دیا جائے۔ ہندو مسلم اتحاد کا صرف یہ حل ہے اگر مسلمانوں پر کوئی اور حل ٹھونسا گیا تو وہ اسے کسی صورت میں قبول نہیں کریں گے۔

حضرت قائداعظم محمد علی جناح کا یہ خطاب فی البدیہہ تھا اور اس میں مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کے الگ تشخص کے حوالے موجود تھے اور ہندوؤں کی الگ منطق کا بھرپور تجزیہ بھی شامل تھا۔

اس موقعہ پر پیش کی جانے والی قرارداد جسے لاہور قرارداد کا نام دیا گیا اور جو بعد میں قیام پاکستان کی قرارداد کہا گیا اس قرارداد کی تائید چودھری خلیق الزماں نے کی جبکہ پیش کرنے والوں میں شیر، بنگال، مولوی فضل الحق شامل تھے۔ مولانا ظفر علی خان مدیر روزنامہ زمیندار، سردار اورنگزیب خان، حاجی سردار عبداللہ ہارون، نواب اسماعیل خان، قاضی عیسیٰ عبدالحمید خان، ابراہیم اسماعیل چندریگر، سید رؤف شاہ، ڈاکٹر عالم سید ذاکر علی، بیگم مولانا محمد علی جوہر، مولانا عبدالحامد بدایونی جیسے قابل ذکر رہنماؤں نے اس قرارداد کی بھرپور حمایت کی۔ قرارداد پاکستان کا مطلب یہی ہے کہ مسلمان ایک قوم ہیں اس لئے انہیں اپنے ایک وطن

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ایک علاقے اور ایک ریاست کا مالک ہونا چاہئے۔

قرار داد لاہور کا منظور ہونا تھا کہ ہندو پریس چیخ چیخ کر اسے قرار داد پاکستان کہنے اور پاکستان بنانے کا مواد شائع کرنے لگا۔ ہندوؤں کے شدید رد عمل کو دیکھتے ہوئے مسلمان بھی متحد ہو گئے انہوں نے بھی یہ نعرہ لگایا کہ "بٹ کے رہے گا ہندوستان بن کے رہے گا پاکستان" "پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ" انگریزوں، ہندوؤں کے ہزار پروپیگنڈہ اور بے سروپا باتوں کے باوجود اسلامیان ہند کی آواز اور دل کی دھڑکن پاکستان بن گیا۔ ملک کے کونے کونے میں پاکستان کے جھنڈے، پاکستان کے نغمے گونجنے لگے۔ قرار داد پاکستان دراصل ایک منزل تک پہنچنے کا فکری راستہ تھا جسے عمل، جوش، جذبہ سے آگے بڑھایا گیا اور عملی اقدامات سے خاکہ میں حقیقت کا رنگ بھر اگیا۔ نا ممکن کو ممکن بنایا گیا۔ ان گنت مسائل اور مخالفتوں کے طوفان اس آواز کو دبا نہ سکے اور قرار داد پاکستان کی متعین کردہ منزل اس قدر ابدی اصولوں پر مشتمل تھی کہ اسے دنیا کی کوئی طاقت روک نہ سکی اور پاکستان ۱۹۴۷ء کو معرض وجود میں آگیا اور دنیا جانتی ہے کہ یہ مملکت صرف اور صرف اسلام کی اساس پر قائم ہے۔

آج جب ہم ۲۳ مارچ کی تقریبات منا رہے ہیں اور مینار پاکستان کے سایہ میں بیٹھ کر جو عافیت محسوس کرتے ہیں ہمیں اس بات پر بجا اظہار تشکر کرنا چاہئے کہ اگر برصغیر کے مسلمان دور اندیشی اور معاملہ فہمی سے آگاہ نہ ہوتے تو آج ہماری حالت کیا ہوتی۔ ہندوؤں کی غلامی ہماری موت تھی پاکستان کے قیام سے ہمیں زندہ رہنا موقع دیا گیا اور آج الحمدللہ جو ہندو پاکستان کی "پ" نہیں بننے کی دھمکیاں دیتا تھا اور نعرہ لگاتا تھا کہ پاکستان صرف چھ ماہ تک رہے گا آج حیران ہے کہ مسلمانوں نے کس طرح اپنے عزم راسخ سے پاکستان کو مربوط اور مضبوط ملک بنا دیا ہے اور گزشتہ پچاس سال سے پاکستان ترقی اور کامرانی کی شاہراہوں پر گامزن ہے۔ اس لئے ہمیں اس نعمت عظمیٰ پر خدائے بزرگ و برتر کے حضور شکر بجالانا چاہئے اور وطن عزیز کو اقوام عالم میں ایک مضبوط اور معاشی اور سیاسی اعتبار سے مستحکم کے طور پر ثابت کرنا چاہئے۔

ہمیں اپنے وسائل اور ذرائع کو موثر انداز سے بیرونی درآمدی محتاجی سے نجات حاصل کرنی چاہئے۔ ۲۳ مارچ کو جس ہندو سے ہم نے اپنی جان چھڑائی تھی اور اس کے سیاسی اور معاشی تسلط سے الگ ہونے کا عزم کیا تھا آج اس عزم کی تجدید کرنی چاہئے کیونکہ ہندو اپنے

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

مزاج اور کردار سے نہیں بدلا ہندو آج بھی ۱۹۴۰ء کی عہد میں موجود ہے بلکہ اس کی وحشتیں اور بڑھی ہیں کم نہیں ہوئیں۔ بھارت میں ہندو مسلم فسادات کی تعداد چار ہزار سے بڑھ گئی ہے۔ کشمیر میں اسکے مظالم میں اضافہ ہوا ہے اور ہم اپنی تاریخ سے غافل ہونے کے نسیان میں مبتلا ہو گئے ہیں اور بعض اوقات ہندو کو اپنا دوست خیال کرنے لگتے ہیں حالانکہ حقیقت کچھ اور ہے۔ ہندو نے آج تک ہمیں ذہنی طور پر تسلیم نہیں کیا اور نہ ہی وہ تسلیم کرنے کا کوئی آئندہ خیال رکھتا ہے پھر ہمیں اس کے بارے کسی قسم کی خوش فہمی نہیں ہونی چاہئے بلکہ اپنی جغرافیائی اور سرحدی سرحدوں کو ہر آن مضبوط بنانا چاہئے اور اپنے دفاع اور اپنی ترقی کو بامقصد اور بامعنی بنانا چاہئے۔ ہمارے الیکٹرانک میڈیا کو بھارت کے چینل اور ٹی وی سے جو عریانی اور فحاشی کی لہر اٹھی ہے اس کے لئے ہمیں اپنے نوجوانوں کو آگاہ اور اپنے نظریاتی وجود کو اور مضبوط کرنا چاہئے تاکہ ہم بھارت کو سیاسی، معاشی، معاشرتی اور میڈیا کی سطح پر شکست دے سکیں۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

یہی دن اہل دل کے واسطے امید کا دن ہے

یہی دن اہل دن کے واسطے امید کا دن ہے
تمہاری دید کا دن ہے ہماری عید کا دن ہے

امید کا دن اس لئے ہے کہ شادی بیاہ کی تقریبات میں گوشت کھانے کو نہیں ملتا۔ پلیٹ بھر کر اور جی بھر کر کھانے اور اوپر سے سویٹ ڈش کے مزے اڑانے کے جو موقع ملتے تھے اور خلال کرنے کا جو کھانے کے بعد مزہ آتا تھا اب وہ مزے کہاں۔ چائے کا کپ یا کوئی مشروب کی بوتل اور ''لفظ شکریہ'' بڑی قناعت پسندی سے ملتے ہیں اگر ہاتھ میں بھاری بھر کم تحفہ ہو تو پھر لفظ شکریہ عمیف جذبوں میں سمٹ جاتا ہے۔ صدر دروازہ تک چھوڑنے کا تکلف بھی دیکھنے کو ملتا ہے اگر اب تہی دست ہیں اعمال کی وجہ سے نہیں، تحفہ کے کمال سے محروم ہیں تو پھر عروسی تقریب میں آپ کا جانا نہ جانا ایک برابر ہے۔ بہتر ہے طبیعت پر قابو رکھیں اور گھر کی دال ک روسٹ چرغہ سمجھیں۔ ویسے اب گھر کی دال مرغا برابر ہو چکی ہے۔ مہنگائی نے ''عشق پیچاں'' کی طرح ہر فرد کو اور ہر گھر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے لوگ صرف بجلی کو اور بجلی مہیا کرنے والی کمپنیوں کو مورو الزام ٹھہراتے ہیں کہ غریب کے گھر کا چراغ جو پہلے مہنگائی سے بجھ گیا تھا اب بجلی کے میٹر سے دم توڑ گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ غریب بیچارا ایک معمولی پیاز بھی بازار سے نہیں لا سکتا جو پیاز کبھی تین چار روپے کلو بکتا تھا اب عید قربان پر یعنی عید الاضحی پر ۲۲ روپے کلو بک رہا ہے۔ کیسا ہے کس معیار کا ہے اس سے نہ مجھے سروکار ہے اور نہ آپ کو ہونا چاہئے جس طرح ملتا ہے لے لینا چاہئے وگرنہ آئینہ کی طرح گھومتی بکری کی ران آپ کا مقدر نہیں بن سکتی۔ ران اسی کی ہے جس کے گھر پیاز ہوں اور پیاز کو لانے کے لئے زر بھی ہونا چاہئے جس سے کم از کم ۲۲ روپے کلو والا پیاز گھر میں آسکے ویسے تو لہسن بھی بڑا ضروری ہے وہ بھی دس روپے پاؤ سے کم نہیں اور لہسن کے بغیر کراہی گوشت کا مزہ کہاں۔ اس کا اہتمام بھی ضروری ہے نمک، مرچ، گھی کس بھاؤ آپ کو ملتان ہے یہ سوچنا بھی آپ کا کام ہے اور اس کے لئے آپ کی جیب آپ کا کس حد تک ساتھ دے سکتی ہے۔ اس سے مذاکرات آپ نے کرنے ہیں کچھ مذاکرات آپ سے ان لوگوں نے بھی کرنے ہیں جن کا بلاواسطہ یا بالواسطہ آپ کی عید سے اور عید کے دن سے ہے۔ یعنی اس میں مرکزی کردار بکرا

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ہے اگر بکرا ہی گھر پر نہیں آسکتا تو عید کا دن پر لطف پر بہار کیسے ہو سکتا ہے۔ جب سے بزنس ایڈمنسٹریشن میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ بکرا منڈی میں بھی Marketing کا رجحان جوبن پر ہے۔ اس دفعہ سنا ہے کہ ۷۵ روپے فی کلو سے بکرا یا بکری کا گوشت زندہ بکا ہے۔ ویسے بکرے کا کوئی "مول" نہیں جس نے پل صراط کراس کرنی ہو اور بھاری بھر کم لوگوں کو لے جانا ہو کم از کم اس کی کوئی قیمت ہونی چاہئے۔ بکرا منڈی میں جہاں مارکیٹنگ کا شعبہ فعال نظر آتا ہے وہاں Sales Activities بھی اپنے شباب پر ہے۔ شریعت میں حکم ہے کہ چار جانوروں کی قربانی جائز نہیں آنکھ کا کانا، واضح بیمار، لنگڑا جس کا لنگڑا پن نمایاں ہو اور کمزور جس پر چربی کم ہو اس کی وضاحت علمائے کرام یوں کرتے ہیں قربانی کے جانور میں عیب نہ ہو کانا، لنگڑا، سینگ ٹوٹا، کان کٹا نہیں ہونا چاہئے۔ کیونکہ آج کا دور مارکیٹنگ کا دور ہے پبلسٹی کا دور ہے اس لئے جانور بیچنے والوں نے بھی "ایلفی" لگا کر ٹوٹے کان اور سینگ جوڑ دیے ہیں اور دم بھی جوڑ دیتے ہیں۔ بکروں اور بکریوں کو اس طرح سنوارا ہے اس طرح بیوٹی پارلر میں دلہن سنورتی اور نکھرتی ہے وہاں ہر دلہن کو ان کے والدین کو تین چار ہزار روپے دینے پڑتے ہیں یا بکروں کی بیوٹی ٹیکنیشن پر آپ سے کچھ چارج نہیں کیا جائے گا۔ البتہ آپ کی قسمت اچھی ہو تو آپ کو صحیح عمر کا بکرا مل جائے بکری کی بات نہیں کی کیونکہ وہ اپنی عمر سے بھی اور اپنی In Family ہونے سے مار کھا جاتی ہے اکثر بکریاں جب ذبح کی جاتی ہیں تو ان کے معصوم بچے بھی ذبح ہو جاتے ہیں اس معاملے میں اچھی طرح مارکیٹنگ کے علم کو مشاہدہ ملنا چاہئے۔ بکرے کی عمر ایک سال سے زائد ہو گائے جو دو سال کی عمر سے تجاوز کرے اونٹ جو چار سال سے تجاوز کر کے پانچویں سال میں داخل ہو۔ مقصد یہ ہے کہ جانور عمر کے لحاظ سے اپنی شکل و صورت کے لحاظ سے حسین اور خوب تر ہونا چاہئے۔ جانور کے اوصاف میں جو پہچان کے معیار رکھے گئے ہیں ان میں سینگ والا مینڈھا ہو سفید رنگ کا ہو، آنکھوں کا حلقہ سیاہ ہو اور ٹانگیں بھی سیاہ ہوں۔ البتہ یہ شرط بھی ہے کہ پہلے نماز عید پڑھیں اور پھر قربانی کریں۔ کہیں ایسا نہ ہو نماز ادا نہ کریں اور جانور کو ذبح کر ڈالیں پھر یہ قربانی آپ کی ہو گئی وہ قربانی نہ ہو گی جس کے بارے میں فرمان ہے کہ بے شک میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور موت اللہ کیلئے ہے جو جہانوں کو پالنے والا ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔

عید کا دن خیر و برکت کا دن ہے خود بھی کھاؤ اور ارد گرد کے فقیروں اور مسکینوں کو بھی

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

یاد رکھو کچھ تو مستحق مسکین آپ کو مل جائیں گے اور اگر نہ مل سکیں تو مسکین دوستوں کو گوشت کھلاؤ اور یاد رکھو کہ تمہارے گوشت کھلانے سے دوسرے کو یقیناً فائدہ ہو گا کیونکہ وہ شادی آرڈیننس کی وجہ سے ایک عرصہ سے گوشت سے محروم رہا ہے۔ اس کا تمہیں بھی فائدہ ہو گا کیونکہ تمہارا تقویٰ مضبوط ہو گا اور تمہارے دل میں دوستوں کے لئے سچا خلوص پیدا ہو گا قربانی صرف گوشت کھانے اور کھلانے تک محدود نہیں اس کا مقصود ایک دوسرے کا زندہ احساس ہے محبت ہے الفت ہے پیار اور خلوص ہے گوشت کی تقسیم دراصل منصفانہ نظام کو عملی طور پر لانے کا نام ہے۔ دولت کی صحیح گردش کا نام ہے فلاحی رفاعی معاشرہ کی طرف پیش رفت ہے۔ گوشت تقسیم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اسے تین حصوں میں تقسیم کیا جائے ایک حصہ خود قربانی والے اپنے گھر رکھ لیں (گردے، کلیجی، ران، سری کی تقسیم بھی ضروری ہے) یہ دوستوں کا حق ہے اس کا خیال رکھیں اور ایک حصہ خیرات کر دیں اور باقی اپنے دوست اور احساس کو تحفہ میں دیں اور اس جذبہ سے دیں کہ توقع نہ رکھیں کہ واپسی پر آپ کی اپنی بھیجی ہوئی ران آپ کو ملے گی واپس آبھی جائے تو صبح کا بھولا شام کو لوٹ آئے تو اسے کچھ نہ کہا جائے کیونکہ لوٹنے والا مال آپ کا آئینی قانونی حق ہے بہت سے لوگ اسی حق پر زندہ ہیں بلکہ غضب کرنا اور قبضہ گروپ کہلانا ان کی ایک صفت ہے۔ کچھ لوگ قربانی کرتے ہیں اور کچھ لوگ صرف قربانی کے گوشت پر گزارا کرتے ہیں۔ بہر حال فضیلت دونوں کے مقدر میں ہے آج عید کا دن ہے دوستوں کی دید کا دن ہے ملنے اور ملتے رہنے کے عزم کا دن ہے اس دن کو خوب منانا چاہئے آنے والے دوست کو اس کی فرمائش پر جی بھر کر کھلانا چاہئے۔ تاکہ آپ کے گزشتہ پچاس سال جو کنجوسی میں گزرے ہیں اب نعمتوں کے تشکر میں گزرنے چاہئیں۔ تحدیث نعمت یہی ہے کہ ہم اس قربانی کا خیال رکھیں جو آج سے پچاس سال پہلے ہمارے بزرگوں نے ہمیں مقدس خطہ دلانے کے لئے دی تھی۔ ہمیں آج کے دن اس جذبہ کو اس صداقت کو یاد رکھنا چاہئے اور محروم اور مجبور لوگوں کا احساس کرنا چاہئے جو کسی وجہ سے آج کسی جانور کی قربانی نہیں کر سکیں گے۔ یہ بھی فضیلت ہے کہ آپ سارا گوشت خیرات کر دیں۔

اگر کسی کو تحفہ بھی نہ بھیجیں تو بھی کوئی حرج نہیں لیکن مستحق کے پاس گوشت ضرور جانا چاہئے۔ اگر آپ کے گھر دو یا دو سے زائد جانور ہیں اور آپ نے قربان کرنے ہیں تو ان میں بھی تقسیم اور بانٹنے کا عمل جاری رکھیں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ قربانی سے لطف اندوز ہو سکیں

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

قربانی سے پہلے جو آپ نے بال اور ناخن بڑھائے تھے محض اللہ تعالیٰ کے تقویٰ کے لئے خلوص نیت کے لئے وہ کاٹ دیں کیونکہ وہ مقام آپ نے پالیا ہے اگر آپ نے ویسے گذشتہ پچاس سال سے بال اور ناخن حرص اور ہوس کے لئے بڑھائے تھے ان کے رہنے دیں کیونکہ ان کا تعلق قربانی کی عید سے نہیں آپ کی سوچ سے ہے۔ جس سے بنگلے، کوٹھیاں، موٹر کاریں اور کارخانے بنتے ہیں۔ اور جن کے بال اور ناخن عید کی قربانی کی وجہ سے بڑھے تھے وہ آج کٹوادیں کیونکہ ان کا اب جواز باقی نہیں رہا کچھ لوگ بال اور ناخن اس لئے بڑھاتے ہیں کیونکہ دوسروں کی جیبیں کاٹتے رہیں پھل والا پھل مہنگا بیچتا ہے رکشاوالا میٹر کے نرخ بڑھا دیتا ہے دودھ چار محلے گھومنے کے بعد ملتا ہے اور اس کا ریٹ آپ نہ پوچھیں کیونکہ آج عید کا دن ہے اور مجھے آپ کو عمدہ چائے پلانی ہے۔

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

کتابیات

1. Fisher-Glen, **"American Communication in a Global Society"**
   Ablex Publishing Corporation,
   New Jersey - 1979.

2. **Pakistan Development Review No.36**
   Part-I 1997

3. Sahibzada - Mohibul-Haq,
   "Poverty Alleviation in Pakistan"
   Institute of Policy Studies,
   Islamabad - 1997

4. Mahbul-Haq - **Human Development in South Asia - 1997**
   Oxford Unviersity Press - 1997

5. Straubhaar, Joseph
   "Media in the Information Society"
   Wadsworth Publishing Company
   U.S.A. 1997

6. First Call by Unicef, U.N.O.

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com

ڈاکٹر کریم ملک ملتان کے ایک پسماندہ گاؤں جس کا کوئی رابطہ کوئی پگڈنڈی نہ تھی کھیت اور کھلیان کے دشوار گزار فاصلے طے کرتے ہوئے شہر میں داخل ہوئے۔ نامساعد حالات کی گود سے اٹھ کر ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے گورنمنٹ پائلٹ ہائی سکول، گورنمنٹ کالج ملتان، ہیلے کالج آف کامرس اور پھر پنجاب یونیورسٹی لاہور تک پہنچے۔ ہیلے کالج آف کامرس لاہور کے تین سال "الاقتصاد" کے مدیر رہے علاوہ ازیں ایم اے، ایل ایل بی، ڈی ایل ایل، پھر بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان سے شعبہ ابلاغیات کے پہلے پی ایچ ڈی ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔ اس یونیورسٹی سے ان کی رفاقت کم وبیش 25 سالوں پر محیط ہے اس میں انتظامی امور کا عمیق تجربہ اکاؤنٹس اور ابلاغیات کے استاد ہونے، تدریس کے معیار کو بہتر بنانے اور شعبہ تعلقات عامہ میں مہارت کا ایک ایسا حوالہ بنے جو اس شعبہ سے وابستہ افراد کیلئے ایک درس گاہ کا، ایک ادارہ کا درجہ رکھتا ہے۔

دنیائے صحافت میں بطور فری لانس کے آغاز کیا اور روزنامہ کوہستان ملتان میں لکھتے رہے لیکن 1972 سے روزنامہ نوائے وقت لاہور اور ملتان سے مستقل طور پر وابستگی اختیار کی۔ اس عرصہ میں تصانیف اور تحقیقی مضامین کا سلسلہ بھی جاری رکھا ان گنت سماجی تنظیموں سے وابستگی کی بنا پر ڈاکٹر کریم ملک کے کالموں میں اسلوب بیان کی شگفتگی، شوخی، بیباکی کے علاوہ معاشرہ کے وہ سلگتے مسائل بھی شامل ہیں جن کے حل کیلئے ان کی حریم ذات میں پاکستان اور پاکستانیت کی اقدار رچی بسی ہیں۔

Tehqeeq Tanqid Rs.225
000001 078978
Dar e ehsas pe datak

Marfat.com
Marfat.com
Marfat.com